آخری رات

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

معیاری اور خوبصورت کتابیں

با اہتمام: محمد علی قریشی

بار اول ـــــ 2005ء
مطبع ـــــ نیر اسد پریس
سرورق ـــــ ذاکر
کمپوزنگ ـــــ وسیم احمد قریشی
قیمت ـــــ 180/- روپے

دیباچہ

القریش پبلی کیشنز کے توسط سے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے دو ناول ”کلہاڑی“ اور ”آخری بساط“ اس سے قبل شائع ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اب ان کا پراسرار کہانیوں کا مجموعہ پیش خدمت ہے۔

قارئین کرام! ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ان مصنفین میں سے ہیں جن کو ہر موضوع سے انصاف کرنے کی خداداد صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہم یہاں جس موضوع کو ”ٹچ“ کریں گے وہ ہے پراسراریت۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ پراسرایت، سسپنس، تجسس اور سنسنی خیزی ایسے ذخیرے ہیں جو کئی صدیوں سے انسانی ذہن کے ”جان لینے“ کے ذوق کی تسکین کر رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک اچھی، معیاری اور پُر مقصد تحریر کی نشانی یہ بھی ہے کہ وہ ذہن میں کوئی سوال پیدا کر دے اور مذکورہ موضوع نہ صرف اس شرط پر پورا اترتا ہے بلکہ اس کا خمیر ہی اس شرط سے گوندھا گیا ہے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ پراسراریت کی بدولت جاسوسی ادب ساری دنیا میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ محترم مصنف نے اسی چیز کو زیرِ نظر کتاب میں بامِ عروج تک پہنچانے کی نہایت مخلصانہ کوشش کی ہے۔

ویسے تو اس کتاب کی ایک ایک کہانی انتخاب ہے لیکن ”موسمِ ہجراں“ کے عنوان سے جو کہانی اس کتاب میں شامل ہے اسے ہم اپنے دعویٰ کی گواہی کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

محترم قارئین! کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پڑھتے جائیے اور ہماری بات سے متفق ہوتے جائیے۔

(محمد علی قریشی)

فہرست

آخری رات

وہ دھیمی دھیمی اور پُراسرار چاندنی میں نہائی ہوئی رات یوں سسک رہی تھی جیسے کوئی ودھوا ناری اپنے سیاہ لمبے بال کھولے ماتم کناں ہو۔ یہ بھارتی صوبے یوپی کے ڈیرہ دون کا جنگلاتی و مضافاتی علاقہ تھا۔ تارکول کی چمکتی ہوئی ایک پکی سڑک آگے جا کر کسی ترشول کی طرح تین حصوں میں منقسم ہو کر سامنے تاریک جنگل کے سینے میں پیوست ہو رہی تھی...... سڑک کے دورویہ ایستادہ اکھی ماتا اور سرس کے گھنے پیڑ، خلیج بنگال سے آنے والی سبک خرام ہواؤں کے دوش پر ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ چہار سُو گمبھیر سناٹے کا راج تھا البتہ کبھی یوں ہوتا کہ اگر کوئی تیز رفتار گاڑی طوفانی رفتار سے گزر جاتی تو اس کے زوردار ''زناٹے'' کی وجہ سے اس پُرہیبت ماحول کے سکوت میں ذرا دیر تک تھرتھراہٹ طاری رہتی اور پھر وہی پُراسرار سناٹا کسی منحوس گِدھ کی طرح پَر پھیلائے آن بیٹھتا۔

پُراسرار باسیوں کی طرح کھڑے اکھی ماتا کے پیڑوں میں جدھر سڑک کے کنارے کنارے بھربھری مٹی بھری ہوئی تھی وہاں کسی اَن دیکھی مخلوق کے پیروں کے نشان یوں بنتے چلے جا رہے تھے جیسے کوئی دھیرے دھیرے چہل قدمی کے انداز میں چل رہا ہو۔ مٹی پر ابھرنے والے پیروں کی ساخت کے نشان کسی عورت کے معلوم ہو رہے تھے...... لیکن ایک بات دہشت ناک حد تک عجیب تھی کہ دکھائی نہ دینے والی کوئی پُراسرار نسوانی ہستی یا تو اپنی پشت کے رُخ پر چل رہی تھی یا پھر اس کے پاؤں الٹے تھے۔ کیونکہ بھربھری زمین پر پیروں کے نشانات الٹے بنتے چلے جا رہے تھے...... بلاشبہ وہ غیبی مخلوق کوئی چھل پائی تھی۔

اگر کوئی جیتا جاگتا انسان ان ابھرنے والے الٹے پیروں کے نشانات کو دیکھ لیتا تو دہشت سے اس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کا آخری بار دھڑکنے کے بعد رک جانا

یقینی تھا۔

اسی لمحے سامنے سے کسی گاڑی کی تیز روشنی ابھری اور سڑک کے کنارے الٹے پیروں کے نشانات بھی مزید ابھرنے بند ہو گئے...... جس کا واضح مطلب یہی نکلتا تھا کہ ان دیکھی پچھل پائی ایک لمحے کو شاید رکی تھی مگر پھر اگلے لمحے وہ پھر چل پڑی تھی مگر اس بار وہ خاصی تیز رفتاری سے چل رہی تھی...... کیونکہ الٹے پیروں کے نشانات اب جلدی جلدی بن رہے تھے۔ ذرا آگے پکی سڑک سے ملحقہ کچا مگر قدرے کشادہ اور ناہموار راستہ اندر تاریک جنگل میں چلا گیا تھا...... پچھل پائی کے قدموں کے نشان اب تیزی کے ساتھ اس جانب دوڑے جا رہے تھے...... ادھر اس گاڑی کی روشنی جو اس کی ہیڈ لائٹس کی تھی بتدریج نزدیک آتی جا رہی تھی...... وہ ایک فیاٹ کار تھی۔ پھر یوں ہوا فیاٹ کی رفتار آہستہ ہوتی چلی گئی اور اگلے ہی لمحے اس نے کچے ناہموار راستے کی جانب موڑ کاٹا جدھر کچھ دیر پہلے ہی وہ...... نادیدہ پچھل پائی دوڑتی ہوئی غائب ہوئی تھی۔ کچے راستے پر اترتے ہی فیاٹ نے ہچکولے کھانے شروع کر دیئے...... ڈرائیونگ وہیل پر آہنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کار کی رفتار قدرے کم کر دی گئی تھی۔ اب کار دھیمے دھیمے ہچکولے کھاتی ایک پرانے اور نیم تاریکی میں ڈوبے مندر کے کھنڈر کے قریب سے گزر رہی تھی...... رمیش لال کھرانہ چالیس پینتالیس کے پیٹے میں تھے۔ برابر والی سیٹ پر ان کی پتنی درگا اور پچھلی سیٹ پر جوان بیٹی شانتی براجمان تھی۔ اس کے ملیح چہرے پر اس وقت بلا کی معصومیت اور آنکھوں سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔ رمیش لال کھرانہ کی نگاہیں ونڈ سکرین کے پار...... کار کی ہیڈ لائٹس میں تیزی سے نکلتے ویران راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار نہ جانے کیوں ان کے سپاٹ چہرے پر ایک لمحے کے لئے گہری تشویش کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جلد سے جلد اپنی منزل تک پہنچ جانا چاہتے ہوں۔ شاید رات زیادہ اتر آئی تھی اس لئے وہ ذرا فکرمند بھی تھے۔ درحقیقت انہیں سرِ شام ہی اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا مگر بدقسمتی سے راستے میں ٹائر پھٹ جانے کی وجہ سے لیٹ ہو گئے تھے۔ سفر کی ابتداء میں یہ مختصر سا پریوار بڑے پُر لطف انداز میں سفر سے محظوظ ہو رہا تھا مگر پھر جیسے جیسے رات گہری اور منزل قریب ہونے لگی، باتوں کا سلسلہ بھی بتدریج موقوف ہوتا چلا گیا اور ان سب کو

ایک پراسراری "چپ" لگ گئی۔

فیاٹ نے معاً ایک تنگ سا موڑ کاٹا اور اس کے بعد وہ ایک سنسان مرگھٹ کے قریب سے گزرنے لگی جو چٹکی ہوئی چاندنی کی دھیمی اور اداس روشنی میں بے حد پُراسرار لگ رہا تھا۔ اچانک پھر جانے کیا ہوا کہ یک دم رمیش لال کھرانہ نے کار کی رفتار تیز کر دی...... رفتار تیز ہونے کی وجہ سے فیاٹ کچے اور ناہموار راستے پر تیزی کے ساتھ ہچکولے کھانے لگی......

"ٹیک اِٹ ایزی...... رمیش کیا ہوا......؟ آہستہ چلو...... راستہ دیکھو کتنا خراب ہے۔" معاً ان کی پتنی درگا دیوی نے اپنے پتی کو متنبہ کیا۔ اور ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اگلے ہی لمحے عقبی سیٹ پر بیٹھی شانتی کے حلق سے ایک چیخ سی برآمد ہوئی اور ٹھیک اسی سمے رمیش لال کھرانہ کا پاؤں بھی بریک پر پڑ گیا۔ ٹائر یک دم جام ہو کر کچے راستے پر ذرا آگے گھسٹتے چلے گئے۔ اور انہیں معمولی سا جھٹکا لگا۔ شانتی کی پھیلی ہوئی آنکھیں ونڈ اسکرین کے پار کسی کو دیکھنے کی کوشش میں محوِ حیرت تھیں۔

"کیا ہوا شانتی بیٹی......؟" رمیش لال نے اپنی گردن گھما کر عقبی سیٹ پر بیٹھی اپنی بیٹی شانتی کی جانب دیکھا اور تشویش بھرے لہجے میں پوچھا......

"ڈ...... ڈیڈی...... آ...... کیا آپ نے کچھ نہیں دیکھا سامنے......؟" قدرے رُک رُک کر شانتی نے کہا...... اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں سامنے جیسے گڑ سی گئی تھیں......

"نہیں بیٹا...... مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیا سامنے...... کس کی بات کر رہی ہو؟"

"تم نے آخر کس بات پر چیخ ماری تھی شانتی؟ ایسا تم نے کیا دیکھ لیا تھا؟" اس کی ماں نے بھی قدرے بلند آواز میں پوچھا......

"مم...... ممی...... مجھے یوں لگا جیسے...... جیسے کوئی انسان...... ش...... شاید وہ کوئی عورت تھی جو اچانک ہی ہماری کار کے سامنے آ گئی تھی۔" وہ جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔

"اوہو یہ...... تمہارا کوئی وہم ہو گا بھئی!" درگا دیوی نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"نہیں ممی...... میں نے خود دیکھا تھا اسے...... انہی آنکھوں سے اپنی...... حیرت ہے وہ آپ کو کیوں نظر نہیں آئی؟" شانتی حیرت سے بولی۔ شانتی کے قطعیت بھرے لہجے

نے رمیش لال کھرانہ کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا...... لہٰذا انہوں نے اپنی کار کے شیشے اتارے اور دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ مقصد اپنی بیٹی کی تسلی کرنا بھی تھا...... باہر چاروں طرف گہرا سناٹا تھا البتہ مرگھٹ پُراسرار چاندنی میں نہایا بڑا ڈراؤنا منظر پیش کر رہا تھا...... ایک جانب چوڑے پتوں والے گھنے پیڑ نرم خو ہواؤں کے دوش پر پُراسرار تماشائیوں کی طرح تالیاں پیٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''اوہو رمیش...... لیو اِٹ۔ تم بھی کیا بچی کے ساتھ بچہ بن گئے۔ گاڑی تو چلاؤ...... آخر اس ویرانے میں کیوں کھڑی کر رکھی ہے......؟'' اب درگا نے قدرے بیزاری سے کہا...... یہ الگ بات تھی ان کا بچہ خاصا متوحش ہو رہا تھا۔ رمیش لال کھرانہ نے اپنی پتنی کے بے لاگ تبصرے پر گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور آگے بڑھا دی۔ تاہم وہ اپنی بیٹی شانتی کو تشفی دیتے ہوئے مختصراً بولے۔

''شانتی بیٹی! ایسے ماحول میں اس قسم کے واہمے ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں...... یہ ضرور تمہارا وہم ہی تھا......'' شانتی اپنے پتا کی بات پر خاموش ہو رہی لیکن اس کے چہرے سے یہ بات مترشح تھی کہ وہ اپنے پتا کی بات سے متفق نہیں۔ وہ کسی طور بھی اس پراسرار حقیقت کو اپنے وہم پر محمول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس نے اپنی جاگتی آنکھوں سے سامنے کار کی ونڈ اسکرین کے پار کسی عورت کا سایہ دیکھا تھا جس کے چہرے کے نقوش واضح نہ تھے۔ تاہم اپنے خدوخال سے وہ کوئی عورت ہی نظر آ رہی تھی اور ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ یک دم کار کے نیچے آ گئی ہو۔

......مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ یہ بات شانتی کو متحیر کئے دے رہی تھی۔ وہ پراسرار سایہ صرف اسے ہی کیوں نظر آیا...... وہ اس کے ممی ڈیڈی کو کیوں نہ دکھائی دیا تھا جو بالکل سامنے اگلی سیٹ پر براجمان تھے...... بہرطور سفر ایک بار پھر خاموشی کے ساتھ مگر قدرے سست روی سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی اس بات کو تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک شانتی اپنی ماں سے بولی۔

''ماتا جی...... آپ نے ابھی مجھ سے کچھ کہا؟''

''اے لڑکی! تُو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے......؟ میں تو چپ بیٹھی ہوں کافی دیر سے۔''

اس کی ماں درگا دیوی گڑبڑا کر قدرے تیز لہجے میں بولی۔

''کیا ہوا بیٹا؟ تم نے کیا سنا؟ تمہاری ممی نے تو کچھ بھی نہیں کہا...... میں ان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوں۔''

''جی...... پتا...... جی...... مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی ہو۔ میں سمجھی شاید ماتا جی نے دھیرے سے مجھ سے کچھ کہا ہے۔''

''اس کا دماغ چل گیا ہے۔'' درگا دیوی نے کہا...... شانتی کی اس بات کو بھی درگا نے اسی کے وہم پر محمول کیا تھا جبکہ شانتی کا اس سلسلے میں خیال مختلف تھا۔ اس کے ذہن میں اب کئی قسم کے جواب طلب سوال گردش کر رہے تھے۔ وہ فطرتاً ویسے ایڈونچر پسند لڑکی تھی۔

سفر جاری تھا۔ اسی لمحے معاً پھر شانتی کو اپنی سماعت سے مرتعش سی آواز ٹکرائی جیسے کسی نے گہری سانس کھینچ کر پراسراری سرگوشی کی ہو...... لیکن وہ الفاظ اس عجیب انداز میں ادا کئے گئے تھے کہ وہ ان کا مفہوم نہیں سمجھ سکی تھی۔ مگر اب وہ یہ بات اپنے ماتا پتا کو بتا کر دوبارہ مذاق کا نشانہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ ویسے بھی وہ خود کافی مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ ادھر رمیش لال کھرانہ کو ذرا دور مدھم چاندنی میں کسی آبادی کے دھندلے آثار دکھائی دیئے تو انہوں نے کار کی بھی رفتار ذرا تیز کر دی تھی۔ اب راستہ بھی کافی حد تک ہموار ہو چلا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے کچے پکے مکانوں کے دھندلے خاکے واضح ہونے لگے۔ وہ ''گڑھی پریم'' کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ ذرا دور ایک قدرے اونچے ٹیلے پر ایک قدیم طرز کی حویلی کی عظیم الشان عمارت نظر آئی۔ یہ ٹھاکر دیال داس کی حویلی تھی۔ کچھ اور آگے بڑھے تو السائی ہوئی آنکھوں والے آوارہ کتے بھونکتے ہوئے کار کا تعاقب کرنے لگے۔ کار کچے پکے راستوں اور گلیوں سے گزرتی شمال کی سمت مڑ گئی جہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی بہتات تھی۔ مکان اب پیچھے رہ گئے تھے۔ پھر ایک ٹیلے کو کراس کر کے فیاٹ رک گئی...... سامنے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مٹیالے پتھروں پر ایک حویلی نما عمارت نظر آ رہی تھی جو اپنی مخصوص قدیم طرز کی بناوٹ کے باعث بڑی پُرشکوہ لگ رہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ گہرے سکوت اور عجیب سی اداسی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''لو بھئی آ گئے رام بھون......!'' رمیش لال کھرانہ کار کے اسٹیئرنگ پر اپنا ہاتھ

مارتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولے اور ساتھ ہی کار کا ہارن بھی دو تین مرتبہ بجا دیا۔ حویلی کے آگے مختصر سا باغیچہ بنا ہوا تھا اور پھولوں کی کیاریاں بھی باغیچے کے ساتھ ساتھ دو رویہ صدر دروازے تک چلی گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا اپنے ہاتھ میں لالٹین تھامے نمودار ہوا۔ اس بوڑھے کو یہ لوگ پہلی ہی نظر میں پہچان گئے تھے۔ یہ نندو بابا تھے جنہوں نے نہ صرف رمیش لال کھرانہ بلکہ ان کے آنجہانی پتا کو بھی گودوں کھلایا تھا...... کھرانہ فیملی سے نندو بابا کا کچھ ایسا ہی پرانا تعلق تھا۔ رمیش لال ان کا بہت احترام کرتے تھے...... نندو بابا اتنی عمر کو پہنچ کر بھی توانا تھے...... تاہم وقت کو حساب دیتے دیتے اب ان کی کمر میں خم آ چکا تھا...... انہیں دیکھ کر یہ لوگ سب کار سے اتر آئے...... نندو بابا اپنی بیٹی کے ساتھ اسی حویلی میں مقیم تھے جس کا نام لاجونتی تھا...... مگر پیار سے سب اسے لاجی کہتے تھے...... جب کبھی بھی رمیش کمار کھرانہ یا ان کے عزیز وغیرہ اس پُر فضا علاقے میں بغرضِ سیر و تفریح آتے تو ''رام بھون'' میں فروکش ہوتے تھے۔ پھر نندو بابا اور ان کی جوان بیٹی لاجی ان کی خدمت کرنے میں بڑی تندہی کے ساتھ مصروفِ کار ہو جاتے تھے۔ اس وقت ''رام بھون'' حویلی کے جو اوپری دریچے روشن تھے وہ انہی باپ بیٹی کی پُر خلوص خدمت کا ثبوت تھے۔ انہوں نے ان کے آنے کی اطلاع پاتے ہی حویلی کے دو کمروں کو اچھی طرح سے صاف ستھرا کر کے درست کر دیا تھا۔ نندو بابا کی گھریلو کہانی بھی غمناک تھی...... ان کی عرصے سے کوئی اولاد نہ تھی...... اور شادی کے پورے پندرہ بیس برس بعد جب نندو بابا کی پتنی ہرناں نے لاجونتی کو جنم دیا تو اس بیچاری کا دیہانت ہو گیا...... لاجی کی نندو بابا نے کن مصائب و آلام سے پرورش کی یہ وہی جانتے تھے......

''نندو بابا کیسے ہو؟'' رمیش لال کھرانہ ذرا آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

''بھگوان کی کرپا ہے لالہ! شکر ہے آپ خیریت سے پہنچ گئے۔ بڑی رات کر دی ویسے۔'' نندو بابا جواباً بولا۔ وہ رمیش لال کو ہی نہیں بلکہ اس کے آنجہانی پتا کو بھی لالہ کہتا تھا۔ ''آؤ بالیکا آؤ! اندر آ جاؤ۔'' وہ شانتی اور درگا سے بولا اور اپنی رہنمائی میں انہیں ساتھ لیتا ہوا غلام گردشوں اور بل کھاتے زینوں سے ہوتا ایک بڑے کمرے میں لے آیا۔ کمرے کی آرائش بڑی خوبصورت تھی۔ وسط میں ایک بڑا سا جہازی سائز کا قدرے

اونچا چوبی سرہانے والا پلنگ تھا اور چھت پر جھلملاتا ہوا فانوس لٹک رہا تھا۔ باہر سے حویلی جتنی قدیم طرز کی لگتی تھی اندر سے اتنی ہی جدید ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ یہ لوگ تھکے ہوئے تھے۔ لہٰذا کھانا کھاتے ہی سو گئے۔ یوں تو شانتی بھی سونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گئی تھی مگر ذہنی بے کلی کے باعث اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہر رات دبے پاؤں سرک رہی تھی...... کمرے کے محرابی دریچے کے چوبی کواڑ کھلے ہوئے تھے اور اس پر جھولتا ہوا مہین پردہ باہر سے آنے والی سبک خرام ہوا سے ہولے ہولے پھڑپھڑا رہا تھا۔ شانتی کی مسہری کے عین سامنے دیوار گیر کلاک رات کے دو بجا رہا تھا۔ اس قدر سناٹے میں اس کی بڑی سوئی ٹک...... ٹک...... ٹک...... شانتی کے دل و دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی...... شانتی اپنی مسہری پر لیٹی اپنے ساتھ پیش آمدہ ان پراسرار واقعات کے بارے میں غور کر رہی تھی جنہوں نے اس کی نیند اُڑا دی تھی...... کار کے آگے یک دم کسی عورت کا پراسرار سایہ آ جانا...... پھر اپنے کانوں میں کسی نسوانی سرگوشی کی سرسراہٹ...... یہ سب اسے بے چین و متحیر کئے دے رہے تھے۔ ایک لمحے کو تو اس کے ذہن میں یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ اس کا وہم ہی ہو جو بقول اس کے پتا جی رمیش کھرانہ کے کہ یہ سب ویران اور ہولناک ماحول کی کارستانی ہوتی ہے جو انسان کی قوتِ متخیلہ کو مہمیز کر کے اس پُراسرار انداز میں حملہ آور ہوتی ہے۔

معاً کمرے کے چوبی پٹ زور سے آپس میں ٹکرائے اور شانتی کا دل دھڑک اٹھا...... وہ چونکی تھی...... وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے...... وہ آہستگی سے چلتی ہوئی دریچے کے قریب آئی۔ سامنے باہر کا ماحول ہولناکی میں ڈوبا ہوا تھا...... آسمان دور تک بالکل صاف تھا...... دور تک چٹکی ہوئی چاندنی اور ان گنت ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی روشنی میں اسے سر بفلک پہاڑ کی چوٹیاں نظر آئیں جو نشیب میں گھنے اور تاریک جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کو شانتی کو نظارہ بڑا بھلا لگا۔

بہر طور شانتی کو دریچے کے دونوں پٹ زور سے بجنے کی وجہ یہی سمجھ میں آئی کہ ہوا کا کوئی تیز جھونکا ٹکرایا ہو گا۔ لیکن اسے ہوا کا کوئی تیز جھونکا محسوس نہیں ہوا تھا...... دوسرے اسے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ دریچے کے دونوں پٹ جو اندرونی سمت میں کھلتے تھے جو اندر کی طرف ایک ''دھتم'' کے ذریعے مضبوطی سے اٹکے ہوئے تھے لہٰذا ان کے

خود بخود کھل کر سمجھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا...... شانتی کا دل یہ سب کچھ سوچ کر یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ بہرطور اس نے دوبارہ دونوں پٹ اندر کی طرف کھول کر تھم میں اٹکا دیئے تاکہ دریچہ کھلا رہے، نرم نرم خشک ہوا کا گزر ہوتا رہے...... لیکن ابھی وہ واپس اپنی مسہری کی جانب پلٹی ہی تھی کہ اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کے قریب ہی کسی نے زور سے گہری سانس کھینچی ہو...... وہ ٹھٹک گئی...... لیکن رکی نہیں۔ وہ محتاط انداز میں اطراف کی سن گن لیتی مسہری تک پہنچی اور دھیرے دھیرے ٹھٹکتے ہوئے انداز میں مسہری پر دراز ہوگئی...... اسی لمحے پھر اس کی سماعت سے پراسرار نسوانی سرگوشی ٹکرائی اور اس بار بہت واضح تھی۔

''بیٹی...... تم آ گئی ہو...... اب میں شانت ہو جاؤں گی...... مجھے...... مجھے اب شکتی مل جائے گی۔'' سرگوشی سن کر شانتی کو پہلی بار اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی...... مگر پھر ایک عجب بات یہ ہوئی کہ شانتی کو یوں لگا جیسے وہ خود بخود نیند کی گہری اور پرسکون وادی میں اترتی چلی جا رہی ہو...... تھوڑی دیر بعد وہ پرسکون نیند میں ڈوب چکی تھی۔

اگلے دن علی الصبح شانتی کی آنکھ کھلی بلکہ اسے نندو بابا نے اسی کے کہنے پر اتنی صبح جگایا تھا۔ رات والے واقعہ کو شانتی نے سردست راز میں رکھنا ضروری سمجھا تھا۔ وہ اب پہلے اس گاؤں کی صبح خیزی سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی...... جو اس کی کمزوری تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ گاؤں کی صبح اور شام کے مناظر بڑے دلفریب ہوتے ہیں...... صبح کی سیر کے لئے شانتی نے نندو کی بیٹی لاجی کو ساتھ لیا۔ لاجی ایک سیدھی سادی اور معصوم سی لڑکی تھی۔ وہ لاجی کے ساتھ باہر چہل قدمی کرتی ہوئی ''رام بھون'' سے ذرا آگے نکل آئی۔ بہت جلد دونوں آپس میں گھل مل گئی تھیں۔ کیونکہ شانتی بہت عرصے بعد یہاں آئی تھی۔ ''گڑھی پریم'' بڑے خوبصورت، پرفضا علاقے میں واقع تھی۔ دور تک سبزے کی چادر زمین پر بچھی ہوئی تھی۔ ایک جانب طویل جنگلی پہاڑی سلسلہ تھا جس کی دلفریب ڈھلانوں پر نشیبی جنگل بنے ہوئے تھے اور جہاں سے ان گنت خوش رنگ پرندوں کے زور زور سے بولنے اور چہچہانے کی جلترنگ آوازیں آ رہی تھیں۔ نندو بابا کی بیٹی لاجی نے بتایا کہ ڈیرہ دون کا یہ گھنا جنگل اور پہاڑیاں کئی سو میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں جو

آگے جا کر میسور کی پہاڑیوں کے علاوہ چکروتا کی پہاڑیوں اور ہردوار کے جنگلات سے مل جاتے ہیں۔ شانتی ان معلومات سے کافی محظوظ ہو رہی تھی۔ اسے نیلے اور شفاف آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے سفید ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح تیرتے ہوئے بڑے بھلے نظر آ رہے تھے...... شانتی ہری ہری دوب والے ایک ٹیلے پر مشرق کی سمت اپنا منہ کر کے کھڑی ہوگئی۔ پھر اپنے ہونٹ سختی سے بند کرنے کے بعد ایک گہری سانس اندر کھینچی اور پھر اپنا منہ قدرے کھول کر دھیرے دھیرے سانس باہر خارج کرنے لگی...... چند لمحے یہی عمل دہرانے کے بعد جب وہ یوگا کی یہ بنیادی ورزش کر چکی تو پھر اس نے باقاعدہ یوگا کی دیگر مشقوں کے آسن لگانا شروع کر دیئے...... ایک طرف کھڑی لاجی بڑی حیران کن نظروں سے شانتی کو یوگا کرتے ہوئے تکے جا رہی تھی...... اسے یوں لگا جیسے شانتی کے نرم و نازک جسم میں ہڈی نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔

کوئی نصف گھنٹے بعد شانتی یوگا سے فارغ ہوئی اور اب خود کو بہت ہلکی پھلکی اور پرسکون محسوس کر رہی تھی...... یوگا کرنے کے بعد وہ اپنے اندر اعصابی قوت محسوس کر رہی تھی۔ ایک غیر معمولی اعصابی قوت...... پھر اس کے بعد وہ دونوں واپس ''رام بھون'' آ گئے جہاں حویلی کے باغیچے میں اس کے ماتا پتا ناشتے میں مصروف تھے۔

''شانتی!...... یہاں بھی شروع ہوگئی تمہاری یوگا......'' اب اس کی ماں درگا نے شانتی کی طرف دیکھتے ہوئے پیار سے کہا اور اس کے لئے جوس انڈیلنے لگی۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ورزش وغیرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے...... تم کون سا فیٹی (موٹی) ہو۔''

''اوہ نو ممی! یوگا سے محض جسمانی نہیں بلکہ ذہنی اور آتما کی بھی ورزش ہوتی ہے۔'' شانتی جوس کا گلاس اپنی ماں سے لیتے ہوئے بولی۔ ''اس سے قوتِ فیصلہ مضبوط اور آتما شانت ہوتی ہے۔''

''اچھا بھئی رہنے دو اپنا بھاشن......'' اس کی ماں جان چھڑوانے والے انداز میں بولی۔ اپنی پتنی کی بات پر رمیش لال کھرانہ نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور شانتی بھی اپنے پتا کی طرح مسکرا کر ناشتہ کرنے بیٹھ گئی۔

وہ شام کا وقت تھا۔ دن بھر کھیتوں میں کام کرنے والے تھکے ماندے کسان اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ دور افق پر آفتاب غروب ہونے کی تیاری میں تھا۔ پرندوں کی خوش رنگ ڈاریں آشیانے کی طرف محو پرواز تھیں۔ یہی وہ منظر تھا جو شانتی کو بہت انسپائر کرتا تھا۔ اس وقت اس کا ذہن ''گڑھی پریم'' آتے ہوئے اپنے ساتھ بیتنے والے پراسرار واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ وہ اس بات پر غور کرنے لگی کہ آخر وہ کس کی سرگوشیاں تھیں جو اس کی سماعت سے ٹکرائی تھیں اور گزشتہ شب بھی اس کے کمرے میں اسے ایک اور سرگوشی سنائی دی تھی جس میں ممتا بھری حلاوت تھی۔ اسے کسی نے ''بیٹی'' کہہ کر مخاطب کیا تھا...... سرگوشی کے الفاظ اس کے دل و دماغ میں گونج رہے تھے۔ پھر اسے وہ بات بھی یاد آنے لگی جب ''گڑھی پریم'' آتے ہوئے اچانک ہی ان کی کار کے آگے کسی عورت کا ہیولا آ گیا تھا۔ مگر تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ سایہ اس کے ماتا پتا کو دکھائی نہیں دیا تھا حالانکہ وہ دونوں ہی کار کی اگلی سیٹ پر براجمان تھے۔ کیا وہ سب اس کا وہم تھا؟ محض اس کی قوتِ متخیلہ کا شاخسانہ یا پھر حقیقت...... کوئی پراسرار حقیقت یا کوئی ایسا راز جس پر سے پردہ اٹھنے والا تھا اور...... اور...... جو اس کی ذات سے وابستہ تھا۔

معاً شانتی کھڑے کھڑے چونک گئی اور اس کے خیالات منتشر ہوتے چلے گئے۔ اسے اپنے سامنے تھوڑے سے فاصلے پر ایک شاندار سجی سجائی بگھی آتی ہوئی دکھائی دی جس پر ایک راجکماروں ایسی شان والا نوجوان براجمان خود ہی کوچوانی کرتا نظر آیا۔ شانتی اس وقت اکیلی ہی سیر کو نکلی تھی۔ اس کے ہمراہ نندو بابا کی بیٹی لاجی نہیں تھی۔

شانتی یک ٹک اس راجکمار کو دیکھنے میں محو ہو گئی...... وہ اسی جانب آ رہا تھا۔ شانتی سطحی ذہن رکھنے والی لڑکی نہیں تھی کہ ہر ایرے غیرے نوجوان لڑکے کو اس کی شان و شوکت کے ساتھ دیکھ کر ریجھ جاتی۔ اس نوجوان کا چہرہ متاثر کن تھا۔ اس کے چہرے کے انوکھے پن نے شانتی جیسی ''ریزرو'' لڑکی کو بالکل ہی محو کر کے رکھ دیا تھا۔ شاید یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب اجنبیت انسیت میں بدل جاتی ہے۔ آنے والے راجکمار نے بھی باگیں کھینچ لی تھیں۔ فوراً دونوں گھوڑے ہنہنا کر رک گئے...... راجکمار جیسا وہ نوجوان شانتی پر نظریں جمائے نیچے اترا...... اس کے قریب آیا...... دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں...... پھر شاید دونوں کے دلوں نے بیک وقت اس بات کی گواہی دی کہ عرصے سے ان کا

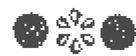
دل چپکے چپکے تڑپ رہا تھا وہ یہی تو ہے...... جو اس کی جاگتی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ بس پھر صدیوں کا سفرِ الفت لمحوں میں طے ہوتا چلا گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ رہے۔

اس کا نام ارجن داس تھا۔ وہ ''گڑھی پریم'' کے ٹھاکر دیال داس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انہوں نے اب روز کا ملنا معمول بنا لیا تھا اور جلد سے جلد ایک دوسرے کے ہو جانا چاہتے تھے کیونکہ شانتی اور اس کے ماتا پتا کا ''رام بھون'' میں قیام تھوڑے ہی عرصے کے لئے تھا کیونکہ رمیش لال شہر کے ایک کالج میں پروفیسر تھے اور تھوڑے دنوں کی چھٹیاں لے کر بغرض تفریح ''گڑھی پریم'' آئے تھے۔

''شانتی! تمہیں اپنے ماتا پتا سے بات تو کرنا ہی پڑے گی ایک دن......'' آخر ارجن نے ایک دن اس سے کہا تو شانتی ذرا تذبذب کا شکار ہو گئی...... کیونکہ اسے خود ارجن کے بارے میں اپنے ماتا پتا سے بات کرنا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا...... شانتی کو خاموش پا کر ارجن داس دوبارہ بولا۔ ''تم کہو تو میں خود ہی پہل کروں اور اپنے باپو کے ساتھ تمہارے رام بھون آ جاؤں؟''

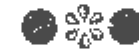
''آں...... نن...... نن نہیں ارجن......'' شانتی جیسے یکدم چونکی۔ ''یہ ابھی درست نہیں ہو گا۔ اچھا تم ٹھہرو، میں پہلے چپکے سے اپنی ماتا سے بات کروں گی...... دیکھوں گی کہ وہ اس سلسلے میں مجھے کیا مشورہ دیتی ہیں......''

شانتی کی بات سن کر ارجن کے چہرے پر ذرا تردد کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا ''ٹھیک ہے شانتی...... مگر ذرا جلد ہی بات کر لینا...... بلکہ آج ہی کر لینا تو بہتر ہو گا...... کل اس جگہ آ کر مجھے بتا دینا......'' اس کے بعد وہ دونوں مزید کچھ دیر گھومتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر اس کے بعد شانتی واپس ''رام بھون'' لوٹ آئی۔



''ممی وہ بہت اچھا لڑکا ہے......'' شانتی موقع ملتے ہی تنہائی میں اپنی ماتا درگا دیوی سے بولی۔ وہ ارجن کے بارے میں اپنی ماں کو پہلے ہی اعتماد میں لے چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ماں مسکراتے ہوئے اس کا کومل سا گال پیار سے تھپتھپا کر بولی۔

''ارے بھئی آخر...... تمہاری پسند ہے کوئی غلط تو نہ ہو گی۔ ہم تمہیں جیسے جانتے نہیں۔ بے چارے ارجن کو تو تمہیں رام کرنے میں کتنے پاپڑ بیلنے ہوں گے...... یہ تو وہی جانتا ہو گا...... چلو...... میں تمہارے ڈیڈی سے آج ہی رات بات کر کے دیکھتی ہوں۔'' درگا دیوی نے کہا...... اور شانتی مطمئن سی ہو گئی...... اس وقت رات کے دس بجے کا عمل تھا اور رمیش لال کھرانہ اپنی اسٹڈی میں موجود تھے۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز پر وہ چونکے...... پھر ''لیس کم ان'' کہتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا تو اپنی پتنی درگا دیوی کو اندر آتے دیکھ کر کتاب بند کر دی۔



اگلے دن شانتی نے خوشی خوشی ارجن سے ملاقات پر اسے خوشخبری سنائی کہ اس نے اپنے ماتا پتا سے اس سلسلے میں بات کر لی ہے اور انہوں نے اس کے ڈیڈی سے بھی اشارتاً تذکرہ کر ڈالا ہے۔ ایک آدھ روز میں یہ بات ہو سکتا ہے طے ہو جائے۔

ارجن یہ سن کر ایک دم خوش ہو گیا اور اس خوشی میں اس کے جی میں جانے کیا سمائی کہ وہ اسے بصد شوق...... اپنی حویلی میں اپنے پتا ٹھاکر (دیال داس) سے ملوانے کی غرض سے لے آیا......

اور شانتی نے بھی اس کے ہمراہ جانے پر ذرا بھی تامل نہ کیا۔ ارجن اسے اپنی بگھی میں سوار کروا کر حویلی میں داخل ہوا۔

''ارے ارجن! واہ، تمہاری حویلی تو بڑی شاندار ہے۔'' شانتی ایک ہال نما کمرے میں، جو غالباً نشست گاہ کے طور پر مستعمل تھا پہنچ کر خاصا مرعوب ہوتے ہوئے بولی۔ دیواروں پر ٹھاکروں کے خانوادے، آباؤ اجداد کی رعونت آمیز تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔

''تم یہاں بیٹھو۔ میں اپنے باپو کو بتا کر ابھی آتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد شانتی نے دیکھا کہ اس کے ہمراہ ایک بھاری بھر کم جسامت کا آدمی نمودار ہوا جو ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ وہ جان گئی کہ یہ ارجن کے پتا جی ٹھاکر دیال داس ہیں۔ شانتی نے ادب سے انہیں پرنام کیا۔ ٹھاکر دیال داس، شانتی کو آشیرباد دینے کے بعد وہیں بیٹھ گئے۔ ابھی ان کے درمیان رسمی باتیں شروع ہوئی تھیں کہ اچانک ہی ایک محیر العقول واقعہ رونما ہوا۔ ایک دم شانتی کی حالت متغیر ہونے لگی اور اس کا گول

چہرہ کرخت اور بہت بھیانک ہوتا چلا گیا۔

سامنے بیٹھے ہوئے ٹھاکر دیال داس اور انکا بیٹا ارجن داس شانتی کی یکلخت بدلتی ہوئی ڈراؤنی ہیئت پر دم بخود رہ گئے...... اسی لمحے شانتی جس کا چہرہ خوفناک حد تک بھیانک ہو چکا تھا کہ حلق سے ایک خرخراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ وہ ٹھاکر دیال داس سے مخاطب تھی۔

''ٹھاکر...... پہچانو مجھے...... میں سومنا ہوں...... جسے تم نے پورن ماشی کی ایک رات شمشان گھاٹ میں زندہ گاڑ دیا تھا...... اب پورن ماشی کی رات میں تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں اور اتنے ہی تیری زندگی کے بھی......'' جملہ ختم ہوتے ہی شانتی اپنی اصلی حالت میں لوٹ آئی۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنی بدلی ہوئی خوفناک کیفیت کا بالکل ہی علم نہ ہوا اور نہ ہی یہ کہ اس نے اپنے پریمی ارجن داس کے باپو ٹھاکر دیال داس کو کس خوفناک انداز میں دھمکایا تھا۔ ارجن نے پلٹ کر اپنے پتا جی ٹھاکر دیال داس کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کے پتا جی کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔

''یہ...... یہ...... یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا شانتی......؟'' ارجن حیرت اور خوف کے ملے جلے انداز میں بولا۔

شانتی خود حیران تھی کہ دونوں باپ بیٹا اسے اتنے عجیب انداز اور نظروں سے کیوں تکے جا رہے ہیں اور ٹھاکر دیال داس اتنے خوفزدہ اور سراسیمہ سے کیوں ہیں۔

''اسے...... اسے لے جاؤ یہاں سے...... ارجن...... دور لے جاؤ اسے میری نظروں سے۔'' ٹھاکر دیال داس نے بوکھلاتے ہوئے قدرے درشت لہجے میں اپنے بیٹے ارجن کو حکم دیا۔

بے چارہ ارجن خود عجیب پریشانی میں مبتلا تھا۔ پھر ٹھاکر دیال داس واپس خود ہی اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

''ارجن...... یہ تمہارے باپو کو ایک دم کیا ہو گیا تھا......؟'' شانتی حیرت سے بولی۔

''میرے باپو کو نہیں بلکہ تمہیں کچھ ہو گیا تھا شانتی......'' ارجن ذرا سخت لہجے میں بولا...... دراصل وہ خاصا پریشان ہو چکا تھا۔

"مم...... مجھے؟ مجھے کیا ہو گیا تھا ارجن...... بھگوان کے لئے مجھے بتاؤ ارجن، میں کچھ نہیں جانتی۔ کیا ہوا تھا مجھے؟......" اس کی بات پر ارجن چند ثانیے کسی سوچ میں غرق رہا پھر شانتی کو اس کی اچانک بدلتی ہوئی کیفیات کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں پھر ارجن اس سے بولا۔

"شانتی تم کون ہو؟ مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں باپو کے سامنے اچانک یہ کیا ہو گیا تھا؟"

شانتی چند لمحے اس کی جانب حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر اس کے بعد بولی...... "مجھے خود نہیں معلوم ارجن! میں تمہارے پتا جی کو جب پرنام کرنے لگی تو اچانک میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ پھر میں خود کو جیسے بے حس و حرکت محسوس کرنے لگی۔ جب تاریکی چھٹی تو تمہارے باپو کو میں نے جانے کیوں خوف زدہ سا اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا...... کیا واقعی ارجن......! تم نے دیکھا تھا یہ اچھی طرح کہ میرا چہرہ خوفناک اور آواز بھاری ہو گئی تھی......؟"

"ہاں شانتی تمہارا سندر چہرہ یک دم ڈراؤنا اور خوفناک ہو گیا تھا اور تم نے باپو کو دھمکایا بھی تھا۔"

اس کی بات پر شانتی پریشان سی ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ ارجن کے باپو سے بھلا اس کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ میں تو انہیں اس سے پہلے جانتی تک نہیں تھی۔ انہوں نے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔

اسے پریشان و ششدر دیکھ کر ارجن تشویش سے بولا۔ "گھبراؤ نہیں شانتی! یہ کوئی پراسرار معاملہ لگتا ہے مجھے...... جسے ہم دونوں نے بلکہ تم نے حل کرنا ہو گا...... مجھے تم پر کسی گندی آتما کا سایہ لگتا ہے۔ تم ایسا کرو اس بات کا تذکرہ اپنے پتا جی سے کر کے دیکھو...... اور اپنے بارے میں ان سے کچھ پوچھ کر دیکھو...... مجھے یقین ہے انہیں کہیں ضرور تمہارے بارے میں کچھ پتہ ہو گا۔ آخر کو تمہارے پتا جی ہیں وہ......"

ارجن کی بات پر وہ چونک سی گئی پھر ارجن سے بولی۔ "ارجن! تمہیں بھی اپنے باپو کو کریدنا ہو گا۔ آخر یہ سب کچھ انہی کے ساتھ کیوں ہوا؟"

اس کی بات پر ارجن نے پُر خیال انداز میں اپنا سر ہلایا پھر وہ بگھی میں سوار ہو کر

واپسی کے لئے چل پڑے......



"پتا جی! میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟" شانتی نے اپنے پتا رمیش سے پوچھا اور وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے اس سوال پر دنگ رہ گئے...... یہ رات کا وقت تھا اور یہ سب لوگ بھوجن وغیرہ سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ درگا دیوی اپنے کمرے میں جا کر سو چکی تھیں جبکہ رمیش لال کی آنکھوں سے جانے کیوں ابھی تک نیند کوسوں دور تھی اور وہ یونہی اپنی لاڈلی بیٹی شانتی کے کمرے میں آ گئے تھے۔ درحقیقت وہ کچھ دنوں سے اپنی بیٹی میں عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ وہ اسے اکثر گم صم اور کھویا کھویا سا پانے لگے تھے۔ حسب توقع شانتی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ کسی گہرے خیال میں غرق تھی۔ اپنے پتا جی کو دیکھتے ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گئی تھی اور پھر یہ بات چھیڑ دی تھی۔ اس کے اس عجیب و غریب اور اچانک سوال پر رمیش لال کھرانہ ایک لمحے کو بری طرح ٹھٹکے تھے۔

"کیوں بیٹا! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تم ہماری بیٹی ہو...... اور ہم تمہیں بہت چاہتے ہیں۔" انہوں نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے جواباً بڑے رسان سے کہا۔

"مگر پتا جی کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ مجھے آپ اور ماتا جی کے علاوہ بھی کوئی اور پیار کرتا ہے...... ممتا بھرا پیار......" شانتی بدستور عجیب سی کھوئی ہوئی کیفیت میں بولی۔

"پتا جی......! کبھی کبھی تو مجھے اپنی سماعتوں میں بالکل صاف اور واضح طور پر ممتا بھری سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ وہ کوئی پراسرار عورت ہے جو سامنے نہیں آتی۔ لیکن مجھے لوریاں رات کو سناتی ہے۔" اتنا بتا کر شانتی خاموش ہو گئی اور رمیش لال اس کی بات سن کر بری طرح دنگ رہ گئے۔

"بتائیے ناں...... پتا جی میں کون ہوں...... میرا ماضی کیا ہے...... مجھے تو کبھی کبھی ایسا بھی لگتا ہے جیسے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہوں...... آپ میری گزشتہ زندگی کے کسی تاریک و پراسرار پہلو کے بارے میں جانتے ہیں۔"

رمیش لال اپنی لاڈلی کی اس قدر زودفہمی پر بھونچکا رہ گئے...... اور ان کی آنکھوں اور چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شانتی کی بات پر اپنے دل کا چور چھپانے کی ناکام سعی کر رہے ہوں۔

شانتی کے پیہم اصرار پر وہ خاموش سے ہو گئے۔ پھر وہ جیسے اس سے کتراتے ہوئے طفل تسلی دے کر اپنے بیڈ روم میں آ گئے...... اندر آ کر وہ اپنی ایزی چیئر پر براجمان ہو گئے...... ان کا چہرہ کسی عمیق سوچ کا غماز نظر آنے لگا۔ وہ اب گہری سنجیدگی سے ان سارے واقعات پر باری باری غور و خوض کر رہے تھے جب یہ لوگ ''گڑھی پریم'' میں داخل ہوئے تھے کہ راہ میں شانتی کو پراسرار انسانی سایہ نظر آیا تھا اور ساتھ ہی اسے کسی کی سرگوشیاں بھی سنائی دی تھیں جو شانتی کو اب بھی کبھی کبھی سنائی دیتی تھیں۔

پھر شانتی نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ ارجن کے بابو ٹھاکر دیال داس کے سامنے کس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا...... یہ ساری باتیں محیر العقول اور ناقابل یقین سہی لیکن بہرطور ان پراسرار واقعات کے شواہد بھی موجود تھے۔ رمیش لال کھرانہ ہر شے کو حقیقت اور سائنسی توجیہات کے تناظر میں پرکھنے کے عادی تھے...... تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ان عوامل نے انہیں بالآخر ماضی کے کسی گم گشتہ باب کو کھولنے پر مجبور کر دیا۔ پھر انہیں برسوں پہلے کی وہ بھیانک اندھیری رات یاد آ گئی......

آج سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے جب رمیش لال اپنی پتنی درگا دیوی کے ہمراہ اپنے گاؤں ''گڑھی پریم'' سے شہر واپس جا رہے تھے کہ گڑھی پریم میں رمیش لال کے ماتا پتا بھی رہتے تھے جبکہ خود رمیش لال اپنی تعلیم اور نوکری اور شادی وغیرہ کے بعد شہر میں آباد ہو گئے تھے۔ شہر کے ایک کالج میں وہ پروفیسر تھے۔ انہوں نے بہت کوششیں کیں کہ اپنے ماتا پتا کو شہر میں اپنے ساتھ ہی رکھیں مگر وہ آبائی بستی پریم گڑھی کو کسی طور پر بھی چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ ان دنوں رمیش لال کی پتنی درگا دیوی کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی۔ ان کی پتنی دو مرتبہ امید سے ہوئیں مگر دونوں ہی بار ان کا ''ابارشن'' ہو گیا جس کی وجہ سے درگا دیوی کا ذہنی توازن بگڑنے کا خطرہ لاحق ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے یہ تک بھی کہہ دیا تھا کہ اگر بہت جلد ان کی گود ہری نہ ہوئی تو یہ اپنا ذہنی توازن کھو سکتی ہیں۔ بہرطور اس بات نے رمیش لال کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ خیر انہوں نے اپنے کالج سے ایک ماہ کی چھٹی لی اور ''گڑھی پریم'' آ گئے۔ یہاں آ کر ان کی پتنی درگا دیوی کی طبیعت نے کچھ سنبھالا لیا مگر جہاں کہیں بھی وہ کسی بچے کو دیکھتی، اس کی آواز سنتی فوراً بے قرار ہو جاتی تھی۔ مہینہ پورا ہوا تو انہوں نے گڑھی پریم سے واپسی کا سفر

باندھا۔ فضا اور ماحول کی خوشگوار تبدیلی نے درگا دیوی پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ بہرطور وہ واپس ہوئے اور دورانِ سفر رات نے آن لیا۔ سونے پر سہاگہ کہ ایسے میں موسلادھار بارش نے بھی آ لیا۔ وہ ابھی تک گڑھی پریم کی کچی حدود میں تھے کہ اچانک ان کی کار کا انجن بند ہو گیا۔ شاید کار کے کاربوریٹر میں پانی چلا گیا تھا۔ باہر چاروں طرف گھور تاریکی کا راج تھا۔ رمیش لال کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ پچھلی سیٹ پر ڈالی جہاں ان کی پتنی سو رہی تھی۔ وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے ہونٹ بھینچے بیٹھے رہے...... وہ بارش کے رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر جلد ہی ان کی مراد بر آئی، بارش کم ہوتے ہوتے تقریباً بالکل بند ہو گئی۔ وہ کار کے ڈیش بورڈ کے خانے سے ٹارچ نکال کر باہر آ گئے۔

باہر ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ بارش کے بعد موسم خاصا خنک ہو گیا تھا البتہ ٹہنیوں اور پتیوں سے ٹپکنے والے قطرے جب نیچے جمع شدہ پانی میں گرتے تو بڑا دلفریب سا جلترنگ بج اٹھتا۔ رمیش لال کھرانہ اگرچہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے لیکن بہرطور فطرتاً اس اندھیارے جنگل میں انہیں گمان آمیز اضطراب ضرور محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ٹارچ کی محدود روشنی میں کار کا بونٹ اٹھا کر اس کی خرابی دیکھنے لگے۔ خرابی معمولی ہی سی تھی جو چند منٹوں میں دور ہو گئی۔ انہوں نے بونٹ بند کیا اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک اپنے عقب میں ایک تیز اور کربناک کراہ سنائی دی...... وہ دہل گئے۔ یوں اندھیری رات اور ویران جنگل میں کسی انسان کی کراہ اچھے بھلے انسان کا دماغ ماؤف کر سکتی تھی۔ اگر کراہ دوبارہ نہ ابھرتی تو رمیش لال اُسے اپنا وہم ہی سمجھتے لیکن وہ کراہ اب بتدریج آہوں میں بدل رہی تھی۔ رمیش لال نے اپنا دل مضبوط کیا اور آواز کی سمت ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ایک لمحے کو ان کے جی میں آئی کہ وہ یہاں سے واپس لوٹ جائیں مگر پھر ان کا دل نہ مانا...... آہوں اور اب سسکیوں کے آہنگ سے یہ اندازہ ہوتا تھا جیسے کوئی بڑی تکلیف میں ہو۔ واضح طور پر اب پراسرار اور کربناک آواز نسوانی معلوم ہونے لگی۔ رمیش لال کھرانہ اسی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بالآخر وہ اس جگہ پر پہنچ گئے۔ لیکن وہاں کا منظر دیکھتے ہی وہ بری طرح ٹھٹک گئے۔

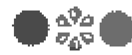
ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے جو بھیانک منظر دیکھا وہ اچھے خاصے مضبوط دل گردے والے انسان کو کپکپا دینے کے لئے کافی تھا۔ رمیش لال بھی یہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھ کر لرز اٹھے...... کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے کیچڑ میں ایک عورت انتہائی جان کنی کے عالم میں پڑی سسک رہی ہے اور اس کے قریب ہی ایک نوزائیدہ بچہ پڑا ہمک رہا تھا۔ کیچڑ میں خون کی بھی کافی آمیزش نظر آ رہی تھی۔ وہ عورت انتہائی اذیت میں معلوم ہوتی تھی لیکن اس وقت اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اور پھر اس سے پہلے کہ متحیر کھڑے رمیش لال اس جاں بہ لب بدنصیب عورت کی طرف بڑھتے، اس گھائل وجود نے ایک آخری جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا...... وہ مر چکی تھی تاہم رمیش لال ڈگمگاتے قدموں سے ذرا قریب ہو گئے تو انہیں قریب ہی زمین میں ایک گڑھا بھی کھدا ہوا نظر آیا۔

قریب پڑا وہ نوزائیدہ بچہ اب اپنی باریک آواز سے آؤں آؤں کر رہا تھا۔ رمیش لال کو کچھ نہ سوجھا۔ اس نے بچے کو اٹھا لیا اور اپنی فیاٹ کار میں آ کر اسے ایک کپڑے سے اچھی طرح صاف کر کے اپنی پتنی درگا کی گود میں لٹا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانا چاہی۔ اچانک ان کے ذہن میں آیا کہ اس بدنصیب عورت کا جسد خاکی یوں چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ لیکن چونکہ اب وہ مر چکی تھی دوسرے نہ ہی ان کے پاس اس نازک حالت میں کوئی ایسا بندوبست تھا جس سے وہ اس عورت کا کریا کرم کرتے۔ لہٰذا یہ خیال ذہن سے جھٹک کر وہ آگے کو ہو لئے۔

گاڑی چلانے کے دوران جہاں تک ان کو سمجھ میں آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ اس عورت کے ساتھ ضرور کوئی ظلم ہوا ہے۔ اس حالت میں بھی کسی ظالم نے اسے زندہ زمین میں دفن کر دیا تھا جو بعد میں درد زہ کی وجہ سے تڑپی ہو گی اور بارش کی وجہ سے مٹی نرم ہو جانے پر باہر آ گئی ہو گی اور ایک نئی زندگی کو جنم دے کر خود اپنی زندگی ہار گئی ہو گی۔ تاہم اب انہوں نے یہ حتمی فیصلہ کر ڈالا تھا کہ وہ اب اس بچے کو اپنے پاس رکھ کر درگا دیوی کی گود ہری کر دیں گے۔ انہوں نے اپنی پتنی سے یہی کہا کہ یہ اس کا اپنا بچہ ہے۔ وہ نیم پاگل سی تو تھی ہی، ممتا کی ماری نے اسے واقعی اپنا بچہ سمجھ کر سینے سے لگا لیا۔ یہ بچی اب ''شانتی'' کی صورت میں ان کی اولاد بن چکی تھی جسے اب یہ دونوں میاں بیوی اپنی

اولاد کی طرح ہی چاہنے لگے تھے۔

شانتی سے بھی رمیش لال نے آج تک یہ سنسنی خیز اور اندوہناک راز چھپا رکھا تھا کہ وہ انہیں کن بھیانک حالات میں ملی تھی۔ اب وہ ان سب باتوں کو اپنے دل میں کہیں دفن کر چکے تھے ہمیشہ کے لئے...... مگر اب اٹھارہ سال بعد جن پراسرار عجیب و غریب حالات سے شانتی گزر رہی تھی انہوں نے بہرحال رمیش لال کو ماضی کریدنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان سارے حالات و واقعات کے تناظر میں رمیش لال نے تجزیہ کرتے ہوئے سوچا کہ اٹھارہ سال پرانے جس اندوہناک واقعے کو وہ دفن کر چکے تھے...... شاید اس کے آشکارا ہونے کا وقت آن پہنچا تھا جس کی کڑیاں شانتی کی زندگی سے مل رہی تھیں...... اور اس پراسرار تعلق کی بناء پر شانتی آج ان پُراسرار حالات سے دوچار ہو چکی تھی اور بالآخر اس نے آج قدرے تنگ آ کر ان سے (رمیش لال) اپنے ماضی کے متعلق پوچھ لیا تھا۔ اب رمیش لال خود شش و پنج کا شکار تھے کہ وہ شانتی کو اس اندوہناک حقیقت سے آگاہ کس طرح کریں...... کہیں یہ بات اس کی یا خود ان کی اپنی پتنی درگا دیوی پر منفی اثر نہ کرے...... تاہم سردست انہوں نے شانتی کو ٹال دیا تھا...... لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں آخر ایک نہ ایک دن شانتی کے سامنے یہ اندوہناک حقیقت ظاہر کرنی پڑے گی۔



کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ خاصے ڈیل ڈول اور آبنوسی رنگت کا ایک شخص گیروے رنگ کی دھوتی باندھے آگ روشن کئے گیان دھیان کے سے انداز میں آنکھیں موندے بیٹھا کسی جاپ میں محو تھا۔ اس کے قریب ٹھاکر دیال داس خاصا پریشان کھڑا تھا۔

''بھیرو جلدی بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟ کیا کوئی آتما میرے خون کی پیاسی ہو رہی ہے؟''

''دھیرج ٹھاکر...... دھیرج......'' بھیرو نامی وہ تانترک شخص اپنی آنکھیں موندے اطمینان سے بولا۔ وہ کالے جادو اور سفلی علوم کا ماہر ٹھاکر دیال داس کا خاص آدمی تھا۔

''ٹھاکر...... جس انسان کا ماضی کیول کھلواڑ میں ہی بیتا ہو...... اسے پھر ہر آفت کا سامنا

کرنے کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا چاہئے۔"

"بھیرو.....!" دیال داس حلق کے بل چیخا جس سے اس کی ذہنی ابتری اور ژولیدگی ہویدا تھی۔ "مانا کہ تُو ہمارے پریوار کا پرانا خاص تانترک ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تُو ہم سے اس لہجے میں بات کرے۔"

"نہ..... نہ ٹھاکر! تم غلط نہ سمجھو ہمیں۔" بھیرو شعلوں پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔ "میں تو تمہیں شانت رہنے کو کہہ رہا ہوں۔ اچھا ذرا ٹھہرو، سب بتاتا ہوں تمہیں۔"

پھر وہ اپنے سیاہ موٹے موٹے ہونٹ بدبدانے لگا۔

ٹھاکر دیال داس بے چینی و غصے کی کیفیت میں اسے کچھ پڑھتے دیکھنے لگا۔ دراصل وہ شانتی سے ملنے کے بعد بری طرح خائف ہوگیا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ شانتی کے اندر کوئی بے قرار آتما گھسی ہوئی ہے جو اس کی جان کی دشمن ہے یا اس سے کسی قسم کا کوئی انتقام لینا چاہتی ہے۔ لہٰذا ٹھاکر دیال داس نے بھیرو کو یہ سب بتا کر اسے اس آتما کی تلاش اور اس کے خاتمے پر مامور کر دیا تھا۔ چند لمحوں بعد تانترک بھیرو اپنی آنکھیں کھول کر ٹھاکر دیال داس کے سامنے گویا ہوا۔

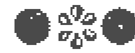
"سنو ٹھاکر! آج سے اٹھارہ برس پہلے اساڑھ کے مہینے میں ایک سیتا سمان کنواری کنیا اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ تمہاری جاگیر میں داخل ہوئی تھی اور جسے تم نے اغواء کر کے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا اور جب تمہارا دل اس سے بھر گیا تو اسے تم نے پورنیما کی رات شمشان گھاٹ میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ اس وقت وہ کنیا ماں بننے والی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ اس روز تیز بارش ہوئی اور کسی طرح سے وہ کنیا ہاتھ پاؤں چلاتی گڑھے کی گیلی نرم مٹی ہٹا کر باہر نکل آئی اور اسی وقت اس نے ایک بچی کو جنم دیا اور خود جان ہار بیٹھی۔ اس بچی کو کسی نے اپنی اولاد کی طرح پال پوس کر جوان کیا....." کچھ دیر تانترک بھیرو نے توقف کیا پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "ٹھاکر! یہ سب باتیں مجھے تین دنوں تک مسان کے پاٹھ میں مصروف رہتے ہوئے معلوم ہوئی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس بدنصیب سومنا، جسے تم نے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا اب اس کی آتما کو ایک ایسی شکتی مل چکی ہے جو ٹھیک پورن ماشی کی رات میں اپنی بیٹی جو درحقیقت "رام بھون" کے گھرانہ خاندان میں پرورش پا کر جوان ہوئی اور جس کا نام شانتی ہے، کے شریر میں داخل ہو کر

تجھ سے اپنے اوپر ہوئے انیائے کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔" تانترک بھیرو اتنا کہہ کر چپ ہوگیا۔

ٹھاکر دیال داس اس کی آخری بات پر بری طرح خوفزدہ ہو کر ہکلاتے ہوئے بولا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو پنڈت! مجھے اب اس آتما سے کیونکر نجات مل سکتی ہے؟"

بھیرو نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں موند لیں..... شعلوں میں یکبارگی حدت آگئی اور بھیرو کا چہرہ آتشیں ہونے لگا۔ وہ شاید پھر کسی جاپ میں مشغول ہو چکا تھا۔



رات انتہائی تاریک تھی اور اس وقت "رام بھون" کے اطراف پُراسرار ویرانی مسلط تھی۔ البتہ کہیں دُور پرے گیدڑوں اور لگڑ بھگوں کے چلّانے کی منحوس آوازیں رات کے سکوت میں برچھیوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔ شانتی اپنے کمرے میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ معاً مغرب کی سمت کھلنے والے ایک محرابی دریچے پر اچانک ایک سایہ نمودار ہوا جس نے سیاہ چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ وہ سایہ نہایت ہوشیاری سے اندر کودا۔ وہ چند لمحے ساکت رہ کر سن گن لیتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں پھر شکرے ایسی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے غالباً شانتی کو سامنے گہری نیند میں سویا دیکھ لیا تھا۔ اپنے شکار کو گہری نیند میں ڈوبا پا کر وہ اندر کود آیا۔ اب گربہ پا کے ساتھ آگے مسہری کی جانب بڑھنے لگا۔ یہ ٹھاکر دیال داس کا بھیجا ہوا ایک گرگا تھا جو اس کے حکم کے مطابق شانتی کو موت کے گھاٹ اتارنے آیا تھا۔ کیونکہ تانترک بھیرو نے ٹھاکر کو سومنا کی منتقم آتما سے نجات لانے کا یہی طریقہ بتایا تھا کہ وہ کسی طرح سے اس کی بیٹی یعنی شانتی کو ہلاک کر ڈالے تو سومنا کی آتما بے بس ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ صرف اپنی بیٹی شانتی ہی کے شریر میں داخل ہو کر ٹھاکر دیال داس کو ہلاک کر سکتی تھی اور یہ موت کا کھیل پورنیما کی رات کو ہی پورا ہو سکتا تھا۔ اسی رات میں سومنا کی آتما کو مکمل شکتی مل سکتی تھی۔ جس شخص کو ٹھاکر دیال داس نے شانتی کے قتل پر مامور کیا تھا، اس کا نام نارو تھا جسے پورنیما کی رات سے قبل شانتی کو بہرصورت قتل کرنا تھا اور وہ اب فرشتۂ اجل بنا شانتی کے سر پر کھڑا تھا۔

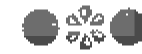
پھر نارو نامی اس قاتل نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اپنی چادر کے اندر سے ہاتھ برآمد کیا جس میں ایک لمبے پھل والا خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے ایک نظر سامنے دنیا و

مافیہا سے بے خبر محوِ خواب شانتی کے گلنار چہرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں سفاکی کی چمک لہرائی پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ شانتی کے منہ پر رکھا، تاکہ چیخنے کی آواز منہ سے نہ نکل سکے اور خنجر والا ہاتھ بلند کیا...... لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس پر وار کرتا معاً شانتی کی آنکھیں عجیب میکانکی انداز میں وا ہو گئیں۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جانے کیا بات تھی کہ نارو کا خنجر والا ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا اور شانتی یکدم مشینی انداز میں مسہری پر اٹھ بیٹھی۔ اگلے ہی لمحے اس کا حسین اور کومل چہرہ یکایک خوفناک ہوتا چلا گیا اور اس پر سیاہ رنگ کی دراڑیں سی پڑنے لگیں۔ نارو یہ دیکھ کر بری طرح خوفزدہ ہو گیا اور دو قدم پیچھے کی جانب ہٹ گیا۔ اس نے دیکھا، شانتی کے خوفناک چہرے پر بڑی بھیانک مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور وہ سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ تب اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز ابھری۔

"آؤ...... مجھے مارو...... آؤ...... یہ خنجر میرے سینے میں پیوست کر دو...... ہا، ہا، ہا......"

اس کے ساتھ ہی شانتی کا چہرہ اس کے شانوں پر لٹو کی طرح گھومنے لگا۔

نارو یہ ڈراؤنا منظر دیکھ کر چیخیں مارتا ہوا بھاگا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ دریچے سے باہر کود گیا۔ اس کے بعد شانتی کا چہرہ اپنی اصل صورت اختیار کر گیا اور وہ پہلے کی طرح گہری نیند سو گئی۔



ٹھاکر دیال داس کے بھاری ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ نارو کے گال پر پڑا اور وہ چند قدم پیچھے کو لڑکھڑاتا چلا گیا۔ "لعنت ہو تجھ پر بزدل کی اولاد!" ٹھاکر زور سے پھنکارتے ہوئے بولا۔ "تجھے سمجھا کر بھیجا تھا کہ سومنا کی آتما میں ابھی اتنی شکتی نہیں آئی کہ وہ کسی کو نقصان پہنچا سکے البتہ تیرے جیسے لوگ اگر اس طرح ڈرنے لگے تو سومنا کی آتما کو شکتی مل جائے گی اور وہ ہم سب کا خون پی جائے گی۔ بے وقوف! سومنا کی آتما کو صرف پورنیما کی رات میں شکتی مل سکتی ہے۔ وہ شانتی کی صورت میں خوفناک چہرے بنا کر خوفزدہ تو کر سکتی ہے مگر اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کسی کا کچھ بگاڑ سکے اور تو نے بدبخت وہ موقع گنوا دیا۔ مجھے اب ہر قیمت پر شانتی کا مُردہ شریر چاہیے ورنہ میں تجھے مُردہ کر دوں گا۔ جا دفع ہو جا یہاں سے۔"

نارو وہاں سے دم دبا کر چلا گیا اور ٹھاکر دیال داس کے چہرے پر شدید تذبذب کے آثار پھیلتے چلے گئے۔ وہ ہر قیمت پر شانتی کو پورنیما سے پہلے ختم کر دینا چاہتا تھا۔



وہ لمبے پھل والا خنجر جو اگلے دن صبح شانتی کے کمرے سے ملا تھا، اس وقت رمیش لال کے ہاتھوں میں تھا اور ان کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار پھیلے ہوئے تھے۔ شانتی بھی ان کے قریب حیران و پریشان موجود تھی۔ یہ وہی خنجر تھا جو گزشتہ شب نارو کے پاس تھا اور وہ خوف کے مارے وہاں سے بھاگ اٹھا تھا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر وہیں گر گیا تھا۔

"اوہ! میرا خواب سچا تھا۔ اس کا مطلب......" معاً شانتی تحیر خیز لہجے میں رمیش لال کھرانہ سے بولی۔

"خواب...... کیا مطلب بیٹی؟"

"ہاں پتا جی! میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ کوئی مجھے قتل کرنے میرے کمرے میں آیا ہے۔ اس قاتل کے پاس بالکل ایسا ہی خنجر تھا...... لیکن پھر یوں ہوا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھا اور اپنا یہ خنجر چھوڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی تھی۔" شانتی نے اپنا خواب مختصراً بیان کیا۔ اس کی بات سن کر رمیش لال مزید پریشان ہو گئے تھے۔ وہ سوچنے لگے کوئی پراسرار چکر ضرور ہے۔ کوئی میری بیٹی کی جان کے درپے ہے۔ لیکن وہ کون ہے؟ اور کیوں شانتی کی جان کا دشمن ہے؟ وہ کون سی خفیہ اور پُراسرار طاقت ہے جس نے شانتی کو اب تک محفوظ رکھا ہوا ہے؟ تاہم انہوں نے شانتی کو ہوشیار رہنے کی تاکید کر دی تھی

"بیٹی! اس بات کا ذکر ابھی اپنی ماتا جی سے نہ کرنا...... ورنہ وہ پریشان ہو جائیں گی۔" انہوں نے کہا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پہلے انہوں نے سوچا کہ اپنی بیٹی اور پتنی سمیت یہاں سے واپس چلے جائیں مگر اس طرح شانتی کے دشمن کا پتہ نہیں چلے گا اور وہ پھر وار کرنے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا دشمن کو پھانسنے کے لئے فی الحال بے خبری ہی برتی جائے۔ انہوں نے شانتی کی خفیہ نگرانی کرنا شروع کر دی۔



"بھیرو......! شانتی کو ختم کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔" ٹھاکر دیال داس پُر خیال لہجے میں تدبیر طلب نظروں سے تانترک بھیرو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں اس وقت حویلی کے ایک کمرۂ خاص میں موجود تھے اور بھیرو نے اس وقت عام سا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس نے بغور ٹھاکر دیال داس کی بات سنی اور دھیرے دھیرے اثباتی انداز میں سر ہلانے لگا۔

"شانتی کو ختم کرنا جتنا آسان ہے اتنا مشکل بھی ہے ٹھاکر......!" بالآخر بھیرو نے کہنا شروع کیا۔ "آسان اس لئے کہ شانتی کو کسی بھی وقت اور کسی بھی طریقے سے ہلاک کیا جا سکتا ہے اور اس کی ماں سومنا کی آتما بھی طاقت کے زور پر اسے نہیں بچا سکتی......لیکن مشکل یہ ہے کہ سومنا اپنی بیٹی شانتی کو بروقت کسی ایسے طریقے سے صاف بچا لیتی ہے کہ اسے ہلاک کرنے والا خود خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھتا ہے۔ جیسا کہ نارو کے ساتھ ہوا حالانکہ اگر وہ اس کے خوفناک چہرے کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتا اور وہ خنجر شانتی کے سینے میں اتار دیتا تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ شانتی بھی ہلاک ہو جاتی اور تجھے بھی سومنا کی گندی آتما سے ہمیشہ کے لئے مکتی مل جاتی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے بھیرو...... میں نارو کو دوبارہ اچھی طرح سمجھا کر بھیجوں گا۔ مجھے امید ہے وہ ضرور شانتی کا کام تمام کر کے ہی لوٹے گا۔" ٹھاکر دیال داس مضبوط اور پُر اُمید لہجے میں بولا۔

"نارو کو دوبارہ بھیجنے کی غلطی نہ کرنا ٹھاکر......!" بھیرو نے کہا۔ "نارو کے ناکام واپس لوٹنے سے شانتی اور اس کے پتا وغیرہ ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔ نارو کو اگر تم دوبارہ بھیجو گے تو ہو سکتا ہے وہ اس بار ان کے ہتھے ہی چڑھ جائے۔"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا بھیرو...... مجھے اگر شانتی سمیت پورے رام بھون کے مکینوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا پڑا تو ہرگز دریغ نہیں کروں گا۔" ٹھاکر خشمناک لہجے میں بولا۔

"دھیرج ٹھاکر......" بھیرو اپنی گھنی بھنووں کو سکیڑ کر بولا۔ "یہ مت بھولو...... کہ تمہارا بیٹا ارجن، شانتی کو پسند کرتا ہے۔ اگر اسے پتہ لگ گیا کہ تم اس کی پریمیکا کی جان کے دشمن ہو تو......" اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کی بات پر ٹھاکر کے چہرے پر گہری الجھن اُمڈ آئی۔ "بھیرو پھر تم ہی بتاؤ کیا، کیا جائے...... پورن ماشی تو سر پر آن پہنچی ہے۔" ٹھاکر کے لہجے میں اس بار لرزش تھی...... موت کی لرزش......

بھیرو چند ثانیے کسی گہری سوچ میں غلطاں رہنے کے بعد اچانک بولا۔ "کسی طرح شانتی اگر دوبارہ اس حویلی میں آ جائے تو میں خود ہی اسے ہلاک کر سکتا ہوں۔" بھیرو کے لہجے میں ایکا ایکی سفاکی عود کر آئی۔

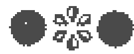
اس کی بات سن کر ٹھاکر کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔ "لیکن...... بھیرو...... شانتی یہاں آئے کیسے...... ہو سکتا ہے اس کے پتا نے اس کے یہاں آنے پر پابندی لگا دی ہو۔"

"مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہو گا۔ کیونکہ شانتی تمہارے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ اس کے کہنے پر ضرور یہاں کھنچی چلی آئے گی۔ بس تم کسی طرح سے اپنے بیٹے ارجن سے کہو کہ وہ اپنی پریمیکا کو یہاں لے کر آئے۔" بھیرو نے کہا تو ٹھاکر یکدم عذر تراشتے ہوئے بولا۔

"اس طرح اسے میرے بیٹے کے ذریعے یہاں بلا کر تم اگر شانتی کو ہلاک کرو گے تو کیا ارجن بددل نہ ہو گا؟"

"نہیں...... یہ تم مجھ پر چھوڑ دو...... میں اپنا کام صفائی سے کرنا جانتا ہوں۔ ویسے ٹھاکر! اگر اپنی جان بچانی ہے تو یہ سب کرنا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے بھیرو۔ تم صحیح کہتے ہو۔ میں ارجن سے کسی بہانے شانتی کو یہاں بلواؤں گا۔" ٹھاکر نے آمادہ ہو کر کہا۔



فضا اس وقت نم آلودہ ہوا سے خنک ہو رہی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ ایک جھیل کے کنارے سرسبز سی گھاس پر ارجن اور شانتی ساتھ بیٹھے تھے مگر ان کے متفکر چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوشگوار ماحول کی اثر پذیری سے یکسر بے نیاز تھے۔ قریب ہی ارجن کی شاندار بگھی کھڑی تھی۔ ارجن کچھ زیادہ ہی متفکر نظر آ رہا تھا...... کیونکہ شانتی اسے گزشتہ شب کے اس واقعے سے آگاہ کر چکی تھی کہ کوئی اسے قتل کرنے کی غرض سے آیا

تھا۔

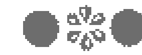
''شانتی......! تم ایسا کرو...... وہ خنجر جو تمہارے کمرے میں قاتل چھوڑ کر بھاگا تھا...... وہ مجھے دکھاؤ۔'' معاً ارجن نے شانتی سے کہا تو وہ ذرا چونکی اور مستفسرانہ انداز میں بولی۔

''تم اس کا بھلا کیا کرو گے؟ ویسے میں تمہیں لا دوں گی۔ وہ پتا جی نے سنبھال کر رکھا ہے۔''

''شانتی! گڑھی پریم ایک چھوٹا قصبہ ہے...... اتنا کہ اگر میں یہاں کہیں کسی کا گرا ہوا برتن بھی دیکھ لوں تو مجھے پتہ چل جائے گا کہ وہ کس گھر کا ہے...... میرا پورا بچپن یہاں گزرا ہے...... ہوسکتا ہے وہ خنجر دیکھ کر میں پہچان جاؤں کہ وہ کس کا ہے؟''

شانتی ارجن کی بات پر ٹھٹکی۔ پھر وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ ''ارے واہ ارجن! تم تو پورے جاسوس نکلے۔ مجھے بھی یقین ہے تم ضرور اس خنجر کو دیکھ کر کسی نتیجے تک پہنچ سکتے ہو۔ تم ایسا کرو ابھی چلو میرے ساتھ...... اسی بہانے تم میرے ماتا پتا سے بھی مل لو۔ آخر کو کبھی تمہیں ان کے سامنے آنا ہی ہے۔''

ارجن کے چہرے پر چند ثانئے تردّد کے آثار ابھرے۔ پھر وہ راضی ہوگیا۔



وہ دونوں رام بھون پہنچ گئے...... مگر اتفاق سے اس وقت کوئی بھی وہاں نہیں تھا سوائے حویلی کے پرانے خدمت گار نندو بابا کی بیٹی لاجونتی کے...... لاجونتی، شانتی کی رازداں تھی۔ وہ شانتی کو ارجن داس کے ساتھ دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں دھیرے سے پرنام کیا۔

''ارے...... یہاں تو کوئی نہیں...... لاجی...... کہاں گئے سب۔'' شانتی ارجن کو لئے اندر ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے حیرت سے بولی۔

''رمیش بابو اور بیگم صاحبہ تو کہیں باہر گھومنے نکل گئے ہیں...... جبکہ باپو پائیں باغ میں ترکاری توڑنے گئے ہیں۔''

''اچھا تم ایسا کرو...... ان کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔'' شانتی نے اسے ہدایت دی پھر ارجن سے مخاطب ہوئی۔ ''تم ادھر بیٹھو...... میں ابھی آئی۔'' یہ کہتے

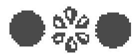
ہوئے وہ تقریباً دوڑتے ہوئے زینے طے کرتی بالائی کمرے تک پہنچی۔ وہ کمرہ اس کے پتا رمیش لال کا تھا کیونکہ خنجر انہی کے کمرے میں ایک اونچی اور بھاری بھر کم الماری کے اندرونی خانے میں رکھا ہوا تھا۔ شانتی نے جلدی سے الماری کھولی پھر کپڑے میں لپٹے ہوئے خنجر کو احتیاط سے سنبھالے ہوئے نیچے ارجن کے پاس آگئی اور خنجر کپڑے سمیت اس کے حوالے کر دیا۔ ارجن نے کپڑا کھول کر خنجر کو بغور دیکھا تو بری طرح چونک پڑا۔ شانتی بھی اس کے بدلے ہوئے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

''کیا تم نے پہچان لیا ارجن کہ یہ کس کا خنجر ہے؟'' معاً شانتی نے پوچھا۔

ارجن ہنوز حیرت اور اچنبھے میں مبتلا تھا۔ اس کے چہرے کے تحیر خیز تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خنجر اور اس کے مالک کو پہچان چکا ہے لیکن اس شخصیت کے بارے میں وہ متردد تھا...... تاہم اس نے شانتی کی بات کا مبہم سا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''شانتی...... کیا یہ خنجر تم مجھے دے سکتی ہو...... بعد میں تم بے شک یہ مجھ سے لے لینا۔''

''ہاں...... تم بے شک اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ لیکن بھگوان کے لئے کچھ بتاؤ تو سہی کیا تم نے اس خنجر کے مالک کو پہچان لیا ہے؟'' شانتی نے کہا۔

''یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔ ویسے یہ خنجر میں نے پہچان لیا ہے کہ کس کا ہے...... مگر پہلے میں اپنے طور پر پوری تسلی کروں گا، اس کے بعد میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... جس نے تمہیں اس خنجر سے ختم کرنے کی کوشش کی۔'' یکایک ارجن کی آنکھوں میں انتقام کی چنگاریاں سی سلگنے لگیں اور شانتی کو اپنے محبوب کو اپنے بارے میں اتنا پُرجوش دیکھ کر ایک انوکھا سا فخر محسوس ہوا۔ بہرطور ارجن سے اب وہاں رام بھون میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا جاسکا اور وہ شانتی کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔



ارجن داس اپنی عالیشان حویلی پہنچا تو سخت تذبذب کا شکار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آیا وہ اس خنجر کے بارے میں جو وہ شانتی سے لے کر آیا تھا، کھلے بندوں اس شخص سے پوچھے یا پھر سردست خاموش رہے اور محتاط انداز میں اس شخص کی نگرانی کرتا رہے...... پھر اسے اپنا دوسرا خیال زیادہ بہتر محسوس ہوا۔ کیونکہ ارجن اس شخص کو خنجر کے حوالے سے

پہچان چکا تھا اور اسے سو فیصد یقین تھا کہ یہ خنجر اسی شخص کا ہے لیکن اگر اس نے وا شگاف انداز میں اس سے خنجر کے متعلق پوچھ لیا تو وہ نہ صرف صاف مکر جائے گا بلکہ محتاط بھی ہو جائے گا...... بہرطور ارجن نے یہی فیصلہ کیا کہ بظاہر قاتل کو بے خبر رکھ کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کرے گا۔ علاوہ ازیں اس پراسرار راز سے پردہ اٹھائے گا کہ آخر وہ شانتی کو کیوں قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی شانتی سے کیا دشمنی ہے؟

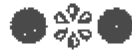
اسی اثناء میں اسے ٹھاکر دیال داس نے اپنے پاس بلایا۔

''بیٹے ارجن! تم نے دوبارہ کبھی اپنی پریمیکا شانتی سے نہیں ملوایا...... آخر تمہارا کیا پروگرام ہے، کیا تم واقعی اس سے سگائی کے بارے میں سنجیدہ ہو؟'' اس کے باپ ٹھاکر دیال داس نے پوچھا تو نجانے کیوں ارجن کو اپنے باپ میں ایک سازش کی سی بُو محسوس ہوئی...... کیونکہ اسے ابھی تک یاد تھا کہ شانتی جب پہلی بار اس کے باپو کے سامنے آئی تھی تو ایک انتہائی ڈراؤنا واقعہ پیش آیا تھا جس سے بری طرح خائف ہو کر اس کے باپو ٹھاکر دیال داس نے نہ صرف شانتی کو دھتکار کر حویلی سے نکل جانے کو کہا تھا بلکہ ارجن کو بھی سرزنش کرتے ہوئے شانتی سے مزید راہ و رسم بڑھانے سے روکنا چاہا تھا...... لہٰذا آج اپنے باپو کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ دوبارہ اس کی پریمیکا شانتی سے ملنا چاہتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اسے کسی سوچ میں غلطاں دیکھ کر ٹھاکر داس دوبارہ قدرے مکاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''ارے بھائی چپ کیوں ہو...... جانتا ہوں میں اس کی وجہ...... سنو میری بات غور سے......'' ٹھاکر دیال داس چند لمحے توقف کر کے بولا۔ ''آؤ ارجن، میرے پاس بیٹھو۔'' ٹھاکر نے اسے اپنے قریب ہی مہاگنی کے جہازی سائز پلنگ پر بٹھا لیا اور خود گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو......! تمہاری شانتی پر کسی گندی آتما کا سایہ ہے۔ اس میں شانتی کا یقیناً کوئی دوش نہیں ہے لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہیں وہ تمہیں نہ نقصان پہنچا دے۔ میں اسی لئے اسے یہاں بلانا چاہ رہا ہوں کہ اس پر گندی آتما کا سایہ اتارا جائے...... اور تم جانتے ہو کہ یہ کام تانترک...... بھیرو سے بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا۔''

اپنے باپو کے منہ سے بھیرو کا نام سن کر اچانک ہی ارجن کے اندر نفرت کا الاؤ سا بھڑکنے لگا...... تاہم اس نے اپنی ابلتی ہوئی کیفیت پر قابو پائے رکھا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا باپ اور بھیرو دونوں مل کر کسی سازش کے تانے بانے بننے میں ایک دوسرے کے شریک ہیں اور شانتی کو حویلی بلانا اسی سازش کی ایک کڑی محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم ارجن نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تو اس کا باپو ایک دم کھل اٹھا۔

''شاباش ارجن! بس پھر اسے جلدی یہاں لے آؤ کسی دن......'' ٹھاکر دیال داس نے کہا اور ارجن دھیرے دھیرے اثبات میں اپنا سر ہلانے لگا۔



فیصلہ کن گھڑی آ پہنچی تھی۔ قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا تھا۔ اگرچہ اس میں شانتی کی زندگی کو خطرہ تھا...... لیکن مستقل خطرناک اور جان لیوا صورت حال کا سامنا کرنے سے بہتر تھا کہ ایک ہی مرتبہ نمٹ لیا جائے...... تاہم ارجن نے بھیرو پر اب کڑی نظر رکھی ہوئی تھی اس لئے کہ وہ خنجر اسی کا تھا جسے ارجن ایک دن حویلی کے عقب میں بنے اس کے جاپ والے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ بچپن میں وہ اسے جادوگر چاچا کہا کرتا تھا...... اور یہی وجہ تھی کہ اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اس کا شبہ اب یقین میں بدل گیا تھا کہ جادوگر چاچا (بھیرو) اور اس کا باپو ٹھاکر دیال داس کی ملی بھگت سے ہی اس کی شانتی کے خلاف موت کی سازش تیار کی جا رہی ہے۔ اس کے پیچھے کیا راز تھا کہ وہ دونوں معصوم شانتی کی جان کے کیوں درپے تھے۔ ارجن اس سے ہنوز نابلد تھا اور یہی سب معلوم کرنے کی غرض سے وہ بالآخر اگلے ہی دن شانتی کو لے کر اپنی حویلی آن پہنچا۔

ٹھاکر دیال داس کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ایک خاص چمک سی لہرائی۔ پھر وہ اس کے قریب آ کر رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

''دیکھو بیٹی شانتی...... گھبرانا نہیں۔ تم پر گندی آتما کا سایہ ہے...... وہ تمہیں کسی بھی وقت یا ارجن کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

اس اثناء میں بھیرو بھی گیروے لباس میں وہاں آن موجود ہوا...... وہ بغور شانتی کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔ ارجن بھیرو کو دیکھتے ہی خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسے اب سخت ناپسند کرنے لگا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا ادھر ہی خاتمہ کر دے۔

ادھر بھیرو بڑی عجیب نظروں سے شانتی کو تکے جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں شانتی کو اپنے تابع کرنا چاہتا ہو۔ تب بھیرو دھولے سے شانتی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"شانتی! آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہتے ہی بھیرو واپس مڑا تو پاس کھڑے ارجن نے دیکھا کہ شانتی کسی مشینی انداز میں...... اپنے اطراف حتیٰ کہ اس سے بھی لاتعلق ہو کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی تانترک بھیرو کے عقب میں ہو لی۔

"شانتی......!" ارجن نے چونک کر اسے آواز دی تو ٹھاکر دیال سنگھ نے فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن...... ارجن شانتی کو اس طرح بے یارومددگار بھیرو جیسے مکار قاتل کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے باپو کی پرواہ کئے بغیر شانتی کے عقب میں ہولیا تو ٹھاکر غصے سے چلایا۔

"ارجن...... رک جاؤ...... بھیرو کو اپنا کام کرنے دو۔" مگر ارجن اپنے باپو کی بات نظر انداز کرتا ہوا شانتی کے عقب میں ہولیا جو اب بھیرو کے پیچھے میکانکی انداز میں چلتی ہوئی حویلی کے عقب میں بنے ایک بڑے سے کمرے میں آ گئی تھی۔

ارجن نے بھی اندر داخل ہونے کی کوشش کی مگر وہ یہ دیکھ کر بری طرح چونک گیا کہ شانتی نے مکمل ٹرانس کی حالت میں کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا تھا...... ارجن زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

"شانتی...... شانتی...... دروازہ کھولو...... یہ کیا بے وقوفی کر رہی ہو...... بھیرو تمہیں مار دے گا...... جان سے...... دروازہ کھولو شانتی......" مگر اندر سے کسی قسم کی آواز نہ ابھری۔ اثنائے راہ اس کے عقب میں دوڑتا ہوا ٹھاکر دیال داس بھی وہاں آن پہنچا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا تھا...... مگر ارجن نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی اور اپنے باپو کو مخاطب کرتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

"باپو...... باپو...... بھگوان کے لئے...... بھیرو سے کہو وہ شانتی کو چھوڑ دے...... وہ اسے اندر لے گیا ہے...... کہو نا باپو...... بھیرو سے...... وہ میری شانتی کو چھوڑ دے۔"

ارجن پر اچانک دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ صورت حال یوں اچانک ہی پلٹا کھا جائے گی۔

"خود کو سنبھالو...... ارجن...... یہ کیا بچگانہ پن ہے۔ شانتی کے سر پر گندی آتما کا سایہ ہے...... اور بھیرو وہ سایہ اس کے سر سے اتارنا چاہتا ہے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہاری شانتی ایک گندی آتما سے نجات حاصل کر لے؟" ٹھاکر نے درشت لہجے میں اسے سمجھایا مگر ارجن کو تو کسی اور ہی سازش کی بو آ رہی تھی۔

ناگاہ اندر کمرے میں شانتی کی ایک دلدوز چیخ ابھری جس نے ارجن کو سرتاپا لرزا کر رکھ دیا...... پھر ایک تواتر کے ساتھ شانتی کی چیخیں سنائی دینے لگیں جنہوں نے ارجن کا دماغ الٹ دیا۔ اس نے پوری قوت سے دروازے کو ٹھوکر ماری اور پٹ کو توڑتا ہوا اندر جا گرا۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی وہ دھک سے رہ گیا...... بھیرو شانتی کی گردن اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں لئے ہوئے دبوچے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ارجن کا دماغ الٹ گیا۔ غصے اور طیش کے ایک طوفانِ بلاخیز نے اس کے اندر گویا طوفانی طاقت بھر دی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی دائیں ٹانگ کی ایک بھرپور ضرب بھیرو کے پہلو میں رسید کی اور اگلے ہی لمحے بھیرو کے حلق سے تیز چیخ سی ابھری اور فوراً ہی شانتی کی گردن اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ ارجن نے اس پر بھی بس نہ کی...... اس پر تو جیسے جنون سوار ہو چکا تھا۔

ادھر بھیرو اس اچانک صورت حال پر ششدر رہ گیا تھا۔ اتنا کہ اپنے پہلو پر پڑنے والی ضرب کی تکلیف بھی کچھ زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ارجن کو خونی نگاہوں سے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر گھبرایا۔

"چھوٹے ٹھاکر...... یہ...... یہ...... آپ کو کیا ہو گیا ہے...... مم...... میں...... تو شانتی کو گندی آتما......" مگر اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ کیونکہ ارجن نے اسے ایک اور زوردار ٹھوکر ماری اور لحیم شحیم بھیرو چند قدم ہٹ کر لڑکھڑا گیا۔

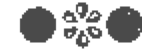
"میں...... تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... ذلیل...... کتے......" ارجن پر جیسے خون سوار ہو گیا تھا...... مگر عین وقت پر اس کے باپ ٹھاکر دیال داس نے بیچ میں آ کر اپنے بیٹے کو سنبھالتے ہوئے چلا کر کہا۔

"ہوش میں آؤ ارجن بیٹے......! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"نہیں باپو...... یہ میری شانتی کو مارنے لگا تھا۔" ارجن ہانپتے ہوئے بولا۔ پھر شانتی کی جانب متوجہ ہوا جو اپنا گلا دھیرے دھیرے مسل رہی تھی۔ "تم ٹھیک تو ہو نا شانتی؟"

"ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔" وہ باریک سی آواز میں بولی۔

"باپو...... اس کتے کو کہو یہاں سے چلا جائے ورنہ......" ارجن اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے دیال داس سے بولا اور ٹھاکر نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بھیرو کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔



یہ اس سے دو روز بعد کا ذکر تھا۔ رمیش لال بالائی منزل کے کمرے سے باہر کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس وقت رات کے تقریباً ایک بجے کا عمل رہا ہوگا کہ اچانک ان کی نگاہ اپنی بیٹی شانتی کے کمرے میں کھلنے والے دریچے پر پڑی۔ کوئی انسانی ہیولا نقب لگا کر دریچے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ رمیش کا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہوا۔ انہوں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ متواتر تین دنوں کی جانفشانی کے ساتھ شانتی کے کمرے کی خفیہ نگرانی کے بعد آج انہیں اپنی محنت بار آور ہونے کی امید ہونے لگی۔ انہیں شانتی کی طرف سے اطمینان ہوا کیونکہ انہوں نے اس دن کے بعد سے جب اس پر حملہ ہوا تھا...... شانتی کا کمرہ بدل دیا تھا...... البتہ اس کے کمرے میں بستر کے اوپر چادر تکیے ملا کر یوں رکھ دیئے تھے جیسے کوئی سو رہا ہو۔ تاہم انہوں نے بڑی گربہ قدمی سے چلتے ہوئے مطلوبہ کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر جھری سے آنکھ لگا لی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی ہیولا چادر کی بکل مارے بستر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اسی اثناء میں رمیش لال آہستگی سے دروازہ کھولنے لگے۔ ان کی پہلی کوشش یہی تھی کہ فائر کیے بغیر اسے قابو کر لیں۔ تاہم کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر انہوں نے پستول تھامے رکھا۔ ادھر وہ اجنبی نووارد مسہری کے قریب پہنچ کر رکا...... اس کی ساری توجہ بستر ہی کی جانب مرکوز تھی...... یہی وجہ تھی کہ وہ رمیش لال کو اندر داخل ہوتے دیکھ نہ سکا جو اب آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ چکے تھے۔

"خبردار! حرکت مت کرنا ورنہ بھون دوں گا گولیوں سے......" اجنبی نووارد رمیش لال کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہیں دم بخود رہ گیا۔

"میں اپنی بیٹی کی جان کے دشمن سے کسی طرح کی بھی رعایت سے کام نہیں لوں گا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم کون ہو اور کیوں میری بیٹی کو

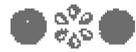
ہلاک کرنا چاہتے تھے...... بولو۔" رمیش نے چند قدم آگے بڑھ کر پستول والا ہاتھ ہلاتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

اجنبی چند لمحے تذبذب کا شکار رہا پھر لجاجت سے بولا۔

"صاحب جی! مم...... مجھے شما کر دو اگر میں نے آپ کو بتا دیا تو ٹھاکر مجھ سمیت میرے سارے پریوار کو جلتی ہوئی چتا میں ڈال دے گا۔"

"اگر تو نے میرے سامنے زبان نہ کھولی تو میں بھی تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" رمیش لال پھنکارے اور اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس میں تیری ایک بھلائی ہوگی کہ تو اگر مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دے گا کہ اصل قصہ کیا ہے تو میں کوئی ایسی صورت نکال لوں گا کہ تیری جان بچ جائے۔"

اس کی بات پر اس اجنبی قاتل کے چہرے پر رضامندی کے تاثرات ابھرے پھر وہ بتانے لگا۔ "میرا نام نارو ہے......"



ٹھاکر دیال داس اپنی حویلی میں بیٹھا بے چینی سے اپنے "ڈشکرے" نارو کا منتظر تھا...... جسے اس نے اپنے ناترک بھیرو کی جانب سے شانتی کو ہلاک کرنے کے سلسلے میں ناکامی پر پھر دوبارہ اس کو شانتی کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا...... اس کا بیٹا ارجن باپ سے ناراض ہو کر جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ٹھاکر جانتا تھا یہ اس کی پرانی عادت ہے...... خود ہی وہ دو ایک روز میں لوٹ آئے گا...... لہٰذا اس سلسلے میں اتنی چنتا نہ تھی...... اثنائے راہ ایک ملازم نے آ کر ٹھاکر کو اطلاع دی کہ "رام بھون سے رمیش لال گھرانہ آئے ہیں۔"

یہ سن کر ٹھاکر کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ کئی خیالات اس کے اندر گڈمڈ ہونے لگے۔ تاہم اس نے ملازم سے رمیش لال کو اندر آنے کا کہہ دیا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ رمیش لال شانتی کا باپ تھا...... لہٰذا وہ سوچنے لگا کہ آخر وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے...... اتنے میں رمیش لال وہاں آن وارد ہوا اور آتے ہی گلوگیر لہجے میں اور فریاد کرنے کے سے انداز میں بولا۔

"ٹھاکر صاحب! آپ کی جاگیر میں میرے ساتھ انیائے ہو گیا۔ کسی ظالم نے میری

بچی شانتی کو قتل کر دیا ہے...... میں ابھی ابھی اس کی چتا کو آگ لگا کر آ رہا ہوں۔" رمیش لال بدستور غم سے ڈوبے ہوئے لہجے میں بولے۔ رمیش لال کی آہ و زاری نے ٹھاکر دیال داس کو طمانیت بخشی تھی اور وہ یہ سن کر خاصا مطمئن و مسرور ہوا تھا مگر اس نے یہ سب ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ نارو نے اپنا کام خوش اسلوبی سے نپٹا دیا تھا۔ تاہم ٹھاکر دیال داس بڑی رعونت و نخوت سے درشت لہجے میں بولا۔

"تو میں کیا کروں؟ کوئی تھانیدار ہوں میں یہاں کا؟ پھر بھی چونکہ یہ سب میری جاگیر میں ہوا ہے اسی لئے میں تمہاری مدد کی کوشش کروں گا۔ تم جا سکتے ہو، میرے آرام کا وقت ہو رہا ہے اب......" یہ کہہ کر وہ بڑے پُرغرور انداز میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

"مورکھ! تیرے منہ میں خاک! تو بہت جلد اپنے عبرتناک انجام کو پہنچنے والا ہے۔"

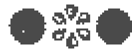
رمیش نے ٹھاکر کے وہاں سے جاتے ہی دل میں اسے کوسا اور وہاں سے لوٹ آیا۔ اس کی چال کامیاب رہی تھی۔ کیونکہ انہوں نے قاتل نارو سے سب کچھ اگلوا کر اسے اپنی حویلی کے ایک کمرے میں قید کر دیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ پورنیا کی رات، جب ظالم ٹھاکر سومنا کی بے چین آتما کے انتقام کا نشانہ بن جائے گا تو اسے چھوڑ دے گا۔

دراصل نارو کے ذریعے انہیں اصل حقیقت کا علم ہو چکا تھا کہ ٹھاکر دیال داس کیوں ان کی بیٹی شانتی کی جان کے درپے ہے۔ اگرچہ انہیں ان ساری باتوں پر مشکل ہی سے یقین آیا تھا...... لیکن گزشتہ حالات و واقعات کی روشنی میں انہیں یہ سب درست ہی نظر آ رہا تھا۔ شانتی کی اصل ماں...... سومنا آج سے اٹھارہ برس قبل انتہائی جانکنی کے عالم میں شانتی کو جنم دے کر ٹھاکر دیال داس کے عبرتناک ستم کا نشانہ بن کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی...... اور اب اس کی بے چین آتما اپنی بیٹی شانتی کے شریر کی شکتی حاصل کر کے ٹھاکر سے اپنے اوپر کئے گئے انیائے کا بدلہ لینا چاہتی تھی...... اور یہ سب پورن ماشی کی رات کو ہی ممکن تھا جس میں اب ایک دن رہ گیا تھا۔ لہٰذا ان سب باتوں کے تناظر میں رمیش لال نے اب چال یہ چلی تھی کہ ٹھاکر دیال داس کو پورن ماشی کی رات تک بے خبر رکھتے ہوئے شانتی کی موت کی جھوٹی خبر پہنچائے ورنہ ٹھاکر شانتی کو پورن ماشی سے پہلے ہر ممکن طریقے سے قتل کرنے کی کوشش کرے گا...... لہٰذا اب ٹھاکر مطمئن ہو گیا تھا اور رمیش لال بھی اطمینان سے واپس رام بھون لوٹ آئے۔

شانتی کے قتل کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے رمیش لال نے مصنوعی لاش کا کریا کرم کروا دیا تھا۔ البتہ اپنی پتنی درگا دیوی سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ یہ ساری کتھا چھپائی تھی۔ تاہم رام بھون کے پرانے نمک خوار نندو بابا کو ساری باتوں کا علم تھا۔ ادھر شانتی کو بھی اصل حقیقت سے آگاہی ہو چکی تھی۔ اسے اب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ رمیش لال کی بیٹی نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ کن عبرتناک حالات میں وہ انہیں ملی تھی اور اپنی ماں سومنا کے اوپر ہونے والے ظلم پر بھی اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن وہ ایک باحوصلہ لڑکی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کی ماں کی بے چین آتما کو ایک ایسی شکتی ملنے والی ہے جس کے ذریعے وہ پورن ماشی کی رات اس کے شریر میں داخل ہو کر ٹھاکر دیال داس سے اپنے اوپر ہونے والے انیائے کا بدلہ لے لے گی۔

"ماں...... اگر یہ سب سچ ہے تو...... میرا شریر تجھ پر قربان! میں خود بھی بے چین ہوں کہ کب بدبخت ٹھاکر اپنے انجام کو پہنچے اور تیری آتما کو شانتی ملے۔" شانتی یہ سب سوچتے ہوئے بے اختیار رو پڑی۔ پھر اسے یوں لگا جیسے اس کے قریب ہی کوئی دوسرا بھی سسکیاں لے رہا ہو۔

ٹھاکر دیال داس اس بات پر متعجب تھا کہ آخر نارو "اپنا کام" کر کے کہاں غائب ہو گیا۔ پھر وہ یہ سوچ کر خود ہی مطمئن ہو گیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی چند روز کے لئے کہیں غائب ہو گیا ہو۔



اس رات...... پورن ماشی کا بھرپور طباق چاند "گڑھی پریم" پر اپنی پراسرار اور اداس چاندنی نچھاور کر رہا تھا۔ گاؤں کے سب باسیوں کو نہ جانے کیوں آج پورن ماشی کا چاند زبردست جوبن پر محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج پورن ماشی کی آخری رات ہو۔ تمام باسی آج وقت سے پہلے ہی جانے کیوں گہری نیند میں ڈوب چکے تھے۔

رمیش لال کھرانہ پر اس وقت انتہائی عجیب و غریب کیفیت طاری تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ آج کی رات ایک پراسرار ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا ہے...... لیکن کیا یہ سب ممکن ہو گا...... وہ یونہی آہستگی سے چلتے ہوئے شانتی کے کمرے میں آئے تو انہوں نے اسے گہری نیند میں ڈوبا ہوا پایا۔ ان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کسی بھی لمحے

پراسرار کھیل کی ابتدا ہونے والی تھی اور وہ یہ سب اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آ کر ایزی چیئر پر بیٹھ گئے...... معاً ان پر غنودگی کے حملے ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ وہ نہ سوئیں مگر چند لمحوں بعد ہی وہ بھی نیند کی میٹھی اور نرم وادیوں میں اترتے چلے گئے۔

باہر پورن ماشی کا چاند اپنے جوبن پر تھا۔ ٹھنڈی ہوا برگد اور اکھی ماتا کے پیڑوں کے درمیان سے جب گزرتی تو پتے پُراسرار تماشائیوں کی طرح تالیاں پیٹتے محسوس ہوتے۔ شانتی گہری نیند میں تھی کہ معاً ایک بنفشی لکیر فضا میں تیرتی ہوئی اس کی ناک کے راستے شریر میں اتر گئی...... اور شانتی نے لیٹے لیٹے یکدم اپنی آنکھیں یوں کھول دیں جیسے بجلی کا سوئچ اچانک ہی آن کر دیا گیا ہو، پھر وہ اٹھ کر یوں چل دی جیسے کسی نے اس پر تنویمی عمل کر دیا ہو۔ وہ بلا خوف و خطر ننگے پاؤں رام بھون سے باہر آ گئی۔

اچانک اسے گیدڑوں اور جنگلی کتوں کے غول نے آ لیا مگر اس کے قریب پہنچتے ہی وہ یوں دُم ہلانے لگے جیسے شانتی سے خوفزدہ ہوں۔ اس کا رخ ٹھاکر دیال داس کی جانب تھا۔ نیچے زمین پر اس کے پیروں کے نشانات الٹے بنتے چلے جا رہے تھے۔

ٹھاکر دیال داس اپنے کمرے کی شاندار مسہری پر گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک کسی کھٹکے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے شانتی کسی زندہ لاش کی طرح کھڑی اسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ٹھاکر کی اسے دیکھ کر گھگھی بندھ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ شانتی کی آتما اس سے انتقام لینے آ پہنچی ہے۔

اتنے میں شانتی کا چہرہ یکایک تیز روشنی میں نہا گیا اور آنکھیں پھیل کر سرخ انگارہ سی بن گئیں۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی جو دوشاخہ تھی، سانپ کی طرح باہر لپکنے لگی تھی۔ تب ٹھاکر کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز خوفناک چیخ کی صورت برآمد ہوئی۔

"بھیرو...... بھبھ...... بھیرو......" ٹھاکر پاگلوں کی طرح چلاتے ہوئے تانترک بھیرو کو آوازیں دینے لگا۔

"ہا...... ہا...... چیخو...... اور چیخو ٹھاکر!...... آج تمہاری مدد کو کوئی نہیں آئے گا......"

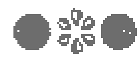
سومنا کی آتما، شانتی کے شریر سے بول رہی تھی...... اور اسی لمحے اس کا سر کسی پھرکی کی مانند گھومنے لگا اور گھومتے گھومتے اونچا ہوتا چلا گیا۔ اس کی گردن کئی فٹ لمبی ہو گئی تھی

جو کسی اژدھے کی مانند دہشت زدہ ٹھاکر کے گرد تیزی سے لپٹتی جا رہی تھی۔ ٹھاکر اس دہشت ناک منظر کی تاب نہ لا سکا اور حواس کھونے لگا۔ سومنا کی آتما اس کے چہرے پر سانپ کی طرح ڈس کر اسے پھر ہوش و حواس میں لے آئی۔ ٹھاکر پھر کرب اور خوف کے مارے چلانے لگا۔

"مجھے شما کر دو دیوی!...... مجھے بخش دو۔"

"نہیں ٹھاکر! نہیں...... تُو...... تُو اس سے بھی زیادہ کا مستحق ہے۔ یہ تو تیرے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔" سومنا اپنا سر شانوں سے ٹھاکر کے عین سامنے کر کے غراتے ہوئے بولی۔ اب پوری حویلی ٹھاکر کی کرب ناک چیخوں سے گونج رہی تھی......

اس کے بعد گہرا سکوت چھا گیا۔



اگلے دن "گڑھی پریم" میں کہرام مچ گیا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی کہ ٹھاکر دیال داس کا دیہانت ہو گیا ہے۔

ٹھاکر کا بیٹا ارجن داس بھی وہاں پہنچ گیا تھا اور اپنے باپ کے متوقع انجام پر اسے ذرا قلق نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ شانتی اسے ساری حقیقت بلاکم و کاست بتا چکی تھی۔ ارجن نے بھیرو کو فی الفور حویلی چھوڑنے کا حکم دیا تھا اور رمیش لال کھرانہ کو اس کی فیملی سمیت ایک دو دنوں کے لئے اپنی حویلی میں بلا لیا تھا۔ ارجن داس کو رمیش لال اور درگا دیوی اپنی شانتی کے لئے قبول کر چکے تھے۔



چیخ

وہ موسمِ خزاں کی ایک پُراسرار اور اُداس شام تھی جب اشوک کھٹپال کی گاڑی کھپریل کی ڈھلواں چھت والے ایک چوبی ریسٹ ہاؤس کے گیٹ کے سامنے رکی۔

کار میں برابر والی سیٹ پر ان کی پتنی اوشا دیوی اور عقبی سیٹ پر نارائن داس بیٹھا تھا۔

یہ کیرانوالہ (بھارت) کے شہر کوچین کا ایک مضافاتی علاقہ تھا...... کار کے رکتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان اشوک کھٹپال نے دو تین بار ہارن بجایا...... اس کے بعد تینوں گاڑی سے اتر آئے۔

نارائن داس جو ایک خاص گھٹی ہوئی جسامت کا مالک تھا...... آس پاس متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا...... جبکہ اشوک اور اوشا...... گہری نظروں کے ساتھ اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے۔

اس ریسٹ ہاؤس کا رقبہ زیادہ بڑا نہ تھا، قدیم ہونے کے باوجود لگتا تھا اس کی چھوٹی موٹی مرمت ہوتی رہی ہے۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت زمین سے چھ فٹ اونچی تھی...... جسے دس بارہ لکڑی کے ستونوں کی مدد سے ایستادہ کیا گیا تھا...... سامنے کی طرف ایک چھوٹا سا کچا ناہموار راستہ تھا جو کبھی اس کا باغیچہ رہا ہوگا مگر اب پورا ہی اجڑ چکا تھا۔ درمیان میں ذرا بل کھاتی اکھڑی اکھڑی سی روش، ریسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے کی طرف جاتی تھی جس کے آگے سوکھی خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس کی چھت پر ایک چمنی بھی نظر آرہی تھی...... ایک خاص قسم کا گہرا سکوت طاری تھا، سناٹا اس قدر تھا کہ پتا کھڑکا اور دل دھڑکا والی کیفیت تھی...... ریسٹ ہاؤس کے دائیں بائیں اور سامنے کی طرف خاصا گھنا جنگل تھا۔

''پتہ نہیں یہ بے وقوف گوردن کدھر مر گیا...... ایسا کرتے ہیں اندر چلے چلتے ہیں۔ دروازہ مجھے کھلا ہوا نظر آرہا ہے۔'' دفعتہً نارائن داس کی جھلائی ہوئی آواز نے دونوں

میاں بیوی کی محویت کو توڑا۔

''اوہ...... کتنی پُرسکون اور پُرکشش جگہ ہے، کیسی معصوم معصوم سی اداسی چھائی ہوئی ہے ہر طرف......'' محویت ٹوٹتے ہی بے اختیار اوشا نے ایک گہری اور طویل سانس لے کر پُرکیف لہجے میں خود کلامی کی۔

وہ تیس پینتیس سالہ ایک سرو قامت اور بھرے بھرے خدوخال کی خاتون تھی۔ اس نے ہلکے عنابی رنگ کی ساڑھی بڑے سلیقے سے باندھ رکھی تھی، میدے جیسی صاف رنگت اور بیضوی سے دلکش چہرے پر سرخ رنگ کی بندیا نے اس کے حسین سراپے کو اور بھی پُرکشش بنا دیا تھا، البتہ دراز گھنی زلفوں کو اس نے پشت پر کھلا چھوڑ رکھا تھا، ایسے سنسان اور خاموش دور افتادہ علاقے اس کی کمزوری تھے...... اس کی فطرت ہی ایسی تھی...... اوشا یہاں آکر خوش تھی۔ لیکن اس کے پتی اشوک کھٹپال کا معاملہ اس سے مختلف تھا، وہ قطعی خوش نہ تھا۔ اس کے بشرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ مجبوراً یہاں آیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنی پتنی اوشا دیوی کا یہ خوش کن تبصرہ اچھا نہ لگا......

اشوک ایک دراز قامت اور چھریرے جسم کا شخص تھا...... وہ چالیس کے پیٹے میں تھا، کنپٹیوں کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک عجیب سی کرختگی نمایاں رہتی تھی۔ شاید یہ اس کے پروفیشن کا حصہ تھی۔ وہ کیرانوالہ کے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں انسپکٹر تھا مگر اس نے بڑے ہنگامی حالات میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ استعفیٰ دینے کی کیا وجہ تھی، یہ ایک الگ کہانی تھی جس کا ایک باب ان تینوں کی اس ویرانے میں موجودگی تھا۔

نارائن داس کے مشورے پر یہ دونوں میاں بیوی یہاں آئے تھے، جو اشوک کے ماتحت ہی نہیں بلکہ مشیر خاص بھی تھا۔ وہ کرائم ریکارڈ کا انچارج تھا۔ نارائن ایک چلتا پُرزہ تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس بھی اس کی دریافت تھا، تاہم نارائن جس مقصد کے تحت اپنے ''صاحب'' اور ان کی پتنی کو ادھر لایا تھا، اس سے اشوک کھٹپال نہ چاہتے ہوئے بھی متفق تھا اور بقول نارائن یہ جگہ موجودہ حالات میں دونوں میاں بیوی کے لئے مناسب ترین تھی۔ یہ ریسٹ ہاؤس کسی زمانے میں راجوں، مہاراجوں کے دور میں انگریز شکاریوں کے زیر استعمال رہتا تھا۔

جب خاصی دیر تک ریسٹ ہاؤس سے کوئی برآمد نہ ہوا تو ان تینوں نے آگے قدم بڑھا دیئے اور ناہموار سی اُکھڑی اُکھڑی مختصر سی بل کھاتی روش پر چلتے ہوئے وسطی دروازے کے سامنے رکے تو نارائن نے آگے بڑھ کر دروازے کو آہستگی کے ساتھ اندر کی طرف دھکیلا۔

ہلکی سی سوگوار اور کراہ آمیز چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا اور وہ تینوں اپنے اپنے دلوں میں مختلف تاثرات لئے اندر داخل ہوئے تو اچانک نارائن داس نے ایک طویل اور پُرسکون سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے...... گوردن نے اپنا کام نمٹا رکھا ہے......''

نارائن کا کہنا درست تھا، کیونکہ اندر وہ جس کمرے میں کھڑے تھے، وہ کافی صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں اگرچہ پرانی دری بچھی ہوئی تھی مگر صاف ستھری تھی۔ اسی طرح فرنیچر بھی مختصر اور پرانا ہونے کے باوجود درست حالت میں تھا۔ سارا فرنیچر قدیم طرز کا اور لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار میں آتش دان بھی نظر آ رہا تھا۔

وہ تینوں تھکے تھکے انداز میں کرسیوں پر گر سے گئے۔ ان تینوں میں صرف اوشا کے چہرے پر اشتیاق جھلک رہا تھا جبکہ اس کا شوہر اشوک بیزار اور خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔ نارائن داس کا بھی کم و بیش یہی حال تھا، تاہم اب وہ یہاں سے جلد از جلد رفوچکر ہونے کی فکر میں تھا۔

''آخر یہ گوردن کدھر مر گیا ہے......'' نارائن داس بولا۔

''ارے یار! تم گوردن کی رٹ کو چھوڑو اور باہر جا کر گاڑی سے ہمارا سامان اٹھا لاؤ۔'' بالآخر اشوک نے پہلی دفعہ لب کشائی کرتے ہوئے بیزاری سے کہا تو نارائن داس جلدی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''اگر تم یہاں آنے پر خوش نہیں ہو تو پھر کس لئے یہاں آئے تھے۔ ویسے مجھے تو یہاں بڑا مزہ آ رہا ہے۔ کتنا خاموش ماحول ہے یہاں کا اشوک......!'' اوشا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا تو اس کے چہرے پر کھنڈی سختی مزید گہری ہوگئی۔ وہ بولا۔

''نارائن داس میرا خیر خواہ ہے، اس نے کچھ سوچ کر ہی مجھے یہاں آنے کا مشورہ دیا ہوگا۔''

''ویسے اشوک! کتنے دن یہاں رہنا ہوگا؟'' اوشا نے پوچھا تو وہ اپنے کندھے اچکا کر مختصراً بولا۔

''پتہ نہیں......!''

''آخر ایسا کون سا سنجیدہ مسئلہ تمہارے ساتھ پیش آ گیا ہے؟ کیا تم مجھے بھی نہیں بتاؤ گے اشوک......؟'' اوشا کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''مسئلہ تو مجھے بھی خیر اتنا سنجیدہ محسوس نہیں ہوا تھا مگر پتہ نہیں کیوں......'' اشوک نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ نارائن داس ایک بڑے ہولڈال اور ایک سوٹ کیس اٹھائے اندر داخل ہوا، پھر وہ سارا سامان ایک کونے میں رکھتے ہوئے تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔

''میرا خیال ہے گوردن یہیں کہیں ہوگا۔ آپ کو بالکل چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' قدرے توقف کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''اس ریسٹ ہاؤس میں صرف دو ہی کمرے ہیں۔ آیئے وہ میں آپ کو دکھا دوں۔''

پھر وہ ان کے کچھ کہنے کا انتظار کئے بغیر ایک طرف بڑھ گیا۔

وہ اشوک کا لاڈلا اور سر چڑھا ماتحت تھا، وہ ڈیڑھ گھنٹے کی طویل مسافت اور نان سٹاپ سفر کی تھکان کا بھی خیال نہیں کر رہا تھا...... یا شاید اس کو فوراً ہی یہاں سے لوٹ جانا تھا۔

اشوک اور اوشا اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے پیچھے چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئے۔ یہ بھی صاف ستھرا بیڈروم کی طرز کا کمرہ تھا جہاں صرف ایک ہی تختے والا پلنگ پڑا تھا اور ایک بغیر ہتھی کی کرسی رکھی تھی۔ ایک دریچہ اور روشن دان بھی تھا، دوسرے کمرے کا ایک دروازہ اسی کمرے میں کھلتا تھا جو اوشا کے خیال میں غلط جگہ پر تھا۔

''سر......! اس علاقے کا موسم بدلتے دیر نہیں لگتی......'' دوبارہ ہال کمرے میں آ کر نارائن داس نے بالآخر اجازت لینے کے انداز میں اشوک سے قدرے مؤدبانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''یہ ساحلی علاقہ ہے۔ یہاں بارشیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ گوردن آپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھے گا۔ یہاں سے چند فرلانگ دور ایک قصبہ ہے، وہاں ضرورت کی ہر شے ملتی ہے۔ آپ بے فکر ہو کر ادھر رہیں، باقی حالات سے میں آپ کو آگاہ کرتا رہوں گا۔'' اس نے اپنی بات ختم کی تو اشوک تشکر آمیز انداز میں نارائن سے

بولا۔

''نارائن! تمہارا بہت بہت شکریہ......! باقی کے حالات سنبھالنا اب تمہارے ذمے ہے...... ویسے تم نے میری بیماری سے متعلق سارے کاغذات اور درخواستیں تو سنبھال لی ہیں نا......؟''

''جی سر! وہ میرے پاس محفوظ ہیں، شکر کریں کہ آپ کا استعفیٰ منظور ہو گیا ورنہ......''

''ارے...... ارے یہ تم کون سی بیماری کا تذکرہ کر رہے ہو، بھگوان نہ کرے تمہیں کوئی بیماری ہو۔'' دفعتہً اوشا نے پریشان ہو کر اشوک سے کہا تو وہ بیزاری سے بولا۔

''اوہو...... اوشا! خاموش رہو، تم نہیں سمجھو گی......'' پھر وہ نارائن سے بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اب......''

پھر جب نارائن داس پرنام کرنے کے بعد جانے لگا تو اچانک اوشا نے نارائن سے کہا۔ ''سنو...... سنو......! وشال تک ہمارا پیغام پہنچا دینا اور اس کی خیریت سے بھی ہمیں مطلع کرتے رہنا۔''

نارائن نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد باہر گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو لحہ بہ لحہ دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی...... اس کے بعد پھر وہی اعصاب پر ہولناکی طاری کرنے والا سناٹا چھا گیا۔ وہ دونوں اب کمرے میں تنہا رہ گئے تھے۔

اشوک کو اپنے دماغ پر بوجھ سا محسوس ہونے لگا تھا لہٰذا وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے بیڈ روم میں چلا گیا البتہ اوشا خود کو فریش محسوس کر رہی تھی۔ اس نے تھوڑا بہت ضرورت کا سامان نکال کر کمرے کے وسط میں بچھی خاصی چوڑی میز پر پھیلا دیا۔ اس کے بعد بستر وغیرہ نکال کر بیڈ روم میں آ گئی۔ اس نے پلنگ پر بستر لگا دیا اور اشوک کو کپڑے تبدیل کرنے کا کہہ کر خود باورچی خانے میں آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ کچن کافی گندا ہو گا اور اسے خود ہی اس کی صفائی کرنی پڑے گی۔ مگر یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ کچن بالکل صاف ستھرا تھا حتیٰ کہ سنک میں بھی ٹونٹی کھولنے سے پانی آ رہا تھا۔ گیس کا چولہا بھی درست حالت میں کام کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہاں کے نگراں گوردن نامی شخص نے ان کے آنے سے پہلے ہی ہر چیز ریڈی کر دی تھی...... مگر وہ خود کہاں تھا......؟

پہلی بار اوشا کے دل میں یہ تجسس بیدار ہوا۔

وہ چائے کا پانی چڑھانے کے بعد یونہی کچن سے باہر نکل آئی۔ معاً اسے آہٹ سی سنائی دی جیسے کوئی چلتے چلتے رکتا ہے تو فرش پر جوتے کی ہلکی سی رگڑ گونجتی ہے۔ اس نے ٹھٹھک کر اپنے اردگرد دیکھا...... مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ جانے کیوں وہ اس آواز کو اپنا واہمہ بھی قرار دینا نہیں چاہتی تھی۔ سناٹے کی گہرائی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسے میں اچانک کچن سے پانی اُبل کر گرنے کی شائیں شائیں سنائی دی۔ اوشا چونک کر کچن کی طرف پلٹی...... اس نے چولہا بند کر کے کیتلی کی ناب گھما دی تاکہ بھاپ نکلتی رہے۔ اس کے بعد وہ وہیں کھڑے کھڑے ایک بڑے سے مگ میں چائے بنانے لگی...... کچن کا دروازہ چرچراہٹ کی ہلکی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت کچن کا روشن دان زوردار کھٹکے سے وا ہو گیا اور سرد مرطوب ہوا کا جھونکا اندر آیا تو اوشا کے وجود نے بے اختیار جھرجھری سی لے لی...... اور وہ یہ اندازہ نہ لگا سکی کہ یہ کیفیت اس کی سردی کے باعث تھی یا خوف کے......!

پھر اچانک اسے کچن کے دروازے کا خیال آیا جو ذرا دیر پہلے خود بخود بند ہو گیا تھا۔ اسے بھی اس نے باہر اچانک چلنے والی تیز ہواؤں کا ہی شاخسانہ سمجھا اور ابھی اس نے چائے کا مگ تھامے کچن سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اسے کچن کے دروازے پر کسی کے قدموں کی واضح آہٹ سنائی دی...... اوشا فطرتاً ایک نڈر، تجسس پسند عورت تھی مگر اس وقت وہ ماحول کے زیراثر تھی، اس نے اسے ایک لمحے کو اندر سے کچھ کمزور سا بنا دیا تھا مگر پھر بھی اس نے بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یکدم کچن کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہال کمرے کا نصف سنسان منظر واضح تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ باہر ہواؤں کا شور لحہ بہ لحہ بڑھنے لگا تھا۔ اب باقاعدہ دور کہیں بجلی بھی کوندنے لگی تھی، بادلوں کی گھن گرج بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اوشا کو اچانک نارائن داس کی بات یاد آنے لگی۔ اس نے کہا تھا کہ ساحلی علاقے کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں موسم بدلتے دیر نہیں لگتی۔

اوشا چائے کا مگ تھامے اپنے اطراف گہری نظریں ڈالتی ہوئی ایک آرام کرسی کی طرف بڑھی اور وہاں بیٹھ کر وہ پُرخیال انداز میں چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔

جانے کیوں اس کی نگاہیں ریسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں، باہر اب باقاعدہ دھواں دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ اسی اثنا میں اوشا نے چائے کا مگ خالی کر دیا اور ابھی وہ کرسی سے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اچانک اسے دروازے کی طرف دیکھ کر یوں لگا جیسے کوئی باہر سے اسے کھولنے کے لئے زور لگا رہا ہو۔ ایک لمحے کو اوشا کا دل خوف سے لرز اٹھا۔

باہر بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور موسلا دھار بارش کا شور اور اندر لمحہ بہ لمحہ بڑھنے والا اندھیرا...... اوشا کے اعصاب پر حاوی ہونے لگے تھے۔ جانے وہ کون تھا جو باہر سے دروازہ کھولنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ اوشا کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا اور وہ اس کیفیت میں دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھنے لگی اور قریب پہنچ کر باآواز بلند بولی۔

''کون ہے......؟'' اس کے بولنے کی دیر تھی کہ اچانک دروازے نے لرزنا بند کر دیا...... مگر اوشا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اب بھی دروازے کے باہر موجود ہے۔ وہ گیا نہیں تھا، کیونکہ دروازے کے پٹ کے نیچے کی چوڑی درز سے باہر چمکنے والی آسمانی بجلی کے ساتھ کسی کے سائے کی بھی جھلک نظر آ رہی تھی۔

خوف کی ایک سرد لہر اوشا کو اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوئی۔ اس کے پورے وجود میں ہلکی سی کپکپی طاری تھی۔ پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے اپنے خوف پر قابو پا کر آگے بڑھ کر یکدم دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا...... سامنے نگاہ پڑتے ہی اس کی سانس سینے میں ہی اٹک کر رہ گئی...... سامنے ایک عجیب شخص کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یک ٹک اوشا کو تکے جا رہا تھا۔ وہ خاصا جسیم اور درمیانے قد کا مالک تھا، رنگت الٹے توے کی طرح سیاہ تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے ہولناک بات جس نے اوشا جیسی مضبوط اعصاب کی عورت کو بھی لرزا کر رکھ دیا تھا، وہ اس کی انتہائی زرد آنکھیں تھیں، پلکوں سے بے نیاز، کھلی کی کھلی......

''کک...... کک...... کون ہو تم......؟'' اوشا کے منہ سے اٹک اٹک کر نکلا۔

جواباً وہ میکانکی انداز میں بولا۔ ''میرا نام گوردن ہے، چوکیدار ہوں جی میں...... یہاں لالہ جی سے ملنے آیا تھا۔''

اوشا کو اس کی آواز عجیب اور کھرکھراتی سی محسوس ہوئی۔ اسے اس کی بے وقت آمد پر غصہ آنے لگا تھا۔

''اس وقت کیا کرنے آئے ہو تم؟...... ہمیں یہاں آئے چھ گھنٹے ہو چکے ہیں، کہاں مر گئے تھے تم......؟''

''میری پتنی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے ویسے ہی سپاٹ لہجے میں کہا۔ اب ذرا کہیں اوشا کا غصہ کم ہوا، تاہم وہ بدستور درشت لہجے میں بولی۔

''اچھا...... اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ اب۔ کل ضرور آنا۔'' بڑے کڑے دل کے ساتھ اوشا نے اسے اگلے روز آنے کو کہا تھا۔ حالانکہ ایسے خوفناک چوکیدار کی وہ دوبارہ صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ اسی دوران اوشا نے ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ گوردن کی عجیب پتھرائی ہوئی نظریں اس کے وجود کے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اوشا نے دروازہ بند کر دیا اور واپس اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

رات کے جانے کس پہر اوشا کی اچانک آنکھ کھلی...... باہر اب بارش بند ہو چکی تھی۔ اس کے دائیں طرف اشوک محو خواب تھا۔ اوشا کو اچانک ہلکی ہلکی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل بلاوجہ ہی زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ وہ چند ثانیے اسی طرح ہی دم بخود بستر پر پڑی رہی، ہر طرف گہری خاموشی کا راج تھا۔ اوشا کو اپنے تنفس کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی گہری نیند سے یوں اچانک کیسے جاگ اٹھی تھی۔ پھر اس کے دل میں جانے کیا آئی کہ وہ آہستگی سے بستر سے اٹھی، کمرے میں شمع دان روشن تھا، اس کی لو اوشا کو پھڑپھڑاتی محسوس ہوئی۔ اوشا کا دل جانے کیوں ایک غیر مرئی خوف میں مبتلا ہو رہا تھا، اس کے جی میں آیا کہ وہ اشوک کو جگا دے...... اس نے اس ناقابل بیان خوف سے چھٹکارہ پانے کی خاطر دوبارہ بستر پر لیٹنے کی بھی کوشش کی مگر نیند ندارد......

سناٹا...... ویرانی...... خوف...... وسوسے...... یہ بھی کسی عفریت سے کم نہ تھے۔ اوشا نے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی کوئی یکدم دروازہ کھول کر اندر آ جائے گا۔ ٹھیک اسی وقت ایک تیز چیخ کی آواز نے اوشا کے ٹھٹکے ہوئے دل کو بری طرح دھڑکا کر رکھ دیا۔ چیخ اتنی زوردار اور واضح تھی کہ اوشا اسے اپنے وہم پر

محمول کر ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ دوبارہ بستر سے اٹھی...... اس نے محسوس کیا کہ یہ چیخ ریسٹ ہاؤس کی عقبی طرف سے ابھری تھی...... اس کمرے کا ایک دریچہ مذکورہ سمت میں کھلتا تھا...... اوشا دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھی اور آہستگی سے پردے کو سرکا کر مرتعش ہاتھوں سے دونوں پٹ کھول دیئے...... ہلکی سی ٹھنڈ کا احساس اپنے چہرے پر ہوا اور اسے بے اختیار جھرجھری سی آ گئی۔ باہر ہر سُو دھند آلود تاریکی کا راج تھا، البتہ آسمان برسنے کے بعد قدرے صاف ہو چکا تھا۔ اخیر راتوں کا چاند آوارہ بدلیوں میں چھپ گیا تھا جبکہ ٹمٹماتے تاروں کی روشنی میں فضا ملگجی سی نظر آ رہی تھی۔ اوشا نے سامنے اس ملگجی سی اور مدھم روشنی میں اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں...... ریسٹ ہاؤس کا اس عقبی حصے کی طرف کا بھی علاقہ دور تک جنگل میں گھرا ہوا تھا...... بانس اور تاڑ کے درخت بے جان ہیولوں کی طرح ایستادہ نظر آ رہے تھے۔

اچانک اوشا چونکی...... ذرا دور اسے بانس اور تاڑ کے جنگل میں ایک قدیم طرز کی عمارت کا خاکہ نظر آیا...... وہ سانس روکے کبھی واضح اور کبھی غیر واضح ہوتے اس ہیولے کو تکتی رہی...... اس پرانی طرز کی حویلی کو دیکھ کر اوشا نے اندازہ لگایا کہ وہ چیخ اسی حویلی سے ابھری تھی، تب پھر اچانک دوسری بار چیخ کی آواز ابھری اور اوشا کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا...... چیخ بڑی کریہہ اور کرب انگیز تھی۔ اس چیخ میں ایک فریاد اور ناقابل بیان سی اذیت پنہاں تھی۔ اس کے بعد پھر تیسری بار چیخ ابھری، مگر اس بار نسبتاً آواز ذرا دھیمی تھی۔ پھر اچانک ہی اوشا کو ایسا لگا جیسے کوئی سسک سسک کر رو رہا ہو...... اس پُراسرار حویلی کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ ہر سُو خاموشی میں یہ آواز اور بھی صاف سنائی دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ اوشا کی خوف زدہ نظریں حویلی کی سال خوردہ عمارت پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں...... دل اسے کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چیخیں اب واضح طور پر کراہوں اور سسکیوں میں بدل چکی تھیں۔

تب اگلے ہی لمحے اوشا نے اپنا دل ذرا مضبوط کیا اور حواس بحال کئے اور ایک فیصلہ کرنے کے بعد کھڑکی بند کر کے واپس مڑی...... چند ثانئے اور چپ چاپ کھڑی رہی...... اس کے فطری تجسس نے سر ابھارنا شروع کر دیا...... اور اب ان چیخوں کا کھوج

لگانا چاہتی تھی، تب اس نے ایک گرم شال اوڑھی اور ٹارچ سنبھالے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے نکلی اور ریسٹ ہاؤس کا دروازہ کھول کر باہر تاریکی میں آ گئی۔

وہ ہر سُو گہرا سناٹا طاری تھا، ملگجی تاریکی اور خاموشی کا راج تھا...... اوشا کے دل میں عجیب عجیب وسوسے گھر کرنے لگے تھے، لیکن وہ اپنے دل میں پکا تہیہ کر کے نکلی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کی سنگی مگر اُکھڑی اُکھڑی روش پر کہیں کہیں برسات کا پانی جمع ہوا تھا...... اوشا نے ٹارچ دائیں ہاتھ میں پکڑی پھر شال کو اچھی طرح اپنے بدن پر لپیٹ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی ٹوٹے ہوئے گیٹ سے باہر آ گئی...... اس کے بعد وہ بائیں طرف گھوم گئی۔

اب اس نے اپنے چلنے کی رفتار تیز کر دی تھی۔ اب وہ ریسٹ ہاؤس کے عقب میں آ کر آگے بڑھنے لگی...... سامنے اسے پرانی حویلی کی عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔ اوشا کے اندر جانے کس طرح اتنی ہمت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اس قدر اندھیری رات میں اس پرانی حویلی کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی...... اسے صرف ایک تجسس تھا، ایک ہٹ تھی...... ان چیخوں کا سراغ لگانے کی...... وہ حیران تھی کہ آخر یہ چیخیں کس کی ہیں......

وہ جو کوئی بھی تھا، اس تاریک رات کے ویرانے میں کیوں آہ و فغاں کر رہا تھا...... وہ اس کا کھوج لگانا چاہتی تھی۔ دفعتہ اسے پھر کسی کے چیخنے اور باقاعدہ چلانے کی آوازیں آنے لگیں...... اس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ قدموں کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی...... ٹارچ والا ہاتھ بھی کپکپانے سا لگا تھا۔ اس بار چیخ کا آہنگ اسے صاف طور پر محسوس ہوا تھا۔ کوئی نسوانی ہی چیخ تھی مگر اس نسوانی چیخ کے بعد پے در پے چلانے اور رونے کی آوازوں میں ایک سے زائد افراد کی آوازوں کی آمیزش محسوس ہوئی تھی۔

اوشا کا دل ایک بار پھر خوف کے مارے لرزنے لگا...... ایک لمحے کو اس کے دل میں آیا کہ فوراً یہاں سے لوٹ جائے مگر اس نے ایسا نہیں کیا...... چلتے چلتے اگرچہ ایک لمحے کو اس کے قدموں کی رفتار دھیمی ضرور ہوئی تھی مگر وہ رکی نہیں تھی...... اس کی ٹھٹکی ہوئی پھٹی پھٹی نظریں ہنوز سامنے پرانی حویلی پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ پھر جب وہ ذرا قریب پہنچی تو ایک لمحے کو ٹھٹھک کر رک گئی اور ٹارچ کی روشنی اس طرف کر کے بغور تکنے لگی...... اسے اس پرانی حویلی کے پہلو میں ہی ایک چھوٹا سا گھر بھی دکھائی دیا تھا...... نہ

جانے کیوں اوشا کو ایسا لگا کہ چیخوں کی آوازیں حویلی سے نہیں بلکہ اس مکان سے آ رہی تھیں۔ وہ مکان چھوٹا تھا۔ بمشکل ایک دو کمروں کا...... جس کی چھت زیادہ بلند نہیں تھی...... اوشا کو حیرت ہوئی کہ اس ویرانے میں یہ مکان کیوں تھا...... کیا اس میں مکین تھے؟ یہ سوال اوشا کے دل میں اچانک ابھرا تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے اس نے آگے قدم بڑھائے، اب وہ مکان کے ٹاٹ جھولتے دروازے پر رک گئی تھی...... یہاں پہنچ کر دل کی عجیب کیفیت ہونے لگی تھی...... وہ خوف آمیز وسوسوں اور تجسس کی درمیانی کیفیت سے دوچار تھی۔

معاً اسے پھر کسی کے چیخنے اور رونے کی آوازیں آنے لگیں...... اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا کہ چیخ کی آواز پرانی حویلی کی بجائے اس کے پہلو میں بنے اس مکان سے ہی آ رہی تھی لیکن اوشا کو یوں لگا جیسے اس بار مکان کے اندر سے آنے والی چیخ جو اب تکلیف دہ آہوں اور سسکیوں میں بدل گئی تھی، وہ ان چیخوں سے قطعی مختلف تھی جو اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے ریسٹ ہاؤس کے کمرے سے سنی تھیں اور تب اس کا دل ایک اور انتہائی لرزہ خیز چیخ پر کانپ گیا۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ گرتے گرتے بچی تھی۔ کیونکہ یہ چیخ اب سامنے پرانی حویلی سے سنائی دی۔ یہی وہ اصل چیخ تھی جسے اوشا نے اپنے ریسٹ ہاؤس کے کمرے سے سنا تھا۔

پھر اس کا دل دھک سے رہ گیا...... اسے اس مکان کے اندر سے بھی بدستور کسی کے رونے اور سسکنے کی گھٹی گھٹی آوازیں آ رہی تھیں...... یہ کیا معمہ تھا...... بیک وقت دو جگہوں سے چیخنے اور رونے کی آوازوں نے اوشا کو سخت اعصابی کشیدگی میں مبتلا کر دیا تھا...... پراسرار حویلی پر اب سناٹا چھا گیا تھا...... اوشا نے پہلے مکان کا دروازہ کھٹکھٹانے کا فیصلہ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھی...... ابھی اس نے دستک دینے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک اندر سے اسے ایک غصیلی آواز سنائی دی۔

''کتیا کی بچی...... بکواس کرتی ہے، مچا شور...... اور مچا، میں نہیں گھبرانے والا......''

اس غصیلی غراہٹ کے ساتھ ہی پھر دوبارہ کسی عورت کے رونے کی آوازیں آنے لگیں...... اوشا اس مردانہ آواز پر بری طرح چونکی تھی کیونکہ یہ آواز اسے شناسا سا محسوس ہوئی تھی...... پہلے تو اسے ذرا ڈر لگا مگر پھر اسے اس شخص پر غصہ آنے لگا جو شاید اپنی

بیوی پر تشدد کر رہا تھا...... یہ وہی زرد آنکھوں والا چوکیدار تھا جس سے اوشا کی پُراسرار انداز میں ملاقات ہوئی تھی۔

بالآخر اوشا نے زور سے دروازہ دھڑ دھڑا ڈالا...... اندر یکدم خاموشی چھا گئی...... ذرا دیر بعد دروازہ کھلا اور چوکیدار گوردن کا چہرہ ابھرا...... اس کے چہرے پر غصہ نمایاں تھا، مگر اوشا کو سامنے دیکھ کر وہ یکدم بھیگی بلی بن گیا اور حیرت سے اوشا کا منہ تکنے لگا۔

''آ...... آپ...... یہاں کیسے...... مالکن......!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اوشا نے ایک ناگوار سی نگاہ اس پر ڈالی پھر اسے گوردن کی پشت کی طرف ایک غمزدہ عورت کا اشک بار چہرہ دکھائی دیا۔

''ہٹو پرے......!'' اوشا نے گوردن کو جھڑکا اور اندر قدم رکھ دیا...... وہ سمجھ گئی تھی کہ گوردن اپنی بیوی کے ساتھ مار پیٹ کر رہا تھا...... اوشا فطرتاً ایک نرم خو اور ہمدرد عورت تھی، اس نے آگے بڑھ کر گوردن کی بیوی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کی بکھری زلفوں کو بڑی محبت سے سنوارتے ہوئے ایک طرف حیران پریشان کھڑے گوردن کی طرف دیکھ کر غصیلے لہجے میں بولی۔ ''کیوں مار رہے تھے اس بے چاری کو......؟''

''جج...... جی...... وہ...... وہ......''

''شٹ اپ......! اگر دوبارہ اس پر ظلم کیا تو خیر نہیں تمہاری......'' اوشا نے درشت لہجے میں گوردن سے کہا۔ پھر اس کی بیوی کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی...... مینا......'' اس نے مختصر جواب دیا...... اس کے چہرے پر اوشا دیوی کے لئے تشکرانہ جذبات نمایاں تھے۔ تاہم اسے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی...... اس بے چاری کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یوں پہر رات میں کوئی عورت اس کی دادرسی کے لئے آ سکتی ہے۔

''مینا......! تم کل سے میرے پاس آنا ریسٹ ہاؤس میں، سمجھیں...... وہاں کام ہے مجھے تم سے، ٹھیک ہے؟'' اوشا نے مینا سے کہا اور مینا نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا...... اسی دوران اوشا کی نگاہیں ایک طرف خاموش کھڑے گوردن سے ٹکرائیں اور اگلے ہی لمحے اسے اپنے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں...... گوردن کی گہری زرد آنکھیں یک ٹک اوشا کی طرف جمی ہوئی تھیں اور اس کی سر سراتی

نظریں اوشا کو اپنے وجود کے پار بھی ہوتی محسوس ہو رہی تھیں...... اوشا کو ان نظروں میں سرد مہری کے ساتھ ساتھ ناگواری کی بھی جھلک نمایاں طور پر محسوس ہوئی تھی، تاہم پھر کچھ کہے بغیر باہر آ گئی۔

گوردن نے انتہائی زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ اوشا نے دانت بھینچ لئے...... پھر جب اس نے ریسٹ ہاؤس کی جانب واپس قدم بڑھانے چاہے تو اچانک نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے اس پرانی حویلی کے اندر جانے کا ارادہ کر لیا جو چند ہی قدم کے فاصلے پر اس کے سامنے تھی...... اوشا کو یقین تھا کہ پہلی ہولناک چیخ اس نے جو اپنے کمرے میں سنی تھی تو وہ اس حویلی سے آئی تھی۔ ویسے بھی جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اندر جائے۔

ٹارچ اس کے ہاتھ میں تھی، پھر وہ دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھی...... حویلی کہن سالی کا نمونہ پیش کر رہی تھی...... حویلی کے صدر دروازے کے دائیں بائیں بوسیدہ سے دو ستونوں کے ساتھ عجیب سے جانوروں کے چنگھاڑتے ہوئے چہروں کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں...... اوشا ۔ یوں لگا جیسے کوئی غیر مرئی شے اُسے اپنے ساتھ باندھ کر کشاں کشاں اس پرانی حویلی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے...... اوشا حویلی سے ابھرنے والی کریہہ چیخوں کا بھی سراغ لگانا چاہتی تھی بلکہ اس کے خیال کے مطابق اصل معمہ اس پرانی حویلی کے اندر سے ابھرنے والی چیخوں کا تھا...... گوردن کے گھر کی طرف تو اس کا دھیان محض اتفاقاً ہی چلا گیا تھا۔

اوشا اپنے دھڑکتے دل کی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے آہستہ آہستہ حویلی کے صدر دروازے کی شکستہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دروازے پر پہنچ کر رک گئی...... اس کے چہار اطراف میں گہری خاموشی کا راج تھا...... حویلی کے شکستہ در و دیوار سے کہنہ سالی عیاں تھی اور یہی حال بلند چوکھٹ والے اس دروازے کا تھا جس کے سامنے وہ کھڑی تھی......

اس نے کپکپاتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا...... دروازے کو ہلکا سا ابھی اس نے اندر دھکیلنے کے لئے ہاتھ ہی لگایا تھا کہ وہ ایک کراہ آمیز چرچراہٹ کے ساتھ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا...... اندر تاریکی کا راج تھا...... ٹھیک اسی وقت جب اوشا نے ایک قدم آگے بڑھایا، اندر کسی دور افتادہ گوشے سے کسی کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں سنائی

دیں...... اوشا اپنی جگہ پر گڑ کر رہ گئی...... اس نے اپنے حواس قابو کر رکھے تھے...... اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی روشنی کو اس نے اندر پھینکا۔

وہ تذبذب کا شکار تھی...... ایک بار اس کے دل میں آیا کہ وہ فوراً یہاں سے بھاگ جائے مگر وہ اپنی پُرتجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی۔

رونے اور سسکنے کی آوازوں میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہونے لگا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مرد اور عورت کسی کونے میں بیٹھے رو رہے ہوں...... بالآخر اوشا نے ہمت کی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اندر قدم رکھے...... ابھی اس نے ایک ہی قدم بڑھایا تھا کہ اندر سے ان گنت چمگادڑیں چیختی ہوئی ایک غول کی صورت میں باہر کو اُمڈیں۔

اوشا کے حلق سے چیخ نکل گئی اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر نیچے بیٹھ گئی...... جب چمگادڑوں کا یہ شور مچاتا سیلاب گزر گیا تو اوشا اٹھی...... اس کا دل اب بری طرح دھک دھک کرنے لگا تھا...... خوف نے بھی اب اس کے پورے وجود میں گھر کرنا شروع کر دیا تھا...... اس نے کپکپاتے ہاتھ میں ٹارچ کو اٹھایا جو چمگادڑوں کے حملے کی وجہ سے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی...... روشنی کا خاصا بڑا ہالہ حویلی کی شکستہ دیواروں، غلام گردشوں اور سیلن زدہ زینوں میں چکراتا ہوا معاً ایک ایسے گوشے پر جا پڑا جدھر چمگادڑوں کا ایک اور غول موجود تھا، مگر اوشا کی آنکھیں اس وقت دہشت کے مارے پھیل گئیں جب اس نے یہ دیکھا کہ دیواروں کے شکستہ رخنوں اور روزنوں کے ساتھ الٹی چپکی ہوئی بہاری چمگادڑوں کی گردنیں غائب تھیں...... سب سر بریدہ تھیں اور خون ان کی کٹی ہوئی گردنوں سے نلکے کی صورت میں بہہ رہا تھا...... بے اختیار اوشا کے حلق سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور اس نے بے تحاشا واپس ریسٹ ہاؤس کی طرف دوڑ لگا دی۔

اوشا ہانپتی کانپتی واپس ریسٹ ہاؤس پہنچی تو اس کا پورا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا...... اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے اوسان ذرا بحال ہوئے مگر خوف و دہشت کی کیفیت کم نہیں ہوئی تھی...... سر بریدہ چمگادڑوں کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر ہنوز اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا تھا...... اوشا اپنے بیڈ روم میں آئی...... اس نے محسوس کیا کہ پیاس کی شدت سے اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا...... اس نے دو گلاس پانی پیا۔

رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی...... اوشا جب بستر پر اشوک کے برابر لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی...... اس پرانی حویلی میں ابھرنے والی کسی مرد اور رونے کی آوازوں کے بارے میں اس کا ذہن الجھا ہوا تھا، وہ کون تھے......؟ آیا اندر روتے ہوئے مرد، عورت موجود بھی تھے یا یہ اس کا محض وہم تھا...... انہی خیالوں میں غلطاں نہ جانے کس وقت اوشا کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

اگلی صبح وہ دن چڑھے سوتی رہی تھی...... جاگی تو اسے بھوک لگ رہی تھی...... گوردن نے وعدے کے مطابق اپنی بیوی مینا کو آج صبح ہی ریسٹ ہاؤس بھیج دیا تھا...... کچن اس نے آ کر سنبھال لیا تھا درحقیقت اوشا نے دانستہ ایسا کیا تھا تاکہ مینا اپنے ظالم شوہر گوردن کے عتاب کا کم سے کم نشانہ بنے۔

بہرحال مینا یہاں کام کر کے خوش تھی۔

''مینا! ایک بات بتاؤ۔'' اوشا نے اس سے پوچھا۔

''جی مالکن......''

''گوردن کیا تمہیں روز اسی طرح مارتا ہے؟''

اوشا کی بات پر مینا نے مغموم انداز میں اپنا سر خاموشی سے جھکا لیا۔

''وہ کیوں مارتا ہے تمہیں...... حالانکہ تم اتنی بری بھی نہیں ہو...... شکل صورت بھی تمہاری اچھی ہے۔''

''مالکن......! گوردن پہلے ایسا نہیں تھا۔'' بالآخر مینا نے لب کشائی کی۔ ''وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا اور مجھے یقین ہے وہ اب بھی مجھے بہت چاہتا ہے مگر...... مگر......'' ایکا ایکی الفاظ مینا کے حلق میں اٹک سے گئے...... اور وہ خوف زدہ سی نظر آنے لگی۔

اوشا اس کی کیفیت پر ذرا چونکی اور بولی۔ ''ہاں...... ہاں...... کہو...... مگر کیا...... چپ کیوں ہو گئی تم......؟'' اوشا نے اسے حوصلہ دیا...... اسے شاید یہ اندازہ ہوا تھا کہ مینا اسے کچھ بتانے سے کترا رہی تھی۔

''یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی مالکن......! ورنہ...... ورنہ...... وہ...... گوردن مجھے بہت مارے گا۔'' اوشا کے پیہم اصرار پر مینا نے خوف زدہ سے لہجے میں کہا۔

صاف لگ رہا تھا کہ اسے اپنے شوہر کی طرف سے یہ بات بتانے کی ممانعت

تھی...... اوشا کو کرید تو لگ گئی تھی بلکہ مینا کے اس انداز نے اسے اور ٹھٹھکا دیا تھا، لہٰذا وہ مینا کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''دیکھو مینا! ڈرو مت...... اگر گوردن پہلے تم سے پیار کرتا تھا لیکن اب وہ تمہیں کسی وجہ سے مارتا ہے تو وہ وجہ مجھے بتاؤ تاکہ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکوں...... درحقیقت میں چاہتی ہوں کہ تمہیں اپنے پتی سے مار نہ کھانی پڑے...... میرا وعدہ ہے یہ بات میں کسی کو نہیں بتاؤں گی...... ہاں...... بولو اب......'' اوشا اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

اس کی نگاہیں اب اوشا کے متذبذب چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں...... مینا کے چہرے پر اب قدرے طمانیت کے آثار نمودار ہوئے تھے...... پھر وہ چند ثانئے کچھ سوچتے رہنے کے بعد عجیب سے گومگو لہجے میں بتانے لگی۔

''مالکن......! گوردن مجھ سے واقعی بہت محبت کرتا تھا، مگر جب سے وہ منحوس شہنائیاں......'' مینا کی آواز پھر حلق میں ہی اٹک گئی کیونکہ اسی لمحے ریسٹ ہاؤس کے باہر کار رکنے کی آواز سنائی دی اور اوشا کا دھیان کار کی طرف چلا گیا۔

''شاید نارائن آ گیا۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ درحقیقت اسے اور اشوک کو نارائن کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا...... وہ تازہ صورتحال کے بارے میں اس کے پتی کو آگاہ کرنے آیا تھا۔ چونکہ اوشا کے بار بار پوچھنے پر بھی اشوک نے اپنی پریشانی کے بارے میں اسے اب تک کچھ نہیں بتایا تھا، مگر اوشا کو تو اسی دن سے ہی کھد بد لگ گئی تھی، جب ایک دن ان کی کوچین والی رہائش گاہ میں نارائن بدحواسی کے عالم میں آیا تھا اور پھر نہ جانے اس کے اور اشوک کے درمیان کس قسم کی خفیہ گفتگو ہوئی تھی جسے اوشا نے سننے کی ناکام کوشش کی تھی مگر سن نہیں سکی تھی۔ اس کے اگلے دن ہی اشوک نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اوشا کے پوچھنے کے باوجود اشوک نے اس کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ پھر ایک دو روز بعد ہی ہنگامی طور پر یہ لوگ کوچین سے عارضی طور پر اس ویرانے میں آن بسے تھے...... اوشا نے پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ اس بار وہ نارائن اور اشوک کے درمیان ہونے والی مشکوک گفتگو کی سن گن لینے کی ضرور کوشش کرے گی۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق نارائن اس بار ضرور کوئی اہم اور فیصلہ کن خبر لے کر آئے گا۔ لہٰذا یہی وجہ تھی کہ جب گوردن چوکیدار کی بیوی مینا اپنے اور اپنے شوہر گوردن کے بیچ ناچاقی کی

پراسرار وجہ کے بارے میں بتانے لگی تھی کہ اس دوران باہر گاڑی کی آواز پر اوشا بری طرح چونکی اور بے اختیار باہر کو لپکی جبکہ مینا حیران و پریشان اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی...... اوشا کمرے سے نکل کر کھڑکی کی طرف آئی اور وہاں سے باہر جھانکا تو اس کا خیال درست ثابت ہوا کار سے نارائن اتر رہا تھا...... اوشا نے اس کے چہرے کا ذرا غور سے جائزہ لیا تو وہ اسے کچھ پریشان سا نظر آیا۔

اوشا کے دل میں جانے کیا آیا کہ وہ واپس جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی اور مینا کو باہر دروازہ کھولنے بھیج دیا...... دوسرے کمرے میں اشوک موجود تھا...... اوشا کسی مقصد کے تحت کمرے سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ اگلے ہی لمحے باہر دروازہ کھلنے اور اشوک کی باتیں کرنے کی آواز ابھری...... ذرا دیر بعد وہ دونوں ہال کمرے میں براجمان ہو گئے تھے۔

مینا کو شاید چائے وغیرہ بنانے کے لئے کچن کی طرف بھیج دیا گیا تھا، جبکہ اوشا کا ارادہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل کر اشوک اور نارائن کی باتیں سننے کا تھا...... ابھی وہ اس مقصد کے لئے کمرے سے باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری...... یکبارگی اوشا کا دل دھڑکا...... اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا...... اشوک سامنے کھڑا تھا...... چند ثانئے بعد وہ اوشا کو خاموش نظروں سے دیکھنے کے بعد بغیر بات کئے دوبارہ لوٹ گیا...... اوشا کو جانے کیوں ایسا لگا جیسے اشوک کمرے میں اس کی موجودگی کی تسلی کرنے آیا تھا...... اشوک کی اس حرکت سے اوشا کو مزید کرید لگ گئی اور پھر وہ تھوڑی دیر بعد آہستگی سے دروازہ کھول کر مختصر سے کوریڈور میں آ گئی۔

اس وقت دن کے بارہ بجے کا وقت تھا...... ہال کمرے سے اشوک اور نارائن کے دھیمے دھیمے لہجے میں باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں...... اوشا بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اس کھڑکی کے قریب آ گئی جو اندر ہال میں کھلتی تھی۔ یہاں سے باتوں کی آواز صاف طور پر اس کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھی...... اوشا نے ذرا کھڑکی سے سر ابھار کر دیکھا، سامنے کے صوفوں پر نارائن اور اشوک آپس میں دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

''سر......! معاملہ بہت ہی نازک ہوتا جا رہا ہے، گرکھ داس اور وادھول تلریجا......

کچھ زیادہ ہی گلے کو آنے لگے ہیں...... اب ان دونوں بوڑھے گدھوں نے آپ کا کھلے عام نام لینا شروع کر دیا ہے۔'' معاً اوشا کے کانوں سے نارائن داس کی پریشان کن گفتگو کے الفاظ ٹکرائے...... وہ اشوک سے مخاطب تھا۔ پھر اوشا کو اپنے پتی کی آواز سنائی دی۔ وہ نارائن داس سے کہہ رہا تھا۔

''ہوں......! اس کا مطلب ہے میں نے مستعفی ہو کر غلطی کی کیونکہ جب تک میرے بدن پر وردی تھی یہ دونوں بڈھے خاموش تھے۔'' پھر لمحہ بھر توقف کے بعد اشوک نے پہلو بدل کر نارائن سے پوچھا۔ ''نارائن! کہیں میں نے استعفی دے کر غلطی تو نہیں کی...... میرا مطلب ہے کہ کہیں مجھ پر شک نہ کیا جا رہا ہو!''

''آپ نے اپنی طبیعت کی خرابی کا جو عذر دیا تھا، اسی بنا پر آپ پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ البتہ ان دونوں بوڑھے گدھوں کا کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا......''

نارائن اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو اشوک بولا۔ ''ویسے نند لال اور کماری کی لاشوں کا کیا ہوا...... وہ پولیس کے ہاتھ لگیں یا نہیں......؟''

''یہی تو حیرانی ہے، بلکہ کم از کم ہمارے لئے خوشی کی بات ہے کہ وہ ابھی تک کسی کے بھی ہاتھ نہیں لگ سکی ہیں۔'' نارائن نے قدرے خوش ہو کر کہا۔

ادھر سن گن لیتی ہوئی اوشا ان دونوں کی گفتگو پر گم صم سی ہو گئی...... لاشوں کے تذکرے نے اس کا دماغ جھنجھنا ڈالا تھا اور وہ پریشان کن انداز میں سوچنے لگی کہ نہ جانے یہ لاشوں کا کیا معاملہ ہے۔

ٹھیک اسی وقت اوشا کو ایسے لگا جیسے کوئی اس کے عقب میں بالکل قریب کھڑا ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر گھما کر پیچھے دیکھا اور پھر جیسے سانس لینا بھول گئی...... بڑی مشکل سے اس نے اپنے حلق سے ابھرنے والی چیخ پر قابو پایا تھا...... وہ اب پھٹی پھٹی نظروں سے اس شخص کو تکے جا رہی تھی جو نہ جانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

وہ زرد اور پتھرائی ہوئی آنکھوں والا چوکیدار گوردن تھا جسے دیکھ کر اوشا کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

اسے اچانک اپنے عقب میں دیکھ کر اگرچہ اوشا کا دل ایک لمحے کو دھک سے رہ گیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اوشا کے دل میں خوف کی جگہ غصے نے لے لی اور گوردن ہنوز

بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پراسرار نظروں سے اوشا کے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا۔

''تم ایسے دیکھ رہے ہو مجھے...... جاؤ یہاں سے۔'' اوشا نے درشت لہجے میں اسے ڈانٹا تو گوردن کے مکروہ چہرے پر ایک غیر محسوس سی خوفناک مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ اوشا کو عجیب نظروں سے گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اوشا کے پورے وجود میں ابھی تک زرد آنکھوں والے گوردن کی خوفناک مسکراہٹ کھب کر رہ گئی تھی...... اوشا، گوردن سے اس قدر خوف زدہ ہو گئی کہ وہ زیادہ دیر اپنے پتی اشوک اور نارائن داس کے درمیان ہونے والی مشکوک گفتگو نہ سن سکی اور فوراً اپنے کمرے میں آ گئی...... اس کے دل و دماغ میں ابھی تک گوردن کا منحوس مسکراتا چہرہ گردش کر رہا تھا۔ پھر کافی دیر کے بعد جب نارائن واپس وہاں سے چلا گیا تو اوشا، اشوک پر چڑھ دوڑی۔

''تم آخر مجھے اپنی پریشانی کے بارے میں بتاتے کیوں نہیں...... آخر کو میں تمہاری پتنی ہوں...... تم اپنی پریشانی میرے ساتھ کیوں شیئر نہیں کرتے؟''

اشوک کے چہرے پر پریشانی نظر آ رہی تھی...... اس نے خود پر قابو پایا اور پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔

''دیکھو اوشا! درحقیقت میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا...... تم یہاں آرام سے رہو...... انجوائے کرو اور بس...... باقی کا دردِ سر میرے لئے رہنے دو۔''

اوشا نے بغور اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا، اسے لگا جیسے اشوک کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہے...... وہ اشوک کو جانتی تھی، وہ شروع سے ہی ایسا تھا۔ جو بھی پریشانی یا تکلیف ہوتی، کسی سے شیئر نہیں کرتا تھا، خود ہی اسے بھگتنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر اوشا کو اس بار اشوک کچھ زیادہ ہی مصیبت میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ وہ خود بے چین ہو گئی تھی لہٰذا بولی۔

''مگر اشوک! تم خود سوچو تمہیں پریشانی میں دیکھ کر میں کیسے آرام سے رہ سکتی ہوں...... کیا کوئی ایسی پریشانی ہے کہ تم مجھے بھی نہیں بتا سکتے؟'' اوشا کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

اشوک نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا...... اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دونوں میاں

بیوی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لہٰذا چند ثانیے کے بعد اشوک ایک کرسی پر گر سا گیا پھر بولا۔

''میرے خیال میں کچھ دشمنوں نے سازش تیار کی ہے...... وہ کسی کیس میں مجھے پھنسانے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن کیوں...... تمہیں ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اس طرح یوں میدان چھوڑ کر اس ویران جگہ آنے کا آخر کیا مقصد تھا؟'' اوشا نے کہا تو اچانک اشوک نے اوشا کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا...... اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ اسے اوشا کی بات بری لگی ہے مگر پھر فوراً ہی اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''اوشا......! وہ دشمن بہت طاقتور ہیں اور یہ سب میں نے نارائن کے مشورے سے ہی کیا ہے...... تم تو اسے جانتی ہی ہو کہ وہ میرا کتنا خیر خواہ ہے...... وہ میرا ماتحت ہی نہیں بلکہ ہمدرد دوست بھی ہے...... مصلحت اور حالات کا تقاضا ایسا ہی تھا کہ مجھے یہاں آنا پڑا، اس طرح نارائن کے خیال کے مطابق وہ کیرانوالہ میں میرا مناسب دفاع کر سکتا ہے۔'' اشوک نے اپنی بات مکمل کی مگر اوشا کے چہرے سے پھر بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک تذبذب کا شکار ہے، بالآخر بولی۔

''مگر میں نارائن کے خیال سے بالکل متفق نہیں ہوں کہ وہ اس طرح تمہارا دفاع کر سکتا ہے بلکہ تمہاری غیر موجودگی میں مسئلے کو طویل عرصے تک الجھاوے میں مبتلا کر سکتا ہے۔''

لمحے بھر توقف کے بعد اوشا نے اشوک کے چہرے کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

''ویسے تمہارے دشمنوں نے آخر ایسی کیا چال تمہارے خلاف چلی ہے، مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔''

اب کی بار اشوک خود پر قابو نہ پا سکا اور جھنجھلا کر قدرے درشت لہجے میں بولا۔

''اوشا! پلیز...... تم میرے معاملے میں دخل اندازی نہ کرو، اس طرح میری پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گا...... تم بس اپنے کام سے کام رکھو۔''

''لیکن اشوک...... ہمارا بیٹا وشال وہیں رہتا ہے...... وہاں تعلیم حاصل کر رہا ہے، بھگوان نہ کرے اگر تمہارے دشمنوں نے اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو؟''

"وہ ایسا نہیں کر سکتے...... وشال کی حفاظت کا بندوبست نارائن نے پہلے ہی کر رکھا ہے...... اس نے سادہ لباس میں پولیس کے آدمی نگرانی پر مامور کر دیئے ہیں اور ویسے بھی نارائن ہمیں وشال کی خیر خیریت کی اطلاع دیتا رہے گا یہاں آ کر۔" اشوک نے کہا۔

وشال ان کا اکلوتا جوان بیٹا تھا، وہ وہیں بورڈنگ میں رہتا تھا اور خاصا ہونہار لڑکا تھا لیکن بہرحال اوشا کے دل میں اب ایک بے نام سی بے چینی گھر کر گئی تھی...... اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس کا پتی اسے ذہنی پریشانی بتانے سے کیوں گریزاں ہے۔ کیا واقعی اسے اپنی پریشانی بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا؟ مگر اوشا نے سوچا اس طرح وہ مزید پریشانی میں مبتلا ہو سکتی ہے۔

اس وقت تو یہ بات آئی گئی ہو گئی لیکن رات کو جب یہ دونوں میاں بیوی اپنے بستر پر سونے کے لئے لیٹے تو اشوک نے اوشا کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"اوشا......! تم نے میرے اور نارائن کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی؟"

اس کی بات اور عجیب لہجے پر اوشا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا...... اشوک کے چہرے پر گہری متانت کھنڈی ہوئی تھی...... اوشا کو جھوٹ بولنے کی جرأت نہ ہو سکی مگر وہ یہ سوچے بنا نہ رہ سکی کہ آخر اشوک کو یہ بات کس نے بتائی...... کیا اس منحوس گوردن نے......؟"

"ہاں...... مگر......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اوشا......" اگلے ہی لمحے اشوک پھٹ پڑا اور اوشا یکدم سہم گئی۔ "تمہارے اس فضول قسم کے تجسس نے مجھے خاصا پریشان کر ڈالا ہے...... تم کیسی پتنی ہو اوشا! بجائے میری مصیبت کم کرنے کے تم اس میں اضافہ کرنا چاہتی ہو...... دیکھو اوشا! میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ فضول قسم کی ٹوہ بازی میں اپنا وقت اور میرا دماغ مت خراب کرو۔ تم سمجھتی کیوں نہیں، میں ایسے محکمے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے...... بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک پولیس آفیسر اسے اپنے گھر میں حتیٰ کہ اپنی پتنی اور بچوں سے بھی چھپانے پر مجبور ہوتا

ہے، سمجھیں تم......!" اشوک اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا...... جھنجھلاہٹ کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا...... ایسے میں اوشا کو بھی اپنے پتی پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ تو بیچاری خود اس کی پریشانی کم کرنا چاہتی تھی۔ تاہم وہ کچھ نہ بولی۔ البتہ اسے گوردن پر غصہ آنے لگا تھا جس نے اس کی چغلی کھائی تھی۔

اوشا کو اب گوردن سے انتہائی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

اشوک کروٹ بدل کر سو گیا تھا لیکن اوشا کی آنکھوں سے نیند ابھی کوسوں دور تھی۔ اس کا ذہن مختلف الجھن آمیز اور پریشان کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پرانی حویلی سے آنے والی پراسرار چیخیں پھر گوردن کی دکھیاری بیوی مینا کا کسی منحوس شہنائیوں کے بارے میں بتاتے ہوئے اچانک خاموش ہو جانا اور نارائن اور اشوک کے درمیان ہونے والی رازدارانہ گفتگو جس میں وہ بڈھوں گرمکھ داس اور وادھول تلر بیجا اور کسی نند لال اور کماری کی لاشوں کی گمشدگی کے بارے میں تشویش اور وہ اپنے پتی اشوک کی پراسرار پریشانی کی وجہ سے حد درجہ خائف تھی۔ بہر رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ اوشا نے سونے کی بہت کوشش کی تھی مگر اب تو اس کے اندر پہلے سے زیادہ کھدبد شروع ہو چکی تھی...... اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس کا پتی اشوک اسے اپنی پریشانی کے بارے میں آگاہ کیوں نہیں کرنا چاہتا...... ایسا کیا راز ہے جو وہ اس کے سامنے بھی آشکارا نہیں کرنا چاہتا۔ نیز اس کے وہ دشمن کون تھے جن سے وہ اس قدر خائف تھا کہ اس ویرانے میں آن بسا تھا...... آخر وہ دشمن اس کے پتی کے خلاف ایسی کون سی سازش تیار کر رہے تھے کہ یہ ان کے خوف سے نہ صرف اپنی اچھی خاصی ملازمت تک سے مستعفی ہونے پر مجبور ہو گیا تھا بلکہ عارضی طور پر سہی اپنا شہر اور گھر بار بھی چھوڑ دیا تھا اور پھر نارائن داس...... وہ کیا کر رہا تھا...... کیا وہ واقعی اشوک کا خیر خواہ تھا...... اب جبکہ اشوک اس کا آفیسر نہیں رہا تھا پھر اسے یہ سارا دردسر مول لینے کی کیا ضرورت تھی...... کوئی پراسرار چکر تھا جس کی بڑی رازداری سے پردہ داری کی جا رہی تھی۔ اوشا جتنا سوچتی، اتنا ہی اس کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس سارے چکر میں اوشا کو سب سے زیادہ پراسرار اور مشکوک شخصیت چوکیدار گوردن کی محسوس ہو رہی تھی...... گوردن کا نام ذہن میں آتے ہی جانے کیوں اوشا کے اندر تلخی سی پھیل جاتی

تھی۔

اچانک اوشا ایک آواز پر ٹھٹکی...... یہ آواز بالکل مدھم سی تھی جیسے دور کہیں شادیانے اور نفیریاں بج رہی ہوں...... جیسے کوئی بارات آ رہی ہو...... اوشا کو حیرانی ہوئی، بھلا اس ویرانے میں یہ شہنائیاں کیسی تھیں؟ یہ آواز کھڑکی کی طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی...... اوشا آہستگی سے اٹھی اور کھڑکی کے قریب آ کر اس نے ایک پٹ کھولا تو سامنے دیکھ کر وہ بری طرح چونکی...... سامنے تاڑ اور بانس کے درختوں میں گھری ہوئی وہ پرانی حویلی اس وقت بقعۂ نور بنی ہوئی تھی...... اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... اس پرانی حویلی کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ رنگین قمقموں کی روشنیاں چہار سُو پھیلی ہوئی تھیں اور مہمان لوگوں کے علاوہ باراتیوں نے زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے...... نفیریاں اور شادیانے بھی بج رہے تھے...... اوشا کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا...... وہ حیرت سے سوچنے لگی کہ اس ویرانے اور پرانی حویلی میں بھلا کس کی شادی ہو رہی تھی...... یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔

شادیانوں کی آوازیں اب کافی واضح ہو گئی تھیں...... اوشا نے جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کیا تو آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی ریسٹ ہاؤس کے باہر آئی اور حویلی کی طرف چل پڑی...... حویلی کی طرف سے آنے والی آوازیں کافی دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ آسمان صاف اور تاروں بھرا تھا...... ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی...... اوشا تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی حویلی کے قریب آئی اور باراتیوں کو حیرت بھری نظروں سے تکنے لگی...... لوگوں کے چہروں سے خوشیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں...... ان میں مردوں کے علاوہ جوان عورتیں اور لڑکیاں، بچے غرض ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ پھر اچانک ایک بڑی سی سجی سنوری کار وہاں آ کر رکی اور اس میں سے دولہا، دلہن اترے۔ لوگوں کے جھرمٹ میں آہستہ آہستہ چلتے حویلی کے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگے...... اوشا ابھی تک ورطۂ حیرت میں مبتلا تھی...... اس کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا...... اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ بھلا اس ویرانے میں یہ اتنے سارے لوگ کدھر سے آن جمع ہوئے تھے اور وہ بھی اس سالخوردہ اور پرانی حویلی میں...... یہ کون دولہا دلہن تھے جن کی یہاں شادی ہو رہی تھی۔

اوشا نے ایک بنی سنوری عورت سے پوچھا۔ ''یہ...... یہ کس کی شادی ہو رہی ہے؟''

اس عورت نے عجیب سی خاموش نظروں سے پہلے اوشا کا سر تا پا جائزہ لیا پھر عجیب سرسراتے لہجے میں صرف اتنا بولی۔ ''یہ کماری اور نند لال کی شادی ہو رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ عورت اندر حویلی میں چلی گئی اور اوشا اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گئی...... ''کماری اور نند لال......'' یہ دونوں نام تو اس نے اشوک اور نارائن کی زبانی سنے تھے۔ مگر وہ تو ان کی لاشوں کا ذکر کر رہے تھے تو پھر یہ دولہا، دلہن...... کماری اور نند لال کون تھے؟ اوشا نے جھرجھری لے کر سوچا۔ اسے یوں لگا ایک بے نام سا خوف اسے جکڑنے لگا تھا...... اس کا وہاں کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا۔ اس نے قریب ہی واقع چوکیدار گوردن کے گھر کی طرف دیکھا جس کے دروازے پر ٹاٹ پڑا ہوا تھا...... اوشا کے دل میں آئی کہ وہ حویلی کے اندر جائے مگر پھر جانے کیوں وہ کچھ سوچ کر واپس پلٹ آئی...... وہ واپس تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ریسٹ ہاؤس میں آئی اور اپنے کمرے میں آ کر اپنے شوہر اشوک کو جگانے لگی۔

''اشوک...... اشوک......! اٹھو...... جلدی کرو......''

اس کے جھنجھوڑنے پر اشوک نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔

''کیا ہے بھئی...... کیا ہوا...... سونے دو......'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر نیم خوابیدہ لہجے میں بولا۔

''ارے بھئی اٹھو...... بارات آئی ہے...... وہاں دیکھو حویلی میں کسی کی شادی ہو رہی ہے۔'' اوشا نے ہانپتی ہوئی آواز میں اسے بتایا۔

''تمہارا دماغ خراب ہے...... اس ویرانے میں کس کی شادی ہو رہی ہے یہاں......؟'' اشوک نے بیزاری سے کہا اور پھر سونے کے لئے کروٹ بدلنے لگا مگر اوشا نے پھر اسے جھنجھوڑا تو بادل نخواستہ وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھا...... اوشا اسے کھڑکی کے پاس لے کر آئی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر بولی۔

''وہ دیکھو...... اس حویلی میں...... شش...... شا......'' آواز اس کے حلق میں ہی اٹک گئی کیونکہ باہر پُر ہیبت تاریکی اور سناٹا طاری تھا...... آسمان پر ٹکے چاند کی طلسمی روشنی میں ٹنڈ منڈ درختوں میں گھری ہوئی وہ پرانی حویلی ویران تھی...... آس پاس کوئی ذی

نفس تک موجود نہ تھا...... ابھی تھوڑی دیر پہلے والی اس گہما گہمی کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا...... وہ پرانی حویلی جس پر رنگین بلبوں کے قمقمے روشن تھے، اب وہ سارے ہی مفقود ہو چکے تھے...... حویلی پر ویسے ہی ازلی ویرانی اور ایک سیلن زدہ سی پراسرار خاموشی مسلط تھی...... اچانک کایا کلپ پر اوشا کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ایسے میں اشوک بیزاری اور غصے میں بولا۔

''میں نے کہا نا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے...... تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہو گا...... بلاوجہ میری نیند خراب کر ڈالی۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا دوبارہ بستر پر آ کر گہری نیند میں ڈوب گیا اور اوشا ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔

''یہ کیا......! کہاں گئے یہ سب لوگ...... اور وہ باراتی...... یہ ڈھول تاشے بجانے والے کہاں گئے یہ سب لوگ......'' وہ عجیب انداز میں زیر لب بڑبڑائی...... اس کے دل و دماغ میں وحشت سی گھر آنے لگی...... وہ اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے پرانی حویلی کی جانب تکنے جا رہی تھی مگر وہاں کچھ نہ تھا...... کیا یہ سب میرا وہم تھا...... وہ سوچنے لگی مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا...... ابھی تھوڑی دیر پہلے تو خود اس نے یہاں ایک شادی کی تقریب ہوتے دیکھی تھی، نہ صرف یہ بلکہ وہ خود چل کر وہاں تک گئی تھی اور ایک مہمان عورت سے بات بھی کی تھی۔

''نن...... نہیں...... یہ میرا وہم نہیں ہو سکتا۔ یہ وہم نہیں ہو سکتا۔'' وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑائی...... اسے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس ہونے لگے...... اس کے دماغ کی رگوں میں جھنجھناہٹ سی محسوس ہونے لگی...... حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا...... ایک عجیب سا غصہ آنے لگا تھا اسے۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی...... کمرے کی دم بخود فضا اسے ہذیانی قہقہوں کی طرح محسوس ہونے لگی...... اس نے اپنی شل ہوتی کیفیت پر قابو پایا اور قریب تپائی پر رکھے کانچ کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی غٹا غٹ چڑھا گئی...... اسے اپنے پاؤں من من کے محسوس ہو رہے تھے...... وہ ابھی تک عجیب اور حواس زدہ کیفیت سے باہر نہیں نکلی تھی...... اس کا دل و دماغ بار بار وہم کی نفی کر رہے تھے...... انہیں یہ تسلیم ہی نہیں تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جس بارات اور سجی سنوری حویلی کو اوشا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ پل بھر میں

کس طرح ایک پُر ہیبت ویرانی میں تبدیل ہو گئی...... ابھی وہ اپنا سر تھامے حیران و پریشان سی کھڑی تھی کہ اچانک کھلی ہوئی کھڑکی سے دوبارہ شادیانے اور شہنائیاں بجنے کی آواز سنائی دینے لگی...... وہ بری طرح چونکی اور وحشت زدہ ہو کر کھڑکی کی طرف آ کر جب اس نے سامنے دیکھا تو سانس جیسے اس کے سینے میں اٹک کر رہ گئی...... وہی بارات کا روشن روشن منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا...... یہ دیکھ کر اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا...... ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو یہاں کچھ نہ تھا پھر یہ اچانک سب...... کہیں میں واقعی کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی......؟ اس نے حیرت اور پریشانی سے سوچا پھر اپنی کلائی پر دانت سے کاٹا تو تکلیف کا احساس ہوا، یعنی وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔ تو پھر یہ کیسا اسرار تھا......؟ یہ سب کیا تھا؟ اس نے پھر بغور سامنے دیکھا...... بارات کا شور اب دھیما پڑ گیا تھا...... لوگ باگ اب واپس لوٹ رہے تھے...... بتیاں، روشنیاں بھی بجھ گئی تھیں۔ شاید چند لوگ اندر حویلی میں دولہا، دلہن کے ساتھ موجود تھے...... حویلی پر اب سناٹا چھا گیا تھا...... اوشا کچھ سوچ کر پھر باہر تاریکی میں آ گئی اور تیز تیز قدموں کے ساتھ پرانی حویلی کے قریب آ کر چند ثانیے رک گئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

پرانی حویلی پر سناٹا طاری تھا۔ تاہم اب بھی ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ یہاں ایک شادی کی پُر تعیش و پُر وقار تقریب انجام پا چکی ہے...... اوشا نے ذرا دیر رک کر دھڑکتے دل کے ساتھ آگے قدم بڑھا دیئے اور پھر کپکپاتے قدموں سے حویلی کے بڑے سالخوردہ دروازے پر آ کر رکی اور لرزتے ہاتھ سے دروازے کو اندر دھکیلا...... اندر ایک بڑا کمرہ تھا جو روشن تھا مگر وہاں کوئی موجود نہ تھا...... اوشا نے اندر قدم رکھ دیا...... ایک طرف کمرے میں کسی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ اوشا کا دل خوف سے جکڑا ہوا تھا مگر ایک انجانی قوت تھی یا پھر فطری تجسس کی کارستانی کہ اس کے قدم مذکورہ کمرے کی طرف بڑھنے لگے...... کمرے کا دروازہ مکمل بند نہ تھا جس کی جھری سے روشنی اڈ رہی تھی...... وہ اپنی لرزہ براندام کیفیت پر قابو پاتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی...... اندر سے ہنوز ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں...... ان آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اندر ایک عورت اور مرد موجود ہیں۔

''کیا یہ دولہا، دلہن تھے......؟'' اس کے ذہن میں ابھرا۔ پھر دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا رکی اور پکارا۔

''کوئی ہے......؟''

اوشا کے پکارنے کی دیر تھی کہ اچانک اندر گہری خاموشی چھا گئی...... ایسی خاموشی جیسے اندر کوئی بھی موجود نہ ہو۔ پھر ٹھیک اسی لمحے حویلی میں اندھیرا چھا گیا جیسے اچانک بجلی چلی گئی ہو۔ اوشا کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ مگر اس نے دیکھا کہ اندر کمرے میں روشنی برقرار تھی۔ ایک لمحے کو اوشا کا پھر دل چاہا کہ وہ اس منحوس جگہ سے فرار ہو جائے مگر اس کے قدم جیسے کسی نے پکڑ لئے تھے...... کوئی انجانی اور غیر مرئی طاقت اسے کمرے کے اندر جانے پر اکسا رہی تھی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اوشا کپکپاتے ہاتھوں سے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ایک مسہری پڑی تھی جسے بڑے خوبصورت انداز میں سجایا گیا تھا...... اوشا نے دیکھا مسہری پر پھولوں اور رنگیں جھالروں کی سیج بنی ہوئی تھی۔ یقیناً دولہا، دلہن اندر موجود تھے...... ایسے میں اوشا کو یہ بات تہذیب کے خلاف لگی اور وہ فوراً واپس جانے کے لئے مڑی۔ ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ ایک نسوانی آواز نے اسے عقب سے پکارا۔

''واپس کیوں جا رہی ہو...... لوٹ آؤ...... دیکھو ہماری شادی......''

اوشا کے قدم اپنی جگہ جم کر رہ گئے اور اس نے کھڑے کھڑے آہستگی سے گردن موڑ کر عقب میں مسہری کی جانب دیکھا تو جیسے پتھر کی بن گئی...... وہ منظر اتنا ہی خوفناک اور ڈراؤنا تھا کہ اوشا کے حلق سے چیخ بھی نہیں نکل پائی۔

سامنے مسہری پر زرق برق لباس میں دولہا، دلہن بیٹھے تھے مگر ان دونوں کے سر شانوں سے غائب تھے۔ پھر ان دونوں دولہا، دلہن نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے اوشا کو اپنی طرف بلایا تب نجانے کس طرح یا بالکل غیر ارادی طور پر اوشا کے حلق میں پھنسی ہوئی چیخ بلند ہوئی اور وہ اندھا دھند دوڑتی ہوئی کمرے اور پھر حویلی سے باہر آ گئی...... باہر پہنچ کر جب اس نے صدر دروازے کی چند سیڑھیاں اترنے کے لئے پاؤں رکھا تو دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

چاند کی ٹھنڈی روشنی میں اس نے اپنے پیروں کے نیچے دو کٹے ہوئے سر پڑے

دیکھے...... ایک سر عورت کا تھا...... کسی دلہن کی طرح بنا سنورا اور دوسرا سر ایک مرد کا...... جن کی پلک جھپکاتی آنکھیں اوشا کو اپنے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھیں......

اوشا نے مارے دہشت کے ایک چیخ ماری اور چھلانگ لگا دی...... دونوں کٹے ہوئے سروں کو پھلانگنے کی صورت میں وہ زمین پر آ پڑی مگر پھر اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور گرتے ہی اٹھ کر اوشا نے دیوانہ وار چیختے چلاتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی طرف دوڑ لگا دی...... اپنے عقب میں اسے رونے اور چیخنے چلانے کی ڈراؤنی اور پھر شیطانی قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں مگر اوشا کے قدم نہیں رکے، وہ کسی نہ کسی طرح گرتی پڑتی ریسٹ ہاؤس پہنچی اور کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی...... اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا...... اس نے پانی پیا اور ایک نگاہ بیڈ پر گہری نیند سوتے ہوئے اپنے شوہر اشوک پر ڈالی...... اس کے بعد کھڑکی کے قریب آ کر سامنے پرانی حویلی کی طرف خوف زدہ نظروں سے تکنے لگی...... وہاں ویرانی اور تاریک سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اوشا نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور دوبارہ بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس کے دل و دماغ پر ہنوز خوف چھایا ہوا تھا...... گزرتے لمحات کے ڈراؤنے مناظر اس کے چشم تصور میں گردش کر رہے تھے...... وہ سر بریدہ دولہا، دلہن کون تھے......؟ اور پرانی حویلی کے دروازے کی چوکھٹ پر پڑے کٹے ہوئے دو سر...... جو یقیناً ان دونوں دولہا، دلہن کے ہی ہو سکتے تھے...... اوشا کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ بریدہ سروں کے نقوش جو ایک مرد اور عورت کے تھے، اوشا کے ذہن میں جیسے ثبت ہو کر رہ گئے تھے...... ان کی یک ٹک اور گاہے بگاہے پلکیں جھپکاتی آنکھیں اوشا کو ابھی تک نہیں بھولی تھیں۔ اوشا سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ کیا یہ سب اس کا وہم تھا......؟ ہرگز نہیں...... دوسرے ہی لمحے اوشا نے اپنے خیال کی خود ہی تردید کی۔ یہ سب مبنی بر حقیقت تھا...... خود اس نے اپنی آنکھوں سے یہ سب ڈراؤنا منظر دیکھا تھا...... وہ یہ سب نہیں جھٹلا پا رہی تھی...... کوئی اس کی بات پر یقین بھی کیسے کرتا...... باہر اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا...... اس نے اپنے شوہر اشوک کو یہ بات بتائی تو حسب توقع اس نے اسے اوشا کے ڈراؤنے خواب پر ہی محمول کیا...... حقیقت یہ تھی کہ اشوک خود اپنی کسی پراسرار پریشانی میں گھرا ہوا تھا تاہم اتنا ضرور چونکا تھا جب اوشا نے اسے یہ بتایا کہ

دولہا، دلہن کا نام نند لال اور کماری تھا تو ایک لمحے کے لئے اس نے چونک کر اوشا کی طرف گہری نظروں سے دیکھا...... اوشا نے محسوس کیا کہ اشوک کو حیرت سے زیادہ تشویشناک جھٹکا لگا تھا مگر پھر اشوک زیادہ دیر اوشا سے بات نہ کر سکا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہ اسی روز شام کا ذکر تھا...... اشوک اندر اپنے کمرے میں تھا...... دروازے پر کسی نے دستک دی...... اوشا اٹھ کر دروازے تک آئی...... آج مینا نہیں آئی تھی، اسی لئے اوشا نے خود ہی دروازہ کھولا...... سامنے گوردن کھڑا اوشا کی طرف برماتی نظروں سے دیکھ رہا تھا...... اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھال تھا...... باہر خزاں آلود جھکڑ چل رہے تھے...... تھال پر نقشین ریشمی رومال ڈھانپا ہوا تھا۔

''کیا ہے یہ......؟'' اوشا نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

''جی مالکن......! یہ کچھ کشمیری سیب اور مالٹے توڑے تھے، سوچا آپ کے لئے لے آؤں۔''

اوشا نے نہ چاہتے ہوئے وہ تھال لے لیا پھر سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''مینا آج نہیں آئی ہے...... طبیعت تو ٹھیک تھی اس کی......؟''

''جی وہ ذرا بیمار تھی۔ سر میں درد تھا اس کے۔'' اس نے زرد آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کل رات یہاں پرانی حویلی میں کس کی شادی ہو رہی تھی......؟'' لمحہ بھر بعد اوشا نے پوچھا تو ایک لمحے کو گوردن کے چہرے پر شکنوں کا جال پھیلتا گیا پھر اس نے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو...... بھلا اس ویرانے میں اور وہ بھی اس پرانی آسیب زدہ حویلی میں بھلا کون بے وقوف شادی کرے گا؟''

''ہوں......'' اوشا کے لبوں سے گونگو انداز میں نکلا پھر وہ اندر آ گئی...... تھال اس کے ہاتھوں میں تھا جو خاصا وزنی معلوم ہو رہا تھا...... اچانک نجانے کس طرح تھال کے اوپر ڈھکا ریشمی رومال پھسل کر نیچے گر پڑا...... اوشا کی جو تھال پر نظر پڑی تو خوف دہشت سے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی...... تھال پر نند لال اور کماری یعنی دولہا، دلہن

کے سر رکھے ہوئے تھے...... تھال اوشا کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر چکا تھا اور دونوں خون بہاتے کٹے ہوئے سر فٹ بال کی طرح دور تک لڑھکتے چلے گئے تھے...... اوشا ہذیانی انداز میں چیختی چلاتی ہوئی کمرے کی طرف دوڑتی گئی۔ اندر سے اس وقت اشوک اس کی چیخ سن کر بدحواس ہو کر نکل رہا تھا...... اوشا اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

''اشش...... اشوک...... وہ...... وہ......'' اوشا کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی...... وہ انگلی سے ایک طرف فرش میں اشارہ کر رہی تھی۔

''کیا ہوا اوشا......! کون ہے، یہاں تو کوئی بھی نہیں۔'' اشوک نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔ اوشا کا پورا وجود لرزیدہ پتہ بنا ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے گردن موڑ کر خوف زدہ نظروں سے سامنے دیکھا تو دنگ رہ گئی، فرش پر تھال الٹا دھرا تھا اور جابجا بڑے بڑے سرخ سیب اور مالٹے بکھرے ہوئے تھے۔

''کیا ہے یہاں...... کچھ بھی تو نہیں...... تم نے کیا دیکھا تھا؟'' اشوک نے اس سے پوچھا تو اوشا نے اسے ساری بات بتائی کہ تھال میں دو کٹے ہوئے سر رکھے تھے۔ اشوک نے اپنا سر پکڑ لیا...... وہ اب اوشا کی دماغی حالت پر شبہ کرنے لگا تھا۔

اسی روز نارائن آیا...... وہ خلافِ معمول بہت شاداں و فرحاں تھا...... اس بار اوشا بھی ان دونوں کے درمیان موجود تھی...... نارائن نے مسرور ہو کر اشوک کو ایک خوشخبری سناتے ہوئے بتایا۔

''اشوک صاحب! بدھائی ہو...... دشمنوں کا منہ کالا ہو گیا ہے...... وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے ہیں۔''

اس کی بات پر اشوک بھی کھل اٹھا۔ ''اچھا......! کیا ہوا......؟ بتاؤ تو ذرا۔''

''نند لال اور کماری کے قتل کا معاملہ داخلِ دفتر کر دیا گیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تمہاری حکمت عملی کامیاب رہی۔'' اشوک نے توصیفی لہجے میں کہا تو نارائن فخر سے بولا۔

''جی ہاں...... یہ تو اچھا ہوا کہ آپ نے میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے کوئی جوابی کارروائی نہ کی اور خاموشی سے یہاں سکونت اختیار کر لی ورنہ حالات بہت نازک تھے...... آپ کے منظر عام پر ہونے یا کسی بھی جوابی کارروائی کرنے سے حالات الجھ

سکتے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے اب ہمیں واپس لوٹ چلنا چاہئے۔" اشوک نے کسی قدر خوش ہو کر کہا تو نارائن فوراً بولا۔

"نہیں سر......! ابھی معاملہ پوری طرح ٹھنڈا پڑنے دیں...... آپ کو یہاں تو کوئی تکلیف نہیں ہے ناں......؟"

پھر اشوک کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا، وہ نارائن سے بولا۔ "یار......! میں نے تمہیں اپنی اسٹڈی سے وہ نیلی ڈائری لانے کو کہا تھا، وہ کہاں ہے......؟" اس کی بات سن کر نارائن کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا...... اس نے ایک اضطراری سی نظر پہلے اوشا پر ڈالی پھر اشوک کی طرف دیکھتے ہوئے خاصی الجھن آمیز پریشانی سے بولا۔

"میں آپ کی رہائش گاہ پر گیا تھا اور آپ کے کمرے سے وہ ڈائری ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر وہ میرے ہاتھ نہ لگ سکی۔"

"کک...... کیا......؟" پریشانی کے باعث اشوک کا منہ کھل گیا۔ اوشا نے بغور اپنے شوہر کی طرف دیکھا تو وہ اسے بدحواس سا نظر آنے لگا تھا...... ادھر اشوک نے نہایت پریشان کن لہجے میں نارائن سے کہا۔ "نارائن...... یہ اچھا نہیں ہوا...... تم جانتے ہو کہ وہ ڈائری میرے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہے...... اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ گئی تو......" وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رک گیا اور دزدیدہ نظروں سے قریب کھڑی اپنی پتنی کی طرف دیکھا...... اوشا نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ اشوک کو وہاں اس کی موجودگی سخت گراں گزری تھی...... پھر وہ اوشا کو جیسے گھورتے ہوئے بولا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو...... دفع ہو جاؤ یہاں سے...... جاؤ اپنے کمرے میں......"

اوشا کو اشوک کا لہجہ سخت گراں گزرا تھا مگر وہ ضبط کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی مگر پھر بھی جاتے جاتے اس نے دیوار سے کان لگا دیئے تھے پھر اس نے اشوک کو نارائن سے کہتے سنا۔

"نارائن...... تمہیں ہر صورت میں ڈائری تلاش کرنی تھی...... تم نہیں جانتے...... تم نہیں جانتے کہ......"

"میں نے سر اسے بہت تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔" اشوک جب دانستہ اپنا جملہ

مکمل نہ کر سکا تو نارائن نے بلا تامل جیسے اپنی گلو خلاصی کرنی چاہی تھی۔ بہرطور پھر اوشا وہاں ایک لمحے بھی نہ ٹھہری اور واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس نیلی ڈائری پر اوشا کا ذہن کھٹک گیا تھا، وہ الجھ کر سوچنے لگی کہ آخر اس ڈائری میں ایسا کیا تھا جس کی گمشدگی پر اشوک اس قدر پریشان اور حواس باختہ ہو گیا تھا۔ اوشا نے ذہن پر ذرا زور دیا تو اسے یاد آیا کہ وہ اکثر اپنے شوہر کو ایک خاص ضخیم ڈائری لکھتے ہوئے دیکھا کرتی تھی جس کے بارے میں اشوک نے صرف اسی قدر اسے بتایا تھا کہ وہ اس میں چھوٹے موٹے جرائم کی تفاصیل لکھا کرتا ہے جنہیں کامیابی سے حل کر چکا ہوتا ہے۔

حسب معمول اوشا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ باہر خزاں آلود سناٹے دار جھکڑ چل رہے تھے...... ہر سُو دم بخود کر دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی...... دلوں پر ہولناکی طاری کر دینے والے اس ماحول کی اب اوشا عادی سی ہو گئی تھی...... اس کا دل و دماغ اب تک پیش آمدہ حالات پر وحشت زدہ اور پریشان ہو رہا تھا...... دفعتہً باہر پرانی حویلی کی طرف سے وہی منحوس چیخ بلند ہوئی...... چیخ کی آواز پر اوشا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا...... وہ اپنی لرزتی کانپتی حالت پر قابو پاتی ہوئی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھڑکی کی طرف آئی اور کپکپاتے ہاتھوں سے کھڑکی کھول دی...... باہر سے فراٹے دار ہوا کا یخ بستہ جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا اور اوشا کو بے اختیار جھرجھری سی آ گئی...... سامنے غبار آلود فضا میں اسے پرانی حویلی کا خاکہ نظر آیا...... وہ یونہی دم سادھے پرانی حویلی کی طرف تکتی رہ گئی۔ باہر اطراف میں مدہم اور نرم نرم سی خواب ناک چاندنی پھیلی ہوئی تھی...... بانس اور تاڑ کے ٹنڈ منڈ درختوں میں گھری پرانی حویلی پر سوگواریت طاری تھی...... اوپر آسمان پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے...... ایسے میں اچانک اوشا کی نظر پرانی حویلی کے صدر دروازے پر پڑی اور وہ بری طرح ٹھٹکی۔

اس نے دیکھا کہ حویلی کا دیوہیکل دروازہ آہستگی کے ساتھ کھلا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اوشا کا دل خوف کے مارے دھک سے رہ گیا...... کوئی دروازے سے باہر نکل رہا تھا...... وہ دو افراد کا ہیولا تھا...... زرق برق لباس میں ملفوف وہ دولہا، دلہن کی طرح معلوم ہو رہے تھے مگر اوشا نے جب بغور ان کی طرف دیکھا تو اس کی گھگھی بندھ

گئی...... ان دونوں دولہا، دلہن کے شانوں سے سر غائب تھے مگر وہ آہستہ آہستہ یوں بڑھے چلے آ رہے تھے جیسے سب کچھ دیکھ رہے ہوں...... وہ دونوں سیدھے کھڑکی کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے...... دور کہیں مدھم مدھم سی شہنائیاں بجنے کی بھی گونج سنائی دے رہی تھی...... وہ انتہائی دل دہلا دینے والا منظر تھا...... اوشا کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ پھر نجانے اس میں کیسے یکدم ہمت پیدا ہوئی کہ اس نے جلدی سے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیئے اور گہرے گہرے سانس لینے لگی...... اس کا دل سینے میں بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے سینے کا پنجر توڑ کر باہر اُمڈ پڑے گا...... کان سائیں سائیں کر رہے تھے...... چہرے پر ٹھنڈ کے باوجود پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں...... نجانے کیوں اوشا کو اب ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے آج اس کا آخری وقت آ گیا ہو۔

''ٹھک...... ٹھک...... ٹھک......'' اچانک باہر سے کھڑکی پر کسی نے دستک دی......

اوشا کا پورا وجود اب بری طرح لرزنے لگا تھا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی کہ وہ سامنے مسہری پر بے سدھ سوئے ہوئے اپنے شوہر اشوک کو پکار کر جگاتی...... مگر اوشا نے کھڑکی نہیں کھولی اور پیٹھ کے بل بند کھڑکی کے ساتھ چپکی کھڑی رہی...... تب پھر اچانک اس کے وجود کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور بے اختیار اوشا کے حلق سے ہذیانی چیخ برآمد ہوئی...... کسی نے باہر سے کھڑکی کو اندر کی طرف دھکیل کر کھولا تھا اور جس کے زور پر اوشا چند قدم آگے لڑکھڑا گئی تھی...... اوشا نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے...... وہ دونوں سر بریدہ دولہا، دلہن کھڑکی کے قریب موجود تھے۔ پھر لباس سے جو دلہن محسوس ہو رہی تھی، اس نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑکی کے اندر کوئی شے اچھال دی...... اس کے فوراً بعد وہ دونوں سر بریدہ وجود غائب ہو چکے تھے...... باہر اب ہر سُو خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔

اوشا پہلے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شے کو دیکھنے لگی جسے سر بریدہ دلہن نے اندر اچھالا تھا...... اس نے دیکھا ایک نیلے رنگ کی ڈائری تھی۔ اوشا کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ''نیلی ڈائری......!'' اس کے ذہن میں سوال اچانک ابھرا...... کیا یہ وہی ڈائری تو نہیں جسے اشوک تلاش کر رہا تھا......؟ اس کے دل میں اب خوف کی جگہ تجسس نے لے لی۔ اس نے ایک نظر اپنے گہری نیند میں ڈوبے شوہر کی طرف دیکھا پھر جلدی سے آگے

بڑھ کر اس نے کھڑکی بند کی اور ڈائری اٹھا لی۔ پھر بیڈ روم سے نکل کر وہ ہال کمرے میں آ گئی...... یہاں ایک بلب روشن کر کے آرام کرسی پر براجمان ہو گئی۔ ڈائری کو وہ اب اچھی طرح پہچان چکی تھی...... وہ اشوک ہی کی ڈائری تھی...... اوشا نے خود اس پر اشوک کو لکھتے دیکھا تھا اور جس کی گمشدگی سے وہ پریشان تھا۔ اوشا نے کپکپاتے ہاتھوں سے ڈائری کھولی تو ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر نیچے آن گری...... اوشا نے قدرے چونک کر وہ اٹھائی۔ یہ ایک مرد عورت کی شادی کی تصویر تھی۔ مگر تصویر کو دیکھ کر اوشا کو ایک جھٹکا لگا۔ ایک نئے نویلے جوڑے کی صورت اسے آشنا لگی...... دونوں کے چہروں پر مسرتوں بھری مسکراہٹ تھی...... اوشا کے ذہن میں وہ بریدہ سر گھوم گئے جن کے چہروں کے نقوش اوشا کو ابھی تک نہیں بھولے تھے...... اس کا مطلب تھا یہ اسی بدنصیب جوڑے نند لال اور کماری کی تصویر تھی......؟ اوشا کا ذہن معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی جستجو کر رہا تھا...... اچانک اس نے دیکھا تصویر میں اس ہنستے مسکراتے نئے نویلے جوڑے کے سر شانوں سے غائب ہو گئے...... اوشا کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی اور تصویر ڈائری سمیت اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی مگر پھر دوسرے ہی لمحے جانے کہاں سے اوشا کے اندر حوصلہ پیدا ہوا اور اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے تصویر اور ڈائری اٹھا لی...... تصویر اب واپس اپنی اصل حالت میں آ چکی تھی لیکن ایک اور چونکا دینے والا منظر سامنے تھا...... ان کے چہرے اداس اور مغموم سے نظر آنے لگے تھے۔

اوشا نے اس طرف سے اپنی توجہ ہٹاتے ہوئے ڈائری ایک طرف موڑی اور اسے جلدی جلدی کھول کر پڑھنے لگی...... اس میں اشوک کے حل کیے گئے کیسوں کی تفاصیل درج تھیں۔ یہ قتل کے وہ کیس تھے جو اشوک نے خود حل کیے تھے اور مجرموں کو بھی کیفر کردار تک پہنچایا تھا...... صفحات پلٹتے پلٹتے اچانک ایک صفحے پر اس کی نظر جم سی گئی...... ایک صفحے پر بڑی سی سرخی یوں تھی۔

''نند لال، کماری مرڈر کیس۔''

اوشا پھٹی پھٹی آنکھوں سے پڑھنے لگی...... وہ تحریر اسے اپنے شوہر کا فخر نامہ نہیں بلکہ اعتراف نامہ محسوس ہو رہی تھی، لکھا تھا۔

''اب تک میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جو بھی کیس حل کیے، وہ زیادہ تر قتل

کے ہی تھے مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن اپنے ہاتھوں قتل ہونے والے افراد کی روداد بھی مجھے ہی لکھنی پڑے گی...... اسے میری عجیب جبلت پر ہی محمول کرنا چاہئے کہ میں سیٹھ گرمکھ داس کی بیٹی کماری سے پریم کرتا تھا مگر افسوس یہ پریم یکطرفہ تھا...... کماری مجھ سے سخت نفرت کرتی تھی۔ میری طبیعت بھی ضدی اور خود سر تھی...... جب اس نے وادھومل کے جواں سال بیٹے نند لال کے سامنے میری ایک دن بھری تقریب میں بے عزتی کر ڈالی تو میں نے ان دونوں کو مزہ چکھانے کا فیصلہ کر لیا...... ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ پھر جب وہ ہنی مون کے لئے ایک پُر فضا اور قدرے ویران علاقے میں گئے تو میں نے بڑی صفائی کے ساتھ دونوں کو قتل کر کے ان دونوں کے سر کاٹ کر دھڑ سے الگ کر دیئے تاکہ کسی کو لاش کی شناخت نہ ہو سکے۔''

اوشا نے ابھی یہاں تک ہی پڑھا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اچانک اندھیرا چھانے لگا...... پورا ہال کمرہ اسے گھومتا دکھائی دینے لگا...... اس کی سانسوں کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز ہوتی چلی گئی...... حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا...... ڈائری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ پھر اچانک اسے اپنے عقب سے ایک سرسراتی آواز سنائی دی۔

''ہوں......! تو یہ ڈائری تمہارے پاس تھی؟''

اوشا نے چونک کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ سامنے اشوک کھڑا اس کی طرف سرد نظروں سے گھور رہا تھا...... اپنے شوہر کو سامنے دیکھ کر اوشا اچانک اٹھ کھڑی ہوئی...... غم وغصہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

''تت...... تم...... تم قاتل ہو...... تم نے...... تم نے نند لال اور کماری کا قتل کر ڈالا۔'' وہ غم و غصے کی شدت سے بمشکل اپنے شوہر سے بولی تو اشوک نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا...... اس کی آنکھوں سے نفرت اور غیظ و غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور وہ سفاک لہجے میں بولا۔

''اب مجھے تمہیں بھی ختم کرنا پڑے گا اوشا......!''

اوشا کی آنکھوں میں یکدم دہشت عود کر آئی اور وہ اپنا گلا چھڑا کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف لپکی...... اشوک کو شاید اوشا کی اچانک مزاحمت کی توقع نہ تھی...... وہ کسی درندے کی طرح اس کے عقب میں دوڑا مگر اوشا ہذیانی انداز میں چلاتی ہوئی

دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپکی اور دیوانہ وار اس کے قدم پرانی حویلی کی طرف بڑھ گئے۔ اشوک بھی موت کا ہرکارہ بنا اس کے پیچھے دوڑا چلا آ رہا تھا۔

اوشا گرتی پڑتی حویلی کے دروازے سے اندر داخل ہوئی اور اس نے پلٹ کر جان بچانے کی خاطر دروازہ بند کرنا چاہا مگر اشوک کسی زخمی درندے کی مانند دروازہ دھکیلتا ہوا اندر آ گیا اور اس نے اوشا کو تھپڑ مار کر فرش پر گرا دیا...... اوشا کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی۔ اشوک اب اس کے اوپر سوار ہو کر اس کا گلا دبانے لگا۔

''اشش...... اشوک...... مجھے مت مارو...... میں تمہاری پتنی ہوں۔'' اوشا خوف و دہشت کے باعث گھگھیائی...... آواز اب اس کے حلق میں دب گئی تھی...... اس کا دم گھٹنے لگا تھا مگر اشوک اسے قتل کرنے پر پوری طرح کمر بستہ تھا...... بیوی کی داد فریاد کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا، تب پھر اچانک جانے کدھر سے دو سر بریدہ انسان وہاں نمودار ہوئے...... یہ دونوں مرد اور عورت تھے جنہوں نے ہاتھوں میں اپنے اپنے سر تھام رکھے تھے...... وہ نند لال اور کماری تھے۔

ان دونوں سر کٹے نند لال اور کماری نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بریدہ سر فٹ بال کی طرح اشوک پر اچھال دیئے...... اشوک کی گرفت اب اوشا پر ڈھیلی پڑ چکی تھی...... وہ دونوں کٹے ہوئے سر اشوک کے چہرے سے ٹکرائے اور وہ ایک دلدوز چیخ مار کر پیچھے کی طرف گر گیا۔ تب نند لال اور کماری کے سر کٹے دھڑ اشوک کی طرف لپکے...... اب ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چھرے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اشوک کو فرش پر لٹا دیا تھا۔ اشوک کو ان سر کٹوں کی گرفت آہنی شکنجے کی طرح محسوس ہوئی۔

''ہمیں پہچانو...... اے مورکھ......! تو نے ہی ہمارا سر کاٹا تھا ناں...... اب تیرا سر بھی تیرے دھڑ سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔'' حویلی کے اس تیرہ و تار کمرے میں سر کٹوں کی سفاک آواز گونجی۔ ادھر اوشا بھی کچھ ہوش میں آ چکی تھی۔ پھر اس نے ایک روح فرسا منظر دیکھا...... ان دونوں سر کٹوں نے اشوک کو ذبح کر کے اس کا سر دھڑ سے جدا کر دیا...... حویلی اشوک کی خرخراتی چیخوں سے گونج رہی تھی...... اس کا سر کٹا دھڑ ماہئی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا...... سارے فرش پر خون ہی خون پھیل گیا تھا...... اوشا اس دہشت ناک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی تھی۔

کچھ روز بعد کوچین کے ایک شمشان گھاٹ پر اشوک کی چتا کو آگ لگائی جا رہی تھی اور آس پاس افسردہ سے کھڑے دیگر لوگوں میں اوشا سفید ساڑھی باندھے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کا بیٹا وشال بھی غمگین کھڑا اپنے پتا کی جلتی چتا کو غمزدہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔



قبرستان

سسکتی ہوئی آسیبی رات کا سناٹا، شکستہ و نیم پختہ قبروں پر کڑیالے ناگ کی طرح سرسرا رہا تھا۔ جا بجا پھیلے ٹنڈ منڈ پیڑوں کی شاخوں سے ہوائیں ٹکراتیں تو یوں لگتا جیسے پورا قبرستان ہولے ہولے سانس لے رہا ہو...... ایک ناقابل بیان سی نحوست ان پیڑوں پر طاری تھی۔

یہ بھارت کے شہر احمد آباد کا مضافاتی علاقہ تھا۔ یہ پراسرار اور دہشت ناک واقعہ اس وقت کا ہے جب سمندر پار سے بدیشی سامراج ابھی تاجروں کا بھیس بھر کر برصغیر پر قابض نہیں ہوئے تھے...... ان دنوں احمد آباد سے بڑودہ تک ممبا دیوی کے پراسرار پجاریوں کی بہتات تھی۔ چکروتا اور ہردوار کے نیم پہاڑی گھنے جنگلات میں لوگ اپنے چہروں پر بھبھوت مل کر ماتھے پر سیندور کا نقشہ کھینچے...... کئی کئی مہینے جاپ الاپ میں مصروف رہتے تھے۔

قبرستان کے آس پاس مسلم آبادی بھی تھی۔ قبرستان سے شمال کی طرف کافی آگے شمشان گھاٹ تھا۔ قبرستان کے تین اطراف میں گھنا جنگل اور چوتھی سمت تمباکو اور کپاس کے کھیت تھے۔

قبرستان کے بالکل وسط میں ایک جھونپڑی کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لالٹین کی یرقان زدہ روشنی ان دونوں افراد کے لرزیدہ سائے جھونپڑی کی شکستہ دیوار پر متحرک کیے ہوئے تھی۔ ان میں ایک بوڑھا رحیمو اور دوسرا اس کا جوان بیٹا رمو تھا۔ وہ بوسیدہ فرش پر بیٹھے، ایک بڑے سے تھیلے کے اندر انسانی ہڈیوں کے پنجر ڈال رہے تھے۔ پھر بوڑھے رحیمو نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک انسانی کھوپڑی تھیلے کے اندر ڈالی اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر جب تک اس نے اپنے کان میں اٹکی ہوئی بیڑی نکال کر سلگائی تب تک اس کا بیٹا رمو بھی اپنا ''کام'' ختم کر کے تھیلے کے

سرے کو سُتلی کی مدد سے بند کر چکا تھا۔ جھونپڑے کے اندر ایک ناقابل برداشت بُو پھیلی ہوئی تھی۔ مگر یہ دونوں گورکن باپ بیٹے اس بدبُو سے بے نیاز تھے۔

بوڑھے رحیمو نے نصف بیڑی پینے کے بعد رمو کی طرف بڑھائی اور کانپتے ہوئے بولا۔ ''اس بار تو صرف ایک تھیلا بھر سکا ہے۔ اب اس موٹے گورکھے کی جھاڑ تُو ہی سننا......''

رمو نے جواباً بیڑی کا کثیف دھواں فضا میں اُگلا اور بولا۔ ''تو ہم کیا کریں بابو......؟ جتنی ہڈیاں جمع ہوسکیں ہم نے کر دیں۔ اب ہم اپنی ہڈیاں تو اسے تھیلے میں بھر کر دینے سے رہے۔''

بیٹے کی بات سن کر بوڑھے رحیمو کو غصہ آ گیا اور بولا۔ ''تجھے پھاگن رلیاں منانے سے فرصت ملے تو ہڈیاں جمع ہوسکیں ناں...... سارا دن تو تُو ممبا دیوی کے مندر کے چکر لگاتا رہتا ہے۔ بھلا تیرا ہندوؤں کے مندر میں کیا کام؟''

باپ کی بات سن کر رمو جیسے چٹخارا بھرتے ہوئے بولا۔ ''ارے بابو...... میں تو وہاں گونگلو اور اچار کھانے جاتا ہوں۔ سچ بابو...... بڑے مزے کے ہوتے ہیں...... میرے تو منہ میں پانی بھر آیا۔''

''بس...... بس...... پتہ ہے مجھے تُو وہاں کس واسطے جاتا ہے...... سارا دن وودوا ناریوں کو دیکھتا ہے وہاں جا کر'' رحیمو نے ہاتھ نچا کر کہا تو رمو جھینپ کر کھی کھی کرنے لگا۔

پھر ٹھیک اسی لمحے جھونپڑی کے باہر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور ٹاٹ کے جھولتے پردے کا نچلا سرا ذرا سرکا اور ایک موٹے جنگلی بلے جیسے جانور کا خوفناک چہرہ نمودار ہوا...... کوئی اور ہوتا تو اس کریہہ صورت جانور کو دیکھ کر خوف سے سمٹ جاتا مگر رمو نے اسے دیکھتے ہی بڑے معنی خیز انداز میں اپنی باچھیں پھیلا دیں اور پچکار کر اس بد ہیئت جانور کو اندر بلا لیا۔ وہ بھی شاید اس انداز سے مانوس تھا لہٰذا فوراً ہی اندر آ گیا۔

یہ لگ بھگ ساڑھے چار فٹ لمبا بجو تھا جو اب رمو کی گود میں اپنا سر رگڑتے ہوئے وسط میں رکھے انسانی ہڈیوں سے بھرے تھیلے کو بھوکی نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ رمو بڑے پیار سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں ہے اس تھیلے میں...... اس کا سارا گوشت تو تُو پہلے ہی نوچ کر چٹ کر چکا ہے۔''

اس کی بات شاید بجو نے سمجھ لی تھی۔ اب وہ جس پراسرار انداز میں وارد ہوا تھا...... اسی طرح ایک انگڑائی لیتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی رحیمو پہلی بار توصیفی لہجے میں اپنے بیٹے سے بولا۔

''ساری جندگی (زندگی) میں تُو نے ایک یہی ڈھنگ کا کام کیا ہے رے...... کہ اس مُردہ خور کو سدھار لیا ہے۔''

''ہاں بابو......! ورنہ جس قسم کا کام ہم کرتے ہیں اس کے بغیر تو بڑی مشکل ہو جاتی ہمیں......'' رمو نے باپ کی تائید کی۔

''مگر اس کی ایک بات خراب ہے۔'' رحیمو بولا۔ ''جب یہ زیادہ بھوکا ہوتا ہے تو کمبخت قبر سے مُردہ نکال کر گوشت کے ساتھ اس کی ہڈیاں بھی چبا ڈالتا ہے۔'' رمو نے باپ کی بات پر کوئی تبصرہ نہ کیا پھر تھوڑی دیر گزری تھی کہ باہر انہیں کسی کے مخصوص انداز میں کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اس آواز پر دونوں ہی ٹھٹھکے تھے۔

''آ گیا وہ موٹا گورکھا......'' رحیمو کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر اس نے بیٹھے بیٹھے بلند آواز میں اسے پکارا۔ ''آ جاؤ لالہ جی...... اپنا مال لے جاؤ اندر آ کر۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ معاً ٹاٹ کا پردہ ہٹا اور ایک موٹا سا توندیل شخص اندر داخل ہوا جس نے خاکی رنگ کی ڈھیلی ڈھالی پتلون پہن رکھی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی ناک پر رومال رکھ لیا تھا۔ شاید اندر پھیلی ہوئی ناگوار بُو نے اس کے دماغ کی رگیں جلا ڈالی تھیں۔ وہ خاصا عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن اس کی نظر تھیلے پر پڑی تو وہ بولا۔

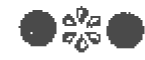
''یہ کیا......؟ صرف ایک......!''

''ہاں لالہ جی......! آج تو ایک ہی لے جاؤ۔ اگلی بار دو، تین دے دیں گے۔'' اس بار رمو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر جب اس نے زمین سے وہ ہڈیوں بھرا تھیلا اٹھا کر اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالتے ہوئے رمو کی طرف بڑھائے تو وہ خاصے شکایتی لہجے میں دونوں باپ بیٹوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"پچھلی بار تم نے مجھے بہت ہی پرانا مال دیا تھا۔ بالکل خستہ ہڈیاں تھیں...... نکالتے نکالتے ہی بھربھرا کر ٹوٹ گئی تھیں۔"

اس کی بات سن کر رحیمو جیسے جان چھڑاتے ہوئے اس سے بولا۔ "لالہ جی......! پھکر نہ کرو...... اس بار مال تازہ ہے۔ اس لئے یہ شکایت نہ ہووے گی۔"

تھوڑی دیر بعد گورکھا ناگواری سے اپنا سر جھٹکتا ہوا جھونپڑی سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی دونوں باپ بیٹوں نے بھی سونے کی ٹھانی اور وہیں میلی سی بوسیدہ دری بچھا کر لیٹ گئے۔



بوڑھے رحیمو کا یہ جدی پشتی پیشہ تھا۔ قبریں کھودنا...... لیکن پچھلے کچھ عرصے سے اس نے اپنے اس پیشے کو داغدار کر ڈالا تھا۔ کچھ اس لئے بھی کہ اب اس کام میں اس کی گزر بسر نہیں ہو پاتی تھی۔ اس کی بیوی ایک طویل مرض سے لڑتی لڑتی بالآخر زندگی ہار بیٹھی تھی۔ اس کے علاج معالجے کے لئے رحیمو کے پاس پیسے نہ تھے۔ رمو بھی اس وقت ناسمجھ تھا۔ جب رحیمو کو خود اپنی بیوی کی قبر کھودنا پڑی تو اس کے ہاتھ زندگی میں پہلی بار قبر کھودتے وقت کپکپا رہے تھے...... لیکن جیسے تیسے اس نے اپنی بیوی کے لاشے کو دفنایا، پھر انہی دنوں جب اس نے اپنے اس منحوس پیشہ گورکنی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کا ارادہ کیا تو ایک دن رات کو ایک موٹا گورکھا اس کے پاس آیا اور اسے ایک پُراسرار اور گھناؤنے کام کی ترغیب دیتے ہوئے بدلے میں بہت سے روپوں کا لالچ دیا۔ یہی نہیں بلکہ اسے "کام" سے پہلے ہی خاصی رقم پیشگی بھی تھما دی تھی۔

بس پھر کیا تھا...... رحیمو نے ایک بار پھر پھاوڑا اور کدال سنبھال لیا تھا...... لیکن اب وہ مُردے دفنانے کے ساتھ ساتھ ایک گھناؤنا کام کرنے لگا تھا۔ وہ رات کی پُراسرار تاریکی میں قبریں کھود کر مُردوں کی ہڈیاں نکال کر جمع کرنے لگا۔

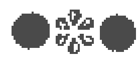
ٹھیک سات دن بعد وہ گورکھا آ کر اس سے انسانی ہڈیوں کا تھیلا لے جاتا اور ایک خاصی رقم اس کی جھولی میں ڈال جاتا تھا۔ رحیمو نے پہلے تو یہی سوچ کر اس گھناؤنے کام کی ابتداء کی تھی کہ کچھ رقم جمع کرنے کے بعد وہ یہ دھندا چھوڑ دے گا۔ لیکن اسے اب اس "کام" کا ایسا چسکا پڑا تھا کہ وہ اسے ترک نہیں کر سکا بلکہ اب اس نے رفتہ رفتہ اس

"کام" میں اپنے بیٹے رمو کو بھی شامل کر لیا تھا۔ وہ گورکھا ان ہڈیوں کا کیا کرتا تھا...... یہ دونوں باپ بیٹا نہیں جانتے تھے۔ ایک بار رمو نے یونہی موٹے گورکھے سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ان انسانی ہڈیوں کا کیا کرتا ہے؟ تو جواباً اس نے گھور کر اسے کرخت لہجے میں کہا تھا۔

"بٹو...... اپنے کام سے کام رکھ......" تاہم پھر اس نے مکروہ ہنسی کے سے انداز میں سرسری سا بتا بھی دیا تھا کہ وہ ان ہڈیوں کو ڈاکٹری پڑھانے والے کالجوں کو فروخت کرتا ہے۔

شروع شروع میں تو دونوں باپ بیٹے خوب "مال" جمع کر کے گورکھے کے حوالے کرتے رہے لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ مال کچھ ناپید سا ہونے لگا تھا۔ ظاہر ہے روز تو مُردے دفن نہیں ہوتے تھے۔ جو پچھلے تھے، وہ یہ لوگ ادھیڑ چکے تھے...... اب "مال" حاصل کرنے کا زیادہ تر انحصار نئے دفن ہونے والے مُردوں پر تھا۔ ان کا ماس (گوشت و آلائش) ادھیڑنے میں انہیں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا...... لیکن یہ مسئلہ بھی قبرستان کے بجو نے حل کر ڈالا تھا۔ رمو نے جانے کس طرح اسے سدھا لیا تھا۔ اب جیسے ہی کوئی نئی لاش دفن ہوتی، یہ دونوں باپ بیٹے آدھی رات کے وقت قبر پر پہنچ جاتے۔ بجو بھی ان کے ہمراہ چیتے کی طرح انگڑائیاں لیتا ہوا خراماں خراماں چلا آتا اور بڑی صفائی سے قبر کے اندر جا گھستا اور اپنی تھوتھنی میں مُردے کے پاؤں کے انگوٹھے کو دبوچ کر اسے پورا کا پورا باہر نکال لاتا اور جلدی جلدی سارا گوشت چٹ کر جاتا۔

پھر اس کے بعد دونوں گورکن باپ بیٹے ہڈیوں کے اس پنجر کو اپنے ساتھ لے جاتے۔



اساڑھ شروع ہو چکا تھا۔ یہ درمیانے موسم کی رات کا ذکر تھا۔ رحیمو اور رمو دم بہ خود سے بیٹھے پُرہول سناٹے میں بیڑی پی رہے تھے کہ اچانک جھونپڑی کے باہر کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں ابھریں، پھر ساتھ ہی کسی نے زور سے پکارا۔ "ارے بھئی کوئی ہے اندر...... قبر کھدوانی ہے۔ میت آئی ہے۔"

یہ آواز سن کر اندر بیٹھے دونوں باپ بیٹوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر رحیمو کھانستا

ہوا باہر نکلا تو چند لوگوں کو باہر کھڑے پایا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں لالٹینیں بھی تھیں۔

"کدھر کھدوانی ہے قبر......؟"

رحیمو نے اپنے لہجے میں بیزاری سموتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی ہمیں کیا پتہ...... جگہ تو تم ہی بتاؤ گے۔" ایک شخص نے جواباً کہا تو رحیمو سر ہلاتا ہوا دوبارہ جھونپڑی میں آیا اور بیٹے سے بولا۔ "چل اٹھ...... لاش آئی ہے۔ اٹھا پھاوڑا۔" اس کے لہجے سے دبی دبی مسرت عیاں تھی۔

اس کے بعد رحیمو نے ایک بدنما بانس پر جھولتی ہوئی لالٹین اٹھائی اور باہر آ کر ایک شخص سے بولا۔ "آؤ...... میرے ساتھ...... ادھر کونے میں ایک جگہ خالی ہے۔"

مذکورہ شخص نے اس کی بات سن کر پھر اپنے ساتھ کھڑے کچھ لوگوں کو میت لانے کا کہا جو انہوں نے قریب ہی رکھی تھی۔ پھر یہ سب لوگ بوڑھے رحیمو کے عقب میں چل پڑے۔

پھر مطلوبہ جگہ پہنچ کر یہ لوگ رک گئے۔ رمو بھی ان سے آ ملا تھا۔ چند قبروں کے بیچ ایک جگہ خالی تھی۔ رمو اپنے کام میں جت گیا۔ باقی سارے لوگ دائرے کی صورت میں کھڑے ہو گئے۔ ان سب لوگوں کے چہروں پر غم ناک خاموشی طاری تھی۔

دونوں باپ بیٹے مل کر قبر کھودنے میں مصروف تھے۔ بھیدوں بھری ڈراؤنی رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ فضا کے ہولناک سناٹے میں ہوائیں بین کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر جب لاش کو لحد میں اتارا جانے لگا تو وہاں موجود چند غم زدہ لوگ بے اختیار رو پڑے۔ انہیں لاش کا آخری دیدار کرایا جا رہا تھا۔ لاش کو قبر میں اتارنے کے بعد سب نے مل کر اس پر مٹی ڈالی اور پھر فاتحہ وغیرہ پڑھ کر لوٹ گئے۔

رحیمو اور رمو بھی اپنا سامان سمیٹ کر جھونپڑی میں آ گئے۔ دونوں نے تیز پتی کی چائے بنا کر پی۔ پھر بیڑی سلگا کر دم بہ خود سے بیٹھ گئے۔ وہ شاید اپنی تکان اتار کر خود کو "اصل کام" کے لئے دوبارہ چاق و چوبند کر رہے تھے۔ اثنائے راہ...... ٹاٹ کا پردہ ہٹا اور منحوس شکل والا بجو جھومتا ہوا اندر آ کر دونوں باپ بیٹوں کو گھورنے لگا۔

تب رحیمو اپنے بیٹے سے بولا۔ "چل اٹھ اپنا کام کر...... پہلے دن کام نمٹانا آسان

ہوتا ہے۔"

رمو نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے تھیلا سنبھالے اٹھ کھڑا ہوا۔ رحیمو نے ختم ہوتی بیڑی کے جلدی جلدی دو تین کش بھرے اور ٹوٹا پاؤں تلے مسل کر باہر آ گیا۔ رمو بھی لالٹین اٹھائے اس کے ساتھ ہو لیا۔

بجو کی چندی چندی آنکھوں میں عجیب پراسراری چمک ابھری...... اور وہ بھی جنگلی بلے کی طرح انگڑائی لے کر چل دیا۔ ذرا دیر بعد ہی یہ سب اس تازہ قبر کے پاس موجود تھے۔ بجو نے سب سے پہلے اپنا "کام" سرانجام دیا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ لاش کو انگوٹھے سے اپنے پاؤں میں دبائے قبر سے باہر کھینچ لایا۔ رحیمو اور رمو نے جلدی جلدی لاش کا کفن کھولا۔ وہ لاش کسی عورت کی تھی۔

اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ رمو کی جیسے ہی عورت کے چہرے پر نظر پڑی اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ چہرہ ہی ایسا تھا...... انتہائی حسین اور خوبصورت...... ذرا ہاتھ لگے تو میلا ہو جائے۔ ایسا حسین چہرہ اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ ذرا دیر تک بڑی محویت سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ بے اختیار اس کا جی چاہنے لگا...... "کاش یہ زندہ ہوتی۔" پھر اسے اس کی موت کا بے حد دکھ ہونے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے...... کیا شادی کرے گا اس سے...... اتار اس کا کفن......" معاً اس کی سماعت سے باپ کی آواز ٹکرائی اور وہ ذرا چونکا پھر اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے لاش سے کفن اتار دیا۔ ایسے میں رمو کے ہاتھ جب اس عورت کی لاش سے ٹکرائے تو اس کا وجود گرم محسوس ہوا۔

آج سے پہلے کبھی کسی لاش کے وجود میں ایسی گرمی کا احساس نہ ہوا تھا۔ اس نے جب بھی کسی لاش کو چھوا تھا وہ برف کی طرح سرد اور کڑک ہوتی تھی۔ وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور باپ سے بولا۔ "بابو...... یہ...... یہ زندہ ہے۔"

اس کی بات سن کر رحیمو بیٹے کی طرف گھور کر قدرے سخت لہجے میں بولا۔ "یہ کیا بکواس کر رہا ہے تُو...... ہٹ میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے رحیمو نے لاش کے سینے پر ہاتھ رکھا پھر کان لگائے۔ دل کی دھڑکنیں سننے کی کوششیں کیں مگر وہاں اسے سانسوں کا زیر و بم محسوس نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے لاش کی ایک آنکھ کھول کر پتلی میں جھانکا

اور کھڑا ہو گیا۔

"پاگل ہو گیا ہے تُو...... یہ مُردہ ہے۔"

مگر رمو نے بھی اپنی تسلی کرنا ضروری سمجھا۔ اب اسے بھی لاش میں زندگی کی ذرا بھی رمق محسوس نہ ہوئی۔ رات دبے پاؤں گزر رہی تھی اور آسمان پر پورا طباق چاند بھی جوبن پر تھا۔ رمو بھی اب سیدھا کھڑا ہنوز محویت کے عالم میں لاش کو تکے جا رہا تھا۔ پھر جیسے ہی بجو نے لاش پر جھپٹنا چاہا...... رمو نے اسے ایک زوردار لات رسید کر دی۔ بجو بلبلاتا ہوا دور جا پڑا۔ قریب کھڑا رحیمو بیٹے کی اس عجیب حرکت پر چونک سا گیا اور رمو سے درشت لہجے میں بولا۔

"ارے کیا کرتا ہے۔ کیوں بجو کو مارتا ہے...... نوچنے دے نا اسے گوشت......"

"نہیں بابو...... میں اس لاش کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" رمو نے عجیب سے سپاٹ لہجے میں کہا اور رحیمو کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا بیٹا پاگل ہو گیا ہو۔ وہ اس بار حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے تُو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں بابو...... بس میرا جی نہیں چاہ رہا ایسی سندر اور خوبصورت عورت کی لاش کی بے حرمتی کرنے کو...... میں اسے دوبارہ کفن میں لپیٹ کر قبر میں اتاروں گا۔" رمو نے اس بار قطعیت سے کہا تو رحیمو جھجک کر بولا۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے رے...... کیا تُو اس لاش پر عاشق ہو گیا ہے؟"

"تُو کچھ بھی سمجھ لے بابو...... مگر میں اس لاش کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

رمو نے اٹل لہجے میں کہا۔ وہ اب عجیب انداز میں ہانپنے لگا تھا۔

رحیمو کو اپنے بیٹے پر پاگل ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ اس نے لالٹین اٹھا کر اسے رمو کے چہرے کے ذرا قریب کیا تو وہاں اسے عجیب دیوانگی کے تاثرات نظر آئے۔ ایک لمحے کو اس کا باپ بھی اپنے بیٹے کی اس عجیب وغریب کیفیت پر ڈر سا گیا۔ تاہم وہ ایک گہری سانس خارج کر کے چپ ہو رہا۔ ادھر وہ بجو رمو کی لات کھا کر ایک طرف کو دبک گیا تھا اور اپنی چندی چندی چمکدار آنکھوں سے رمو کی طرف غصے سے دیکھ رہا تھا۔

رمو نے اس لاش کو دوبارہ جیسے تیسے کفن میں لپیٹا اور پھر قبر میں اسے دوبارہ دفنا دیا۔ اس

کے بعد اس نے قریب بیٹھے بجو کو پکڑا اور باپ کے ساتھ واپس جھونپڑی میں آ گیا۔

سب سے پہلے اس نے بجو کو ایک کونے میں رسّی کی مدد سے ایک کھری چارپائی کے پائے سے باندھ دیا۔ رحیمو بڑے غور اور خاموشی سے بیٹے کی حرکات دیکھے جا رہا تھا۔ رمو چپ چپ سا تھا۔ اس کے بعد وہ سونے کے لئے زمین پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرنے کے باوجود...... رمو کی نظروں سے ایک ثانیے کے لئے بھی اس عورت کی لاش کا خوبصورت چہرہ محو نہیں ہوا تھا۔

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ جانے کس پہر رمو کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ سبب وہ دلدوز چیخ تھی جس نے رمو کو جگا دیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہو۔ چیخ قبرستان کے مشرقی حصے سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے دوبارہ وہی لرزہ خیز چیخ ابھری تھی جس نے بالآخر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے پہلے اطراف کا جائزہ لیا تو بری طرح چونک گیا۔ وہاں نہ اس کا باپ رحیمو تھا اور نہ ہی وہ بجو، جسے اس نے چارپائی کے ایک پائے کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ دونوں کو غائب پا کر رمو ذرا ٹھٹکا اور پھر جھونپڑی سے نکل کر دیوانہ وار چیخ کی سمت دوڑا...... رات کی تاریکی نے چہار اطراف ایک ہُو کا عالم طاری کر رکھا تھا۔

رمو کا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا یوں جیسے پنجر توڑ کر باہر آ گرے گا۔ اوپر آسمان کے، کہیں کونے میں اٹکے ملگجے سے چاند کی مدھم روشنی میں وہ اردگرد پھیلی بد ہیئت قبروں کے درمیان بنے ٹیڑھے میڑھے کچے راستے پر تقریباً دوڑا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ مطلوب مقام پر پہنچ کر بری طرح ٹھٹکا۔ اس کے قدم مشینی انداز میں جامد ہو چکے تھے مگر...... اس کا پورا وجود سرتاپا کپکپا رہا تھا۔ چہرے پر دہشت سمٹ آئی تھی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ سامنے ایک دلدوز اور ہولناک منظر موجود تھا۔

وہ منظر ہی ایسا تھا، کسی ذی ہوش کے ہوش گم کر دینے والا...... اس عورت کی قبر ادھڑی پڑی تھی۔ یہ اس خوبصورت عورت کی قبر تھی جس کی لاش کی بے حرمتی کرنے سے رمو نے اپنے باپ کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ بجو اور باپ کو جھونپڑی سے غائب پا کر رمو کے دل میں پہلا خیال یہی ابھرا تھا کہ اس کے باپ نے اس کے سوتے ہی بجو کو لے

کر اپنا ''کام'' شروع کر دیا ہو۔ مگر یہاں کا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔

ادھڑی ہوئی قبر سے اس حسین عورت کی لاش نکالی جا چکی تھی جو پاس ہی بے سدھ انداز میں چاروں شانے چت مگر صحیح سالم پڑی تھی۔ سفید بے داغ کفن اس کے حسین چہرے سے ہی نہیں...... بلکہ جسم سے بھی کافی سرک گیا تھا۔ آنکھیں بند تھیں...... مگر زیادہ کریہہ انگیز اور دل دہلا دینے والا منظر ایک اور تھا۔ اس لاش کے ذرا پرے رمو کا پالتو بجو مٹی میں پڑے بے جان جسم کو بری طرح ادھیڑ رہا تھا اور یہ بے جان لاشہ...... رمو کے باپ رحیمو کا تھا......!

رمو کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا پالتو بجو اس کے باپ کی ایسی حالت بھی کر سکتا ہے۔ بجو کی آنکھیں تاریکی میں تیز واٹ کے دو بلبوں کی طرح روشن تھیں۔ ایسے میں اس کا لمبوترا چہرہ اور بھی ڈراؤنا محسوس ہو رہا تھا۔

رمو اس منظر سے خوف زدہ ہو کر واپسی کی سمت دوڑا اور بالآخر اپنی جھونپڑی میں آ کر دم لیا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کو ہموار کرنے کی غرض سے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اثنائے راہ اچانک ہی باہر آسمان پر بادلوں کی خوفناک گڑگڑاہٹ گونجی اور آن کی آن میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی رہ رہ کر بجلی بھی کڑکنے لگی۔ تیز سراٹے دار ہواؤں کا زور بھی بتدریج بڑھنے لگا تھا۔ ٹاٹ کا پردہ تیز ہواؤں کے باعث ٹوٹ کر اندر بوسیدہ فرش پر آ پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رمو کو بری طرح ایک انجانے خوف نے جکڑ لیا تھا۔ اپنے بابو کی اندوہناک موت اور اس کی لاش کو بجو کی خوراک بننے کا دکھ بھی جانے کدھر دب گیا تھا...... اپنے بابو کے عبرتناک انجام کے بارے میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عنقا ہوتی جا رہی تھی۔ باہر بدروحوں کی طرح چیختی چلاتی ہواؤں نے جانے کیوں اس کے حواس مختل کر دیئے تھے۔ وہ کسی انجانے اور ناقابل بیان خوف کے زیر اثر کپکپا رہا تھا۔ لالٹین کب کی بجھ چکی تھی۔ البتہ باہر رہ رہ کر چمکنے والی بجلی کی تیز روشنی میں جھونپڑی کے کھلے چوکھٹے کا روشن روشن سایہ بڑا پراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ معاً پھر کیا ہوا رمو کی سہمی ہوئی خوفزدہ نگاہوں نے جھونپڑی کے دروازے پر کسی کا سایہ دیکھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ذرا آگے کھسک کر دروازے کی سمت دیکھا تو جیسے بُت بن گیا۔ جھونپڑی کے دروازے پر اس حسین عورت کی لاش کھڑی تھی۔ کفن میں لپٹی......

زندہ لاش...... آنکھیں اس کی بند تھیں...... مگر اس کے باریک گلابی ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

رمو کا تو جیسے دل رک گیا۔ سانس بھی اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔ آنکھیں مارے دہشت کے اس قدر پھیل گئی تھیں جیسے ابھی حلقوں سے باہر اُبل پڑیں گی۔ دفعتہً بجلی کا زوردار کڑکا ہوا اور لاش نے یکدم اپنی آنکھیں کھول دیں اور ادھر رمو اس دہشت ناک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک چیخ کے ساتھ زمین پر گرتا چلا گیا۔



رات اندھیری اور پُرسکوت تھی۔ طوفانِ بادوباراں کے بعد قبرستان میں سناٹے اور ہُو کا عالم کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اطراف کی قبروں پر ٹنڈ منڈ پیڑوں کی سوکھی شاخوں سے بارش کا پانی قطروں کی صورت ٹپک رہا تھا۔

رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ رمو کی جھونپڑی سے ذرا دور مغربی سمت میں قبرستان کی چار فٹ شکستہ دیوار پر نصب لکڑی کا سالخوردہ دروازہ ہولے ہولے چرچرا رہا تھا۔

بارش کے بعد آسمان بالکل صاف اور روشن ہو گیا تھا۔

مدھم سی پراسرار چاندنی میں ایک سایہ قبرستان کے اس شکستہ گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ جھکی جھکی کمر والا ایک باریش بوڑھا تھا جس نے لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ جس کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک عجیب سا نور پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ایک تسبیح تھی اور اس کی کپکپاتی انگلیاں دانوں کو گھما رہی تھیں۔ اس بوڑھے کے چہرے پر قدرے تشویش اور پریشانی کے تاثرات تھے۔ اس کی سفید گھنی بھنوؤں سے ڈھکی ہوئی آنکھیں متلاشی انداز میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ اس کے بائیں ہاتھ میں لاٹھی نما عصا تھا جسے وہ قبرستان کی گیلی مٹی پر ٹیکتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ پھر وہ ایک کھلی ہوئی کیچڑ زدہ قبر پر پہنچ کر رک گیا اور بڑے غور سے قبر کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ اسی حسین عورت کی قبر تھی جس کے قریب ہی ایک انسانی پنجر بھی موجود تھا۔ یہ رمو کے بدنصیب باپ کی لاش تھی جس کا سارا گوشت بجو اور دیگر جانور نوچ کر چٹ کر چکے تھے۔ اس حسین عورت کی لاش غائب تھی۔ اس بوڑھے کی آنکھوں میں اب تشویش کے

سائے مزید گہرے ہو گئے تھے۔ پھر اس کے کپکپاتے ہونٹوں سے آواز ابھری۔

''یہ...... یہ بہت برا ہوا...... انجنا کو کس نے قبر سے نکالا...... یہ نہیں ہونا چاہئے تھا...... یا اللہ حق کی خیر فرما...... باطل کو رُسوا کر......''

اس کے بعد وہ بوڑھا لاٹھی ٹیکتا ہوا غیر معمولی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ پھر وہ رمو کی جھونپڑی کے پاس آ کر رک گیا۔ اس کے بعد جب وہ جھونپڑی کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رک گیا۔

کیا دیکھتا ہے کہ سامنے بوسیدہ زمین پر ایک انتہائی پُر جمال عورت بیٹھی، رمو کا سر اپنی گود میں لئے اسے ہوش میں لانے کے جتن کر رہی ہے۔

جب اس بوڑھے پر اس عورت کی نگاہ پڑی تو وہ بری طرح چونک گئی۔

''انجنا......! یہ شخص معصوم ہے...... چھوڑ دے اسے...... اور چلی چل یہاں سے......''

دفعتہً وہ بوڑھا درشت لہجے میں اس عورت کو مخاطب کر کے بولا۔ انجنا نامی یہ وہی عورت تھی جسے دیکھ کر رمو بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ بوڑھے کی بات پر انجنا کے سرخ و سفید اور حسین چہرے پر پہلے برہمی پھر یکلخت معنی خیز تاثرات ابھرے اور پھر اس نے آہستگی کے ساتھ پہلے اپنی گود سے رمو کا سر زمین پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے دلکش بدن پر کفن کی بجائے زرق برق لباس نظر آ رہا تھا۔ وہ خاصی سرو قد اور دلنشیں خدوخال کی عورت تھی۔ وہ اب بوڑھے کی طرف ناگن جیسی آنکھوں سے گھورتی ہوئی بولی۔

''تم ہار گئے ہو...... عالی شاہ! بہتر یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ چلے جاؤ...... تمہارا ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔''

''ہرگز نہیں...... اے شیطان عورت......! میں اس معصوم انسان کو تم لوگوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔ میں پھر کہتا ہوں دفعان ہو جاؤ یہاں سے......'' بوڑھے نے جواباً انجنا سے پُر جلال لہجے میں کہا۔

پھر دفعتہً ہی بوڑھے کو اپنے عقب میں ایک تیز قہقہہ سنائی دیا۔ وہ جلدی سے اپنے عقب میں گھوما تو چونک گیا۔ جھونپڑی کے دروازے پر ایک دراز قد اور سیاہ رو شخص موجود تھا۔ اس نے گیروے رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے سیاہ ماتھے پر ترشول کا تلک تھا۔ اس کی گول گول قدرے ابلتی ہوئی آنکھوں میں شیطانی چمک اور

کالے بد ہیئت ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ قہقہہ اس نے ہی لگایا تھا۔ اس نے کھرکھراتے لہجے میں بوڑھے کو مخاطب کر کے کہا۔

''عالی شاہ......! اپنی شکست تسلیم کر لو۔ تمہاری لاکھ کوششوں کے باوجود انجنا کو اب آتما شکتی حاصل ہو چکی ہے۔ تُو اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... چلا جا خاموشی سے۔''

''شیطان کی رسی خدا دراز ضرور کرتا ہے...... مگر چھوڑتا نہیں ہے۔ تم لوگوں کا انجام بھی اب قریب ہی ہے۔'' عالی شاہ نامی اس بزرگ نے پجاری کو گھورتے ہوئے کہا اور پھر اپنا عصا سنبھالتا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی پجاری اور انجنا نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ان کے چہروں پر عجیب سی شیطانی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی۔ تب وہ پجاری انجنا سے تہنیتی لہجے میں بولا۔

''تمہیں نئے جیون کے ملنے کی بدھائی ہو انجنا...... اب تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔''

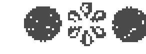
''ہاں...... مہا پجاری! یہ سب تمہاری کوششوں کے کارن ہوا ہے۔ تم نے مجھ جیسی ادنیٰ داسی کا بڑا بھلا کیا ہے۔ اب میں اپنے دشمنوں سے اچھی طرح بدلہ لے سکوں گی۔'' انجنا نے مہا پجاری سے تشکر آمیز لہجے میں کہا مگر اس کے انداز میں آتش انتقام کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''نہیں...... اس میں تمہاری تپسیا بھی شامل تھی۔'' مہا پجاری نے کھردری آواز میں کہا اور مزید بولا۔ ''لیکن انجنا! تمہیں پھر بھی اس بڈھے عالی شاہ سے ہوشیار رہنا ہو گا۔ کم بخت اب بھی تمہیں باندھنے کی شکتی رکھتا ہے۔ اس نے اس قبرستان کے گرد ایک حصار کھینچ دیا ہے اور تم وہ حصار توڑ کر یہاں سے نہیں نکل سکتیں۔ تم اس چھوکرے رمو سے نہایت چالاکی سے کام لینا...... اور براہِ راست اس بڈھے عالی شاہ سے ٹکرانے کی بجائے اسے آگے رکھنا۔''

اس کی بات سن کر انجنا کے حسین چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ ایک نگاہ بے ہوش پڑے رمو کی طرف دیکھ کر مہا پجاری سے بولی۔

''اس کی تم چنتا نہ کرو...... میں اسے اپنی حسین زلفوں کے جال میں اس طرح جکڑ

لوں گی کہ یہ خود ہی عالی شاہ کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ تم ابھی جاؤ...... کہیں اسے ہم پر شک نہ ہو جائے۔ میں اسے ہوش میں لانے کے بعد کام پر لگاؤں گی۔'' انجنا کی بات سن کر ممبا پجاری اپنے موٹے کالے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ بکھیرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔



رمو کی آنکھ کھلی تو صبح نمودار ہو چکی تھی۔ اس کی جب آنکھ کھلی تو وہ اپنے سامنے ایک حسین عورت کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹھک گیا۔ وہ اس حسین عورت کو پہچان گیا تھا۔ پہلے تو اسے اپنے سامنے زندہ سلامت پا کر خوف زدہ ہوا مگر پھر ایک خیال کے تحت اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔

پھر اس نے دیکھا کہ اس عورت کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو اترے ہوئے تھے اور دلکش چہرے پر دکھ کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ عورت اب سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ رمو اسے روتا دیکھ کر بے چین سا ہو گیا اور فوراً اٹھ کر اس کی جانب بڑھا اور بولا۔

''تم......تم کون ہو؟ اور کیوں رو رہی ہو؟''

انجنا نے اپنی سیاہ اور نمناک پلکیں اٹھا کر رمو کی طرف ایک نظر دیکھا اور گلوگیر سے لہجے میں بولی۔ ''میرا نام پروین ہے۔ میرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ کیا...... کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟''

اس کی بات سن کر رمو کا دل بے اختیار پسیج گیا اور وہ اپنا کپکپاتا ہوا ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر آہستگی سے دھرتے ہوئے بولا۔

''تت...... تمہارے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے...... مجھے بتاؤ...... میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔''

''سچ......!'' انجنا نے یک دم خوش ہو کر کہا اور رمو کا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں لے لیا۔ ایک حسین و جمیل عورت کا قرب رمو کو شاداں کیئے دے رہا تھا۔

انجنا اپنے چہرے پر گہری غمناکی طاری کرتے ہوئے بتانے لگی۔ ''میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں...... اور مجھ سے دھوکے سے ایک سندر داس نامی شخص نے شادی کر لی

تھی۔ اور جب اس کا دل مجھ سے بھر گیا تو اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ مجھے مُردہ سمجھ کر اس نے یہاں زندہ گاڑ دیا لیکن......'' اتنا کہہ کر وہ دوبارہ سسکنے لگی تو رمو کا دل بھی بھر آیا اور وہ ملائمت سے بولا۔

''لیکن...... کیا......؟''

سندر داس کا ایک بوڑھا جاسوس میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس نے مجھے یہاں زندہ سلامت دیکھ لیا ہے۔ اب وہ سندر داس کو ساری حقیقت بتا دے گا اور پھر وہ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ...... یہ بوڑھا...... جادو کا ماہر ہے۔''

''تم بالکل مت گھبراؤ پروین...... میں ہوں ناں۔ میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔'' رمو نے جوشیلے لہجے میں کہا اور انجنا کی آنکھیں یک دم چمک اٹھیں اور وہ بے اختیار رمو کے قریب ہو گئی۔ رمو اس کی گھنیری زلفوں کی ہوشربا مہک سے بے حال سا ہونے لگا۔

''کک...... کیا تم مجھ سے شادی کرو گے...... مجھے...... مجھے ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ مجھے پورا یقین ہے تم جیسے بہادر نوجوان کی بیوی بن کر میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

اس کی بات سن کر رمو پر جیسے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ خواب وخیال میں بھی ایسی حسین عورت کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں کر سکتا تھا۔

''ہاں...... ہاں...... میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔'' اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

انجنا کے ہونٹوں پر جواباً دلآویز مسکراہٹ پھیل گئی اور آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھر آئی۔ مگر پھر وہ اپنے لہجے میں تشویش لاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مجھے...... اس بڈھے جادوگر سے ڈر لگتا ہے۔ اس نے مجھ پر عمل کر کے...... مجھے اسی قبرستان کی چہار دیواری تک محصور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے...... ہمارا نکاح...... اس قبرستان میں تو نہیں ہو سکتا ناں...... یہ کام تو...... یہاں سے نکلنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔'' انجنا نے نہایت مکارانہ ناز و انداز سے کہا اور رمو کی جوش و غصے کے مارے سانس پھولنے لگی۔ یہ سب مکار انجنا کے لہجے کی کارستانی تھی۔

ایک حسین وجمیل عورت کے منہ سے رمو کو ''بہادر نوجوان'' کا خطاب ملنا اور پھر شادی پر رضا مند ہونا، ایسے میں رمو کا سینہ پھول جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا رمو جوشیلے لہجے میں اپنا سینہ تان کر بولا۔

''پروین......! تم فکر مت کرو۔ میں ہوں ناں...... میں اس بڈھے جادوگر سے اچھی طرح نمٹ لوں گا۔'' اس کی بات سن کر مکار انجنا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر ذرا دیر بعد رمو قدرے شرماتے اور لجاتے ہوئے انداز سے بولا۔

''کیا واقعی تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

رمو کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ پروین (انجنا) جیسی حسین وجمیل عورت اس کی بیوی بننے کو تیار تھی۔ رمو کی بات پر انجنا نے ایک خاص ادا کے ساتھ اس کی جانب دیکھا اور رمو نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں خمار آلود پیغام کو محسوس کر کے اپنی نظریں جھکا دیں...... تو انجنا ایک قاتل ہنسی ہنس کر بولی۔

''رمو......! میری بات کا یقین کرو۔ میرا بس چلے تو میں ابھی تمہارے ساتھ جا کر کسی قریبی مسجد میں نکاح پڑھوا لوں...... مگر جب تک وہ بڈھا جادوگر ختم نہیں ہو جاتا ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔''

''ٹھیک ہے...... تم بے فکر رہو پروین۔ اسے آنے دو۔ میں اس سے نمٹ لوں گا اچھی طرح......'' رمو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

درحقیقت وہ اب بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس بوڑھے عالی شاہ سے نمٹنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا جو ان کے بیچ دیوار بنا ہوا تھا۔ رمو کا دل بے چین ہوا جا رہا تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے انجنا سے کہا۔

''پروین......! ہو سکتا ہے اس بڈھے نے تمہیں یونہی ڈرایا ہو۔ آؤ...... میرے ساتھ۔ ہم ابھی یہاں سے نکل چلتے ہیں۔''

انجنا نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا۔ یک ثانیے اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھریں اور پھر وہ اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی۔

رمو اور انجنا...... دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے قبرستان کے شکستہ گیٹ پر پہنچ کر رک گئے۔ رمو نے قدرے چونک کر انجنا کی طرف دیکھا۔ انجنا کے حسین چہرے پر عجیب سا

خوف اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ رک کر خوفزدہ سی نظروں سے نیچے زمین کی طرف تکنے لگی۔

''کیا ہوا پروین؟ آؤ...... ڈرو نہیں۔ میں ہوں نا ساتھ......'' رمو نے اس کا حوصلہ بڑھایا تو پروین (انجنا) نے ڈرتے ڈرتے ایک قدم گیٹ سے باہر نکالا تو اگلے ہی لمحے وہ ایک تیز چیخ کے ساتھ اچھل کر پیچھے کی جانب یوں جا پڑی جیسے اس کو کسی نے زور سے دھکا دیا ہو۔

رمو بھی ایک لمحے کو پریشان سا ہو گیا۔ انجنا کو یوں گرتے دیکھ کر وہ بھی کافی حد تک خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ مگر ایک خوبصورت عورت کے سامنے وہ اپنا خوف ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی ایسی عورت کے سامنے جو اس کے ساتھ بیاہ کرنے پر تیار تھی۔ لہٰذا وہ اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بجلی کی سرعت کے ساتھ زمین پر گری انجنا کی طرف لپکا۔ پھر انجنا کو سنبھالنے کے دوران اس نے دیکھا کہ اس کا ایک پاؤں ایڑی کی طرف سے جھلس کر سیاہ پڑ چکا تھا۔ انجنا کے گورے چٹے پاؤں کی یہ حالت دیکھ کر پہلی بار رمو کے دل و دماغ میں بوڑھے جادوگر کے خلاف نفرت کا الاؤ سلگا۔

''دیکھ لیا نا تم نے...... بڈھے نے کس طرح اپنے جادو کے ذریعے میرا یہاں سے نکلنا ناممکن بنا رکھا ہے۔ اگر میں نے پھر دوبارہ اس منحوس قبرستان سے باہر قدم نکالنے کی کوشش کی تو جل کر راکھ ہو جاؤں گی۔'' انجنا نے تقریباً کراہتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔

بھلا رمو کو یہ کیونکر منظور ہوتا کہ انجنا جیسی حسین عورت کا یہ حشر ہو۔ لہٰذا اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور دل ہی دل میں بڈھے جادوگر کو ٹھکانے لگانے کے منصوبے پر غور کرنے لگا۔

''میں اسے اب ہلاک کر کے ہی دم لوں گا...... تم فکر نہ کرو پروین......'' رمو نے مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا اور انجنا کو سہارا دیتے ہوئے واپس جھونپڑی میں لے آیا۔ مکار انجنا کے خوبصورت گورے گورے پاؤں پر دھبہ دیکھ کر رمو کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا اور انجنا پر اسے ترس بھی آنے لگا تھا۔ بہرطور اب تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس بڈھے جادوگر کو ہلاک کر کے ہی چھوڑے گا۔ وہ اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھنے لگا تھا۔

اسی اثناء میں رمو نے کچھ پتوں کا لیپ تیار کر کے انجنا کے جھلسے ہوئے پاؤں پر مسل دیا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''پروین...... ایک بات تو بتاؤ، کیا مجھ جیسا ایک عام آدمی اس بوڑھے جادوگر کو ہلاک کر سکے گا؟''

''بالکل...... تم یہ کام کر سکتے ہو۔ بلکہ تم ہی تو اسے ہلاک کرنے کی سکت رکھتے ہو۔''

اس کی بات پر انجنا فوراً بولی اور پھر جیسے اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے دوسرے طریقے سے رمو کو جواب دینا چاہئے تھا تاہم تیر کمان سے نکل چکا تھا لہٰذا رمو اس کی بات پر قدرے چونک کر انجنا سے بولا۔

''کیا مطلب......؟ میں بھلا ایک جادوگر کو ہلاک کرنے کی کس طرح سکت رکھتا ہوں؟'' رمو نے کہا اور پھر جیسے اپنی بات پر اسے سبکی اور بزدلی کا احساس ہوا تو وہ دوبارہ بولا۔ ''بہرحال...... تم مت گھبراؤ پروین...... میں اس کا پتّا صاف کر کے ہی دم لوں گا۔''

اس کی بات سن کر مکار انجنا نے اطمینان کا سانس لیا اور مخموری سی مسکراہٹ کے ساتھ رمو کی جانب تکنے لگی۔ پھر لوہا گرم دیکھتے ہوئے اس کے قریب آئی اور بولی۔ ''یہ سب ضروری ہے رمو...... کیونکہ اس بوڑھے جادوگر کے مرنے کے بعد ہم دونوں شادی کر سکتے ہیں۔ نہیں تو وہ کمینہ سندر داس اس بوڑھے جادوگر کی مدد سے مجھے ہلاک کروا دے گا۔'' رمو اب سنجیدگی سے عالی شاہ کو قتل کرنے کے منصوبے پر غور کرنے لگا۔



یہ اسی دن کی خاموش اور اجاڑ پراسرار شام کا ذکر تھا۔ رمو اور انجنا...... آپس میں میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول تھے۔ انجنا اب اسے پوری طرح عالی شاہ کے قتل پر آمادہ کر چکی تھی۔ اثنائے راہ...... انجنا ذرا چونکی۔ اس کے چہرے پر اب عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ کے تاثرات عود کر آئے۔ پھر وہ سرسراتے لہجے میں رمو سے بولی۔

''رمو......! کوئی اس طرف آ رہا ہے...... شاید وہی جادوگر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جھونپڑی سے باہر آ گئی اور رمو بھی باہر نکل آیا۔

سامنے عالی شاہ موجود تھا جو قہر آلود نظروں سے انجنا کو گھورے جا رہا تھا۔ پھر مکار انجنا نے دھیرے سے پاس کھڑے رمو سے سرگوشی کی۔ ''رمو......! ہوشیار ہو جاؤ۔''

یہ سننے کی دیر تھی کہ رمو غصے سے پھنکتا ہوا جھونپڑی کے اندر آیا اور اس نے اپنی کدال اٹھالی۔ ادھر اچانک اسے باہر انجنا کے گڑگڑانے کی آواز آئی۔ وہ شاید عالی شاہ سے مخاطب تھی۔

''میرا پیچھا چھوڑ دو...... خدا کے لئے میں اب رمو کے ساتھ پُرسکون زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔'' رمو، انجنا کی گریہ زاری پر کڑھنے لگا اور ساتھ ہی اس کا غصہ بھی سوا ہونے لگا۔ اس وقت اسے باہر سے جادوگر کی قہر آلود آواز سنائی دی۔ وہ انجنا سے کہہ رہا تھا۔

''اپنی گندی زبان پر خدا کا نام مت لا...... تُو ایک شیطانی روح ہے اور جہنم تیرا مقدر ہے۔''

تب رمو نے بنا سوچے سمجھے اپنی کدال اٹھائی اور آن کی آن میں وہ عالی شاہ کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ عالی شاہ کچھ سمجھتا...... رمو نے دونوں ہاتھوں سے کدال تھام کر عالی شاہ کے سر پر دے ماری...... کدال کے وار سے عالی شاہ کی کھوپڑی چٹخ گئی اور وہ جب تیورا کر زمین پر گرا تو بے اختیار اس کے لبوں سے ''اللہ'' نکلا۔ وہ مر چکا تھا۔

رمو عالی شاہ کی زبان سے ''اللہ'' سن کر بری طرح لرز گیا۔ اس کا غصہ اب ہوا ہو چکا تھا۔ کدال اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور اس پر ہیبت ناک کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ مگر اس کے عقب میں کھڑی انجنا کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔



بابا عالی شاہ کدال کے ایک ہی وار سے مر چکا تھا۔ رمو کے ہاتھ سے کدال چھوٹ کر گر چکی تھی۔ وہ سرتاپا لرزہ براندام تھا۔ اس کی نظریں بابا عالی شاہ کے چہرے پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔ بابا عالی شاہ کے لبوں سے برآمد ہونے والے آخری لفظ ''اللہ'' نے رمو کو اندر سے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

پاس کھڑی مکار انجنا نے بھی یہ لفظ سن لیا تھا۔ اس نے شاطر نظروں سے رمو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ گویا اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اسے رمو کے خاموش چہرے پر الجھن آمیز تاثرات نظر آئے۔ پچھتاوے کی جھلک بھی اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کروٹیں لے رہی تھی۔ ایسے میں فوراً انجنا نے رمو کو مزید کسی

سوچ میں مبتلا نہ ہونے دیا اور بولی۔

''رمو! تمہیں کیا ہو گیا ہے...... جلدی کرو...... اس جادوگر کی لاش کو قبر کھود کر یہیں دفنا دو۔''

رمو انجنا کی بات سن کر چونکا پھر الجھن آمیز پریشانی سے بولا۔ ''پروین......! تم تو کہتی تھیں کہ یہ بڈھا کوئی جادوگر تھا مگر...... مگر مرتے سمے اس نے ''اللہ'' کا نام کیوں لیا تھا؟''

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے انجنا کو یک دم پریشان کر ڈالا تھا۔ تاہم وہ رمو کی جانب نشیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معصوم لہجے میں بولی۔

''رمو......! تم واقعی سیدھے سادے انسان ہو۔ یہ بھی اس جادوگر کی ایک چال تھی۔ تمہارا ذہن بھٹکانے اور...... مجھ سے بد دل کرنے کی...... تم بھول گئے، مجھے بھی ایک ایسے ہی شیطان نے دھوکے سے لوٹا تھا...... اور جب مجھے اس کی اصلیت کا پتہ چلا تو اس نے اس جادوگر کی مدد سے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔''

انجنا نے اتنا کہا پھر اپنے حُسن کے جال کا گھیرا رمو کے گرد مزید تنگ کر دیا۔ اس کے نرم و گداز مہکتے دہکتے قرب نے رمو کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ناکارہ بنا ڈالا۔ انجنا اپنے لہجے میں دنیا جہان کی شیرینی سمیٹتے ہوئے دوبارہ بولی۔

''رمو......! اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو...... ابھی میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اس بدبخت سندر داس کے گھر لئے چلتی ہوں...... تم اپنی آنکھوں سے دیکھنا...... مجھے دیکھ کر اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔''

انجنا کی بات سن کر ایکا ایکی رمو کو احساس ہوا کہ اس نے یہ بات کہہ کر شاید پروین کا دل دکھایا تھا اور اس پر شبہ کیا تھا۔ لہٰذا وہ پروین کا دل رکھتے ہوئے ملائمت سے بولا۔

''نہیں پروین...... ایسا نہیں ہے۔ مجھے تم پر...... تمہاری محبت پر پورا یقین ہے۔ اب تم جو کہو گی میں وہی کروں گا۔''

انجنا کی آنکھیں اس بات پر یکدم چمک اٹھیں۔



''بدھائی ہو...... بدھائی ہو انجنا...... تمہاری راہ کا سب سے بڑا کانٹا...... بابا عالی شاہ

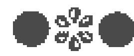
بھی نکل گیا۔ اب تم اپنے دشمنوں سے جی کھول کر انتقام لے سکتی ہو۔'' ممبا پجاری نے مسرت بھرے لہجے میں انجنا سے کہا اور جواباً انجنا کے دلکش ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

اس وقت رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا...... جھونپڑی کے ایک کونے میں چارپائی پر پڑا رمو خراٹے لے رہا تھا اور انجنا دروازے کے پاس ممبا پجاری کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ بولی۔

''ہاں ممبا...... اب سندر داس اور اس کی چہیتی شکنتلا میرے انتقام سے نہیں بچ سکتے۔ میں تو سب سے پہلے ان کے بچے راجو کا کلیجہ کھاؤں گی ان دونوں کی نظروں کے سامنے...... پھر میں انہیں سسکا سسکا کر ماروں گی۔'' یہ کہتے ہوئے انجنا کا حسین چہرہ بھیانک ہوتا چلا گیا اور اس کی باچھوں سے دو نوکیلے لمبے لمبے دانت نظر آنے لگے۔ ممبا پجاری بھی اس کی بدلتی شکل دیکھ کر مکروہ انداز میں ہنسنے لگا پھر بولا۔

''اچھا اب تم...... اس احمق رمو سے بھی جان چھڑا لو۔ اس سے ہم نے جو کام لینا تھا وہ لے لیا...... اب اس کا کانٹا صاف کرو۔''

''نہیں ممبا......! ابھی مجھے اس سے اور کام بھی لینا ہے۔ شہر جانے کے لئے مجھے...... ابھی اس کے سہارے کی ضرورت ہے۔'' انجنا نے کہا اور پھر ذرا دیر بعد ممبا پجاری اثبات میں اپنا سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔



رمو کے اطراف میں گہری دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اسے اپنا وجود دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر معاً اسے دھند میں ایک نورانی چہرہ نظر آیا جسے دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ یہ نورانی چہرہ بابا عالی شاہ کا تھا۔ ان کی دودھیا گھنی بھنوؤں سے ڈھکی ہوئی آنکھیں بند تھیں اور باریش چہرے پر بلا کا سکون چھایا ہوا تھا۔ پھر ان کے ہونٹ متحرک ہوئے...... وہ رمو سے مخاطب تھے۔

''بیٹے...... میں نے تمہیں اپنا خون معاف کیا اور اللہ تعالیٰ بھی تجھ پر رحم فرمائے۔''

بابا عالی شاہ کے الفاظ پر رمو کے دل میں اب خوف کی بجائے ایک درد سا سمٹ آیا۔ پچھتاوے کا درد...... پھر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔ یہ احساسِ

ندامت کے آنسو تھے۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں واضح طور پر ارتعاش تھا۔

"بابا.....! مجھے معاف کر دینا..... میں تمہارا مجرم..... تمہارا قاتل ہوں۔ میں نے ایک عورت کی خاطر بے گناہ آپ کی جان لے لی۔"

"میری بات غور سے سنو....." دفعتہً بابا عالی شاہ نے رمو کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اب بھی وقت ہے..... ہوشیار ہو جاؤ۔ وہ چالاک عورت درحقیقت ایک دھتکاری ہوئی گندی بدروح ہے۔ وہ ایک منتقم مزاج روح ہے۔ تمہیں بڑی چالاکی کے ساتھ اس کا خاتمہ کرنا ہوگا..... ورنہ تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مل کر سب سے پہلے سندر داس، اس کی بیوی شکنتلا اور اس کے چھوٹے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔ مگر اس کے انتقام کی آگ پھر بھی سرد نہ ہوگی اور پھر وہ ہر نئے نویلے شادی شدہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو اپنے نہ ختم ہونے والے انتقام کا نشانہ بناتی رہے گی۔ مگر تم ایسا نہیں ہونے دینا۔ اس نیک کام میں تمہاری بخشش ہے۔"

بابا عالی شاہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو رمو جوشیلے لہجے میں بولا۔

"بابا..... میں ایسا ہی کروں گا۔ اس بدذات عورت کو ختم کر کے ہی رہوں گا۔ لیکن بابا..... کیا آپ مجھے یہ بتاؤ گے کہ پروین ایسا کیوں چاہ رہی ہے۔ وہ آخر ہے کون؟ وہ اپنا انتقام لینے کے لئے کیوں بے چین ہے؟"

رمو کے استفسار پر بابا پُر جلال لہجے میں بولے۔ "ہاں..... تمہیں یہ بتانا بھی ضروری ہے تاکہ تم اس کی اصل حقیقت جان لو..... لیکن سب سے پہلے یہ بات جان لو کہ اس بد ذات عورت کا نام پروین نہیں..... انجنا ہے۔ وہ سندر داس کی بیوی تھی۔ پھر اس کی اپنے شوہر کے ساتھ نہیں بنی..... اس میں بھی زیادہ قصور خود انجنا کا ہی تھا۔ وہ ایک آزاد خیال لڑکی تھی جبکہ سندر داس ایک شریف آدمی تھا۔ بعد میں اس نے انجنا کے کرتوتوں سے تنگ آ کر اسے طلاق دے دی اور شکنتلا سے دوسری شادی کر لی۔ انجنا غم و غصے سے پاگل ہوگئی۔ پھر نجانے کس طرح اس نے ممبا پجاری سے راہ و رسم استوار کئے۔ ممبا پجاری ایک شیطان شخص ہے اور کئی پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ اس نے انجنا کو آتما شکتی دلانے کا وعدہ کرتے ہوئے اسے نصیحت کی کہ آتما شکتی حاصل کرنے سے پہلے ایک

کڑی شرط پوری کرنا ہوگی..... یعنی انجنا کو اپنی زندگی کا خود اپنے ہاتھوں خاتمہ کرنا پڑے گا..... تاکہ دوبارہ وہ ایک نیا جنم لے سکے لیکن اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ مرنے کے بعد اس کا شریر صحیح سلامت رہے..... جس کے لئے یہ ضروری تھا کہ..... وہ پہلے کسی مسلمان شخص کی بیوی بن جائے تاکہ جب انجنا اپنی زندگی کا خاتمہ کرے تو اسے قبر نصیب ہو سکے۔ بہ صورت دیگر اس کی لاش کو جلتی ہوئی چتا پر رکھ دیا جائے گا۔ یوں آتما شکتی کی شرط پوری نہیں ہو سکے گی اور تاعمر آتما شکتی حاصل نہیں کر سکے گی..... لہٰذا انجنا نے ممبا پجاری کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ایک مسلمان شخص سے شادی رچا لی اور اپنا نام بھی انجنا سے بدل کر پروین رکھ لیا..... پس شادی کے بعد انجنا نے ممبا پجاری کے کہنے کے مطابق اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ پھر ممبا پجاری نے انجنا کے مُردہ شریر پر عمل کیا مگر میں اس کی راہ میں آ گیا۔ مگر تمہاری نادانی کی وجہ سے انجنا دوبارہ زندہ ہوگئی۔ جس کی سزا تمہارے بابو نے بھی بھگت لی اور بعد میں انجنا نے بڑی چالاکی سے تمہیں بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور میرا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ مگر اب تم ہوشیار رہنا..... انجنا اب کسی بھی وقت تمہیں بھی ہلاک کر سکتی ہے۔" بابا عالی شاہ نے اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔

رمو یہ ساری کتھا سن کر بڑا حیران و پریشان ہوا۔ تب وہ بولا۔ "بابا.....! میں اب انجنا کا کس طرح مقابلہ کروں گا۔ کیونکہ وہ..... وہ تو اب ایک شیطانی رُوح کا روپ دھار چکی ہے۔"

رمو کی بات سن کر بابا عالی شاہ نے کہا۔ "اس کے لئے اب تمہیں بھی ذرا ہوشیاری اور چالاکی سے کام لینا ہوگا۔ تم ایسا کرنا قبرستان کے باہر میری کٹیا ہے..... تمہیں وہاں ایک تعویذ ملے گا..... تم سب سے پہلے اسے اپنے دائیں بازو پر باندھ لینا..... اس کے بعد کسی طرح سندر داس کے ہاں جانا اور اسے انجنا سے خبردار کرنے کی کوشش کرنا..... پھر اس قبرستان کے باہر کہیں ایک گڑھا کھودنا اور انجنا کو اس کے اندر دھکیل کر اسے آگ لگا دینا۔ اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے جل کر بھسم ہو جائے گی۔" اس کے بعد بابا عالی شاہ کا چہرہ غائب ہو گیا۔



رمو نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھولیں تو اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ چند لمحے تو اس کی

سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مگر پھر ذہن پر ذرا زور دینے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا اور بابا عالی شاہ سے وہ ہم کلام ہوا تھا۔

پہلے تو اسے اپنے خواب پر یقین نہ آیا...... مگر پھر دھیرے دھیرے اسے یقین واثق ہونے لگا کہ اس کا خواب بالکل سچا تھا۔ تب اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ عالی شاہ بابا کی نصیحت پر ضرور عمل کرے گا۔ اسے اب اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ اس نے بے گناہ بابا عالی شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا...... لیکن اب وہ اپنے اس بھیانک جرم کا ازالہ انجنا کو ہلاک کرنے کی صورت میں کرنا چاہتا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو انجنا اس کے قریب ہی موجود تھی۔ رمو نے اس پر ذرا بھی شک نہ ہونے دیا اور اس کے ساتھ اس طرح پیش آتا رہا جیسے وہ اس کا دیوانہ ہو۔ اس کے بعد رمو...... چالاکی کے ساتھ قبرستان سے باہر نکل آیا اور اکیلا بابا عالی شاہ کی بتائی ہوئی کٹیا کی طرف چل دیا۔ کٹیا پہنچ کر اس نے وہ تعویذ ڈھونڈا اور اسے فوراً اپنے دائیں بازو پر باندھ کر اوپر قمیض پہن لی۔ اب اس نے اسی وقت شہر جا کر سندر داس سے ملنے کا ارادہ کیا اور واپس قبرستان لوٹنے کی بجائے سیدھا شہر جانے والی لاری میں سوار ہو گیا۔

بابا نے رات والے خواب میں رمو کو سندر داس کے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔ وہ مطلوبہ کالونی پہنچ کر بس سے اتر آیا۔ احمد آباد شہر خاصا بھرا پرا تھا۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہندو گھرانے بھی کافی آباد تھے۔ رمو اب سندر داس کا گھر ڈھونڈنے لگا۔ اس دوران اچانک اسے شک گزرا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور موٹا کالا شخص تھا۔ کئی بار اس نے اس شخص کو اپنی جانب تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بھی محسوس کیا۔ یہ ممبا پجاری تھا۔ مگر رمو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ اسی لئے اس نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور بالآخر ذرا دیر بعد وہ سندر داس کے دروازے پر کھڑا کال بیل بجا رہا تھا۔ دروازہ ملازم نے کھولا تھا۔ سر سے پاؤں تک رمو کا جائزہ لینے کے بعد اس نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

''کس سے ملنا ہے؟''

''میں...... سندر داس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' رمو نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

''وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔'' ملازم نے کہا۔

''کوئی بات نہیں، میں ان کا انتظار کرلوں گا۔ دراصل مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''اس وقت صرف ان کی پتنی گھر پر موجود ہیں...... تم پھر کسی وقت آ جانا۔'' ملازم نے بیزار کن انداز میں جواب دیا اور واپس مڑنے لگا تو رمو نے اسے روکا۔

''مجھے ان کی پتنی سے ملوا دو۔'' اس کی بات سن کر ملازم نے ایک بار پھر رک کر رمو کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور پھر چبھتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ارے بابا...... تمہیں صاحب سے بات کرنی ہے۔ ان کے آنے کا انتظار کرو۔ اب جاؤ یہاں سے......''

رمو کو اس کے اندازِ تخاطب پر غصہ تو بہت آیا مگر وہ ضبط کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں دوبارہ بولا۔

''دیکھو...... مجھے جو ضروری بات تمہارے صاحب سے کرنی ہے وہی ان کی پتنی سے بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے...... ورنہ بعد کی ذمہ داری تم پر عائد ہو سکتی ہے۔''

ابھی رمو نے اتنا ہی کہا تھا کہ اندر سے ایک نسوانی آواز ابھری۔ ''نارو...... کون ہے باہر؟''

''بی بی جی......! کوئی غریب سا آدمی ہے، کہہ رہا ہے مجھے صاحب سے بہت ضروری کام ہے۔ مجھے تو کوئی بھکاری دکھائی دیتا ہے۔'' نارو نامی اس ملازم نے رمو کو چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو رمو کا ایک بار پھر خون کھولنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ رمو اس ملازم کو آڑے ہاتھوں لیتا اندر سے وہی نسوانی آواز ابھری۔ اس نے نارو کو سرزنش کی۔

''بری بات نارو! اس طرح نہیں کہتے...... ہٹو میں دیکھتی ہوں۔''

اور تب نارو کے عقب سے ایک دبلی پتلی سندر سی عورت دکھائی دی۔ دودھ کی طرح سفید رنگت اور ماتھے پر بندیا۔ اس نے ہلکے گیروے رنگ کی ساڑھی بڑے سلیقے سے باندھ رکھی تھی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا پیارا سا بچہ بھی تھا۔

رمو نے اسے سلام کیا پھر بولا۔ ''مجھے شری سندر داس سے بہت ضروری بات کرنی

تھی۔ کیا آ...... آپ ان کی پتنی ہیں؟"

"ہاں...... میں ان کی پتنی ہوں۔ کہو کیا بات کرنی ہے؟" اس عورت نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

رمو اندازہ لگا چکا تھا کہ یہی عورت شکنتلا ہے جس سے سندر داس نے دوسری شادی کی تھی۔ وہ شکنتلا کی بات سن کر تھوڑی دیر کے لئے متردد ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کس طرح بات شروع کرے اور وہ بھی دروازے پر موجود کھڑے کھڑے...... تاہم اس کی مضطربانہ کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے شکنتلا نے رمو کو اندر بلا لیا...... اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رمو ملازم کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ سندر داس کا گھر کافی بڑا اور خوبصورت تھا۔ ہر چیز سے خوش سلیقگی اور نفاست عیاں تھی۔ ڈرائنگ روم بھی بیش قیمت اشیاء سے مزین تھا۔

رمو ایک صوفے پر قدرے سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ہی شکنتلا دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس نے اب ایک پھولدار چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ ایک صوفے پر براجمان ہو کر رمو کی طرف متفسرانہ نگاہوں سے تکنے لگی۔

رمو نے ذرا کھنکار کر گلا صاف کیا پھر بولا۔ "میرا نام رمو ہے۔ میں دراصل آ...... آپ لوگوں کو ہوشیار کرنے آیا تھا۔ کوئی آپ لوگوں کی جان کا دشمن ہے اور...... وہ...... وہ......"

رمو نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاس کھڑا نارو اسے گھورتے ہوئے شکنتلا سے بولا۔

"بی بی صاحبہ! مجھے تو یہ کوئی بہروپیا لگے ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ ہی اسے اندر بلا لیا۔"

"تم خاموش رہو نارو......" شکنتلا نے ایک بار پھر نارو کو جھڑکا۔ وہ خلاف توقع ایک سمجھدار اور نڈر خاتون تھیں...... لیکن اس کے باوجود اس کے حسین چہرے پر رمو کی بات سے پریشانی سی ہویدا ہو رہی تھی۔ تاہم اس نے پوچھا۔

"کھل کر بات کرو...... تم کیا کہنا چاہتے ہو اور تم ہمیں کس سے اور کیوں خبردار کرنا چاہتے ہو؟ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟" شکنتلا کے منہ سے سوالات کی یلغار نے رمو کو ایک لمحے کے لئے بدحواس سا کر دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ذرا سنبھلا اور پھر تھوڑی

دیر کچھ سوچنے کے بعد بالآخر اس نے ساری رام کتھا شکنتلا کے گوش گزار کر ڈالی۔ حسب توقع وہاں موجود نارو کو رمو کی اس رام کہانی پر ذرا یقین نہیں آیا لیکن شکنتلا کے چہرے سے یکدم خوف اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔

نارو رمو کے بارے میں پھر کوئی گستاخانہ سا تبصرہ کرنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ کر سکا کہیں دوبارہ مالکن کی ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ بہرطور...... شکنتلا کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے رمو کی کہانی کو جھٹلایا نہیں ہے اور کافی دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ قریب کھڑا نارو برے برے منہ بنا کر رمو کی طرف گھورے جا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رمو کو یہاں سے چلتا کر دے۔

اثنائے راہ گھر کی کال بیل گنگنا اٹھی۔ "لو صاحب بھی آ گئے۔ اچھا ہی ہوا۔" نارو معنی خیز لہجے میں بولا اور دروازے کی طرف لپکا۔ وہ خاصا سر چڑھا اور منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ رمو نے اندازہ لگا لیا کہ سر چڑھانے میں گھر کے مالک سندر داس کا ہی ہاتھ ہو گا۔

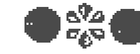
تھوڑی دیر بعد جب نارو کے ساتھ ایک پینٹ شرٹ میں ملبوس خوبرو شخص اندر داخل ہوا تو وہ رمو کو ایسی نظروں سے گھورنے لگا جیسے اسے کھا ہی جائے گا۔ رمو کو اندازہ ہو گیا کہ نارو نے ہی اس کے کان بھرے ہوں گے۔

"کون ہو تم......؟ اور یہاں کس لئے آئے ہو؟" اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اس دوران شکنتلا اور رمو بھی کھڑے ہو چکے تھے۔ رمو بے چارہ سندر داس کے اس رویے پر بوکھلا سا گیا۔

"مم...... میں...... وہ......" اس کے لبوں سے اتنا ہی نکلا تھا کہ سندر داس کرخت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"اے مسٹر...... میں تم جیسے اچکوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔" سندر داس کی بات سن کر شکنتلا نے اپنے شوہر سندر داس سے کچھ کہنا چاہا مگر سندر داس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے بھی چپ رہنے کو کہا۔ رمو کا کام پورا ہو چکا تھا وہ وہاں سے نکل آیا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے سندر داس کی پتنی شکنتلا کو صورت حال سے خبردار کر دیا تھا اور وہ یقیناً بعد میں آرام سے اپنے پتی کو بھی

قائل کر لے گی۔



"انجنا......! میں نے خود اپنی آنکھوں سے رمو کو سندر داس کے گھر جاتے دیکھا ہے۔" ممبا پجاری نے سامنے مضطرب کھڑی انجنا سے کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی کا عنصر غالب تھا۔

"......سمجھ میں نہیں آ رہا، آخر رمو...... یوں اچانک سندر داس کے گھر کیوں جا پہنچا۔ اسے تو اس کا گھر بھی معلوم نہ تھا۔" انجنا نے بھی پریشان ہو کر کہا۔ اس کی بات سن کر ممبا پجاری نے قدرے توقف کے بعد پُر خیال انداز میں کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے رمو کو کسی نے بہکایا ہے۔"

"لیکن ممبا......! کیا تم اس بات کا کھوج نہیں لگا سکتے کہ رمو...... سندر داس کے پاس کس لئے گیا تھا؟" انجنا نے پوچھا۔

"اس میں اب کیا شک رہ جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے رمو سندر داس کے پریوار کو تم سے خبردار کرنے ہی گیا ہوگا۔ تم ایسا کرو چالاکی سے پہلے رمو سے پوچھنے کی کوشش کرنا کہ وہ آج سارا دن کہاں غائب رہا ہے۔ اگر وہ جھوٹ بولے تو سمجھ جانا...... وہ تمہاری اصل حقیقت سے واقف ہو چکا ہے۔ تب پھر اس کے ساتھ سختی سے نمٹ لیں گے۔ بعد میں وہ خود ہی اگل دے گا۔" ممبا پجاری نے انجنا کو سمجھاتے ہوئے کہا اور جواباً انجنا پُر خیال انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دینے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شعلے سے رقصاں ہونے لگے تھے۔ اس کے چہرے سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آج رمو کا حساب بھی بے باق کر کے چھوڑے گی۔

پھر اس دوران رمو آ پہنچا۔ اپنی جھونپڑی میں ایک پجاری کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔

"تم کہاں گئے تھے؟" معاً انجنا نے رمو کو گھورتے ہوئے کہا تو رمو نے بہ غور انجنا کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اسے انجنا آج کچھ بدلی بدلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے لہجے پر وہ متحیر بھی ہوا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ کہیں انجنا کو اس پر کسی قسم کا شک تو نہیں ہو گیا۔ لیکن اب رمو کو بھی اس کی پروا نہیں رہی تھی۔ اس لئے وہ کندھے اچک کر

لاپروائی سے بولا۔ "ایسے ہی ذرا شہر گیا تھا...... گھومنے کو جی چاہا تھا آج۔"

"تم شہر گھومنے گئے تھے یا سندر داس کے گھر......؟" انجنا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو رمو کا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے اندازہ ہونے لگا کہ اب کسی بھی وقت انجنا اپنی کینچلی بدلنے والی تھی۔ اپنے بھیانک روپ میں اسے خوف زدہ بھی کر سکتی تھی لیکن رمو نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ذرا نہیں ڈرے گا۔ اسے تسلی تھی کہ اس کے پاس بابا عالی شاہ کا کراماتی تعویذ ہے۔ تاہم پھر وہ بھی جواباً غصیلے لہجے میں انجنا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تم...... کیا کہہ رہی ہو اور کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہی ہو؟ میں بھلا سندر داس کے پاس کیا کرنے جاؤں گا؟"

اس کی بات سن کر انجنا نے معنی خیز انداز میں قریب کھڑے ممبا پجاری کے چہرے کی طرف دیکھا اور جواباً ممبا پجاری نے بھی اس کی جانب تکتے ہوئے دھیرے سے اپنا سر معنی خیز انداز میں ہلایا اور پھر اگلے ہی لمحے رمو نے اپنی زندگی کا بھیانک ترین منظر دیکھا۔ انجنا کا حسین چہرہ ایکا ایکی مسخ سا ہونے لگا...... اتنا کہ سیاہ پڑ گیا...... لمبے خوبصورت ریشمیں گیسو سکڑ سمٹ کر میلی چیکٹ جٹاؤں کی صورت اختیار کر گئے۔ آنکھوں کے دیدے پھیل کر باہر نکل آئے اور اس کے منہ سے لمبی کالی دو شاخہ زبان باہر کو لپکنے لگی۔ ایک لمحے کو رمو کا دل انجنا کی بدلی ہوئی ڈراؤنی شکل وصورت پر دہل کر رہ گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے دل ہی دل میں اللہ کے نام کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں قریب کھڑے ممبا پجاری نے اپنا ترشول والا ہاتھ بلند کر کے خوفناک قہقہہ لگایا اور انجنا کا سر اس کے کاندھے پر گھومنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے حلق سے کریہہ انداز میں قہقہے خارج ہونے لگے۔

اس دہشت ناک منظر سے رمو ایک بار پھر دہل گیا۔ اگلے ہی لمحے انجنا کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ وہ رمو کی جانب شعلہ بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔ "تم...... سندر داس کے پاس اسے ہوشیار کرنے گئے تھے۔ میں سب جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو۔"

اس کی بات سن کر رمو کو بھی جیسے ایکا ایکی جوش آ گیا۔ اللہ کے نام کا ورد اور بابا عالی

شاہ کے دیئے ہوئے تعویذ نے رمو کو کافی حوصلہ مند اور بے خوف سا بنا دیا تھا...... لہٰذا وہ بے خوفی کے ساتھ انجنا کے ڈراؤنے چہرے کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ”ہاں ...... میں تمہاری اصل حقیقت سے واقف ہو چکا ہوں۔ تم نے میرے ہاتھوں ایک اللہ والے بزرگ بابا عالی شاہ کا ناحق خون کروایا۔ پر اب میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

رمو کی بات سن کر جیسے انجنا غصے سے بپھر گئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنا منہ کھولا اور اس کی دو شاخہ زبان لپلپاتی ہوئی باہر نکلی اور کسی خوفناک اژدھے کی طرح رمو کے چہرے کے سامنے تھرکنے لگی۔ وہ اژدھا نما سانپ کسی بھی وقت رمو کے چہرے کو ڈس سکتا تھا لیکن...... رمو نے اسی وقت اللہ کا نام لیا اور تعویذ والے بازو پر ہاتھ رکھ دیا...... اگلے ہی لمحے اژدھے کو یوں جھٹکا لگا جیسے اس کی گردن کسی غیبی گرفت میں آ گئی ہو۔ پھر وہ اژدھا نما زبان...... انجنا کے منہ سے نکلتی چلی گئی حتیٰ کہ انجنا بھی جھٹکا کھا کر چیختی ہوئی زمین بوس ہوتی چلی گئی۔

اس اثناء میں قریب کھڑا ممبا پجاری ترشول لہراتا جارحانہ انداز میں رمو کی طرف بڑھا۔ رمو نے اللہ کا نام لے کر ممبا پجاری کے ہاتھ سے ترشول کھینچ لیا اور پھر نجانے رمو کے وجود میں اتنی طاقت کیسے آ گئی کہ اس نے اگلے ہی لمحے وہ آہنی ترشول ممبا پجاری کے مٹکے کی طرح ابھرے سیاہ پیٹ میں پیوست کر دیا۔ ممبا پجاری کے حلق سے ذبح ہوتے بیل کی سی آواز ابھری اور وہ زمین بوس ہو کر تڑپنے لگا اور ذرا دیر بعد ہی ساکت ہو گیا۔ ادھر انجنا بری طرح چیخ چلا رہی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی اژدھا نما لمبی موٹی زبان کو تھامے کسی غیبی گرفت سے چھڑانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

ادھر رمو پر جیسے خون سوار تھا۔ وہ انجنا کی طرف لپکا مگر اگلے ہی لمحے ایک گونجدار پُرجلال آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور اس کے انجنا کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”خبردار...... اس چنڈال سے دور رہو۔ اسے مت ہاتھ لگانا......“ رمو اس آواز پر چپکا کھڑا رہا اور خاموشی سے انجنا کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی لمحے جیسے اس کی اژدھا نما زبان کو کسی نے درمیان سے کاٹ ڈالا۔ انجنا کے حلق سے دل خراش چیخ ابھری اور

ادھ کٹی خون آلود زبان جب اس نے واپس اپنے منہ کے اندر کھینچی تو اس کا سیاہ رو چہرہ...... اور کالے ہونٹ خون سے سرخ ہو کر اسے مزید ڈراؤنا بنا رہے تھے۔ اس کے بعد انجنا چیختی چلاتی جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔



ممبا پجاری کو ہلاک کرنے کے بعد رمو کی آتش انتقام کو قدرے ٹھنڈک پہنچی تھی مگر ابھی وہ انجنا کو اپنے کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے بے چین تھا۔ اسے اپنا وہ خواب یاد آنے لگا جس میں بابا عالی شاہ نے اسے نصیحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ انجنا جیسی شیطانی روح کا کس طرح خاتمہ ہوگا۔ اس کے لئے اسے ایک سلگتا ہوا گڑھا کھودنے کی ضرورت تھی جس کے اندر انجنا کو دھکیلنا تھا لیکن رمو جانتا تھا کہ اس مشقت طلب کام میں دو تین گھنٹے لگ جائیں گے۔ لہٰذا اس نے سب سے پہلے گڑھا بنانے کا ارادہ کیا اور پھر قبرستان کے باہر کوئی مناسب جگہ دیکھ کر کھدائی شروع کر دی۔ اس روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ تقریباً نصف کام کر چکا تھا۔ جب وہ تھکا ہارا شام گئے اپنی جھونپڑی میں لوٹا تو لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی لیکن پھر اچانک رات کے نجانے کس پہر اس کی آنکھ کھلی تو کوئی بڑی ملائمت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ رمو نے چونک کر لالٹین کی روشنی میں دیکھا، وہ بابا عالی شاہ تھے اور بڑی پُرجلال سی نظروں سے اس کی جانب تکے جا رہے تھے۔ رمو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بابا عالی شاہ کو زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ کر پہلے تو رمو ذرا ٹھٹکا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے سے خوشی پھوٹنے لگی۔

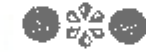
”بابا...... تم...... زندہ ہو“ بے اختیار رمو کے ہونٹوں سے الفاظ پھسلے۔ جواباً بابا عالی شاہ اپنے باریش چہرے پر مسکراہٹ پھیر کر بولے۔

”ہاں بیٹا......! میں زندہ ہوں اور تمہیں ایک بات سے خبردار کرنے آیا ہوں۔ وہ یہ کہ تم اپنے بازو سے یہ تعویذ اتار دو۔ میں تمہیں دوسرا تعویذ دے دوں گا۔“ بابا عالی شاہ کی بات سن کر رمو کو اچنبھا سا ہونے لگا تاہم وہ الجھ کر عالی شاہ سے بولا۔

”بابا...... یہ تعویذ آپ ہی نے تو دیا تھا۔ اب آپ ہی اسے اتروانے کا کہہ رہے ہیں۔“

رمو کی بات پر بابا عالی شاہ کے چہرے پر کچھ اضطراب آمیز تاثرات ابھرے اور تب

رمو نے بہ غور عالی شاہ کے چہرے کا جائزہ لیا اور نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے فوراً اپنے بازو پر بندھے تعویذ پر ہاتھ رکھ کر اللہ کا نام لیا۔ پھر اگلے ہی لمحے ایک محیر العقول واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ بابا عالی شاہ کے حلق سے اچانک ایک غیر انسانی چیخ بلند ہوئی اور وہ رمو کے قریب سے اس طرح دور ہو کر پرے جا گرا جیسے کسی نے اسے پکڑ کر پرے اچھال دیا ہو۔ اس کے بعد رمو نے ایک اور حیرت ناک منظر دیکھا۔ آناً فاناً بابا عالی شاہ کی ہیئت مجموعی تبدیل ہونے لگی اور اگلے ہی لمحے اب وہاں مکار انجنا کھڑی تھی۔ رمو سمجھ گیا کہ یہ مکار انجنا ہی تھی جو بابا عالی شاہ کا روپ دھار کر دھوکے سے اس کے بازو سے تعویذ اتروانا چاہتی تھی۔ اصلی روپ میں آتے ہی انجنا اب غائب ہو چکی تھی۔ رمو نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ اس شیطانی روح کی چال میں نہیں آیا تھا۔ اسے اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ جب تک بابا عالی شاہ کا یہ تعویذ اس کے پاس ہے وہ شیطانی روح انجنا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔



رمو اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اب اسے انجنا کی تلاش تھی۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کوندا اور یہ سوچ کر اسے بری طرح پچھتاوا سا ہونے لگا کہ وہ بابا عالی شاہ کی ہدایت کے مطابق سندر داس اور اس کے خاندان کو انجنا کی شیطانی روح سے خبردار کرنے گیا تھا۔ اسے دوبارہ ان لوگوں کی بہر صورت خبر گیری کرنی چاہیے تھی کیونکہ سندر داس نے رمو کو بہروپیا جان کر دھتکار دیا تھا۔ یقیناً وہ انجنا کے شیطانی جال میں پھنس سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی رمو کا دل بے قرار سا ہو گیا اور اس کی نظروں کے سامنے سندر داس کی معصوم پتنی شکنتلا اور اس کا ننھا گول مٹول سا پیارا بچہ گھوم گیا۔ بس پھر کیا تھا رمو نے اسی وقت لاری پکڑی اور شہر آ گیا۔

شدید گرمیوں کا موسم تھا۔ رمو نے جیسے ہی لاری سے اتر کر دھن راج کالونی کا رخ کیا...... معاً ہی چند ڈنڈا بردار خاکی نیکر پہنے دو پولیس والوں نے اسے پکڑ لیا...... رمو بے چارہ اس افتاد پر پریشان سا ہو گیا اور وہ ''ار...... رے'' کرتا ہی رہ گیا مگر وہ دونوں پولیس والے اسے تھانے لے گئے اور تھانے دار کے سامنے پیش کر دیا۔ تھانے دار کا نام انسپکٹر گوبند رام تھا۔ وہ ایک پینتیس چالیس سالہ تجربہ کار انسپکٹر تھا۔ اس کی رنگت

گوری تھی اور وہ درمیانے قد کا شخص تھا۔

''تمہارا نام رمو ہے؟'' اس نے اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھ میں اپنے پکڑے رول کا اشارہ رمو کی طرف کر کے قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... لل...... لیکن...... مجھے کس جرم میں یہاں لایا گیا ہے؟'' رمو نے چلا کر کہا تو انسپکٹر گوبند رام سیاہ رول کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے بولا۔

''شری سندر داس کی پتنی شکنتلا کے قتل کے جرم میں......''

رمو اس کی بات سن کر دھک سے رہ گیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب؟'' بے اختیار رمو کے ہونٹوں سے الفاظ پھسلے۔ ایک لمحے کو تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ ''لیکن میں نے یہ قتل نہیں کیا بلکہ میں تو خود انہیں خبردار کرنے آیا تھا۔''

''بہت چالاک مجرم دکھائی پڑتے ہو تم......'' انسپکٹر گوبند رام رمو کی بات پر اسے کھوجتی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ پھر وہ استہزائیہ انداز میں دوبارہ بولا۔ ''کسی کو قتل کرنے سے پہلے بہت اچھا گراؤنڈ بناتے ہو۔ ذرا اس بدروح کے بارے میں مجھے بھی وہ کہانی سناؤ جو تم نے سندر داس اور ان کی سورگ باشی پتنی شکنتلا کو سنائی دی۔''

انسپکٹر گوبند رام کے تشکیک بھرے اندازِ گفتگو نے رمو کو پریشان سا کر کے رکھ دیا تھا۔ درحقیقت اسے معصوم شکنتلا کی موت کا بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا یہ اسی انجنا کی شیطانی روح کی کارستانی تھی لیکن اس وقت الٹی آنتیں گلے آ پڑی تھیں۔ اس سے وہ جلد چھٹکارہ پانا چاہتا تھا لہٰذا بولا۔

''انسپکٹر صاحب! میری بات پر یقین کرو...... انجنا ایک بدروح ہے۔ وہ سندر داس کے پورے پریوار سے انتقام لینا چاہتی ہے لیکن میرے پاس اس بدروح کو ہلاک کرنے کی طاقت موجود ہے۔ اس لئے آپ بجائے مجھے گرفتار کرنے کے سندر داس اور ان کے بچے کی جانیں بچانے کی فکر کریں۔'' رمو اتنا کہہ کر خاموش ہوا اور انسپکٹر بغور رمو کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولا۔

''ہونہہ...... ایک ایسی آتما کو تم ہلاک کرو گے جو پہلے ہی سے شریر چھوڑ چکی ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہاں سے آزاد ہو کر تم اب سندر داس اور اس کے بچے کو قتل کرنا

چاہتے ہو۔"

رمو نے جواباً کچھ کہنے کے لئے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ انسپکٹر گوبند رام نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا رول زور سے ٹیبل پر مارتے ہوئے کہا۔ "بند کرو اپنی بکواس...... اور مجھے صاف صاف بتاؤ تمہاری سندر داس سے کیا دشمنی ہے اور تم نے اس کی پتنی کا خون کیوں کیا؟" انسپکٹر کے گرجدار لہجے نے رمو کو عجیب مخمصے میں ڈال دیا پھر وہ بے چارہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

"انسپکٹر صاحب...... آپ ایسا کریں سندر داس کو یہاں بلا لیں۔"

"اس نے ہی تو سب سے پہلے تمہارے خلاف پرچہ کٹوایا ہے۔ تم نے ان کی پتنی کو تو پورا پورا بے وقوف بنا لیا تھا مگر سندر داس کو تو تم پر اسی دن سے ہی شک ہو گیا تھا کہ تم وہاں کسی اور ہی مقصد کے لئے آئے تھے۔" انسپکٹر گوبند رام نے کھا جانے والی نظروں سے رمو کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ "سندر داس تو تمہیں دیکھتے ہی تمہاری بوٹیاں نوچ لے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ مجھے اصل حقیقت سے آگاہ کر دو۔"

انسپکٹر نے رمو پر جال پھینکنے کی کوشش کی لیکن رمو بے چارہ کیا کرتا وہ تو قطعاً بے گناہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔ مگر انسپکٹر گوبند رام اس کی خاموشی کا کچھ اور مطلب سمجھا اور ذرا دیر بعد دانت پیستے ہوئے بولا۔ "تم ایسے زبان نہیں کھولو گے۔ تمہیں ڈرائنگ روم کی سیر کرانی پڑے گی۔" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر گوبند رام نے قریب کھڑے ان دونوں کانسٹیبلوں سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"اسے لے جاؤ...... بند کر دو...... رات کو اسے تیج سنگھ کے حوالے کرنا پڑے گا۔ اس پہاڑ کے سامنے تو بڑے بڑے سورماؤں کا سرمہ بن جایا کرتا ہے۔" یہ سنتے ہی ان دونوں نے حیران پریشان کھڑے رمو کو دبوچ لیا اور وہ بے چارہ اپنی بے گناہی میں چیختا چلاتا رہ گیا لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔

اس کے بعد رمو کو لا کر میں ڈال دیا گیا۔ بے چارہ رمو جب چیخ چیخ کر تھک گیا تو ناچار نڈھال ہو کر حوالات کی سیلن زدہ دیوار سے ٹیک لگا کر سالخوردہ سے فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے خود سے زیادہ سندر داس اور اس کے معصوم بچے کی جانوں کی فکر تھی۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ کاش سندر داس کو عقل آ جائے اور وہ

اس پر شک کرنے کی بجائے اسے آزاد کر دے تا کہ وہ جلد از جلد انجنا کا خاتمہ کر سکے۔

پھر اس رات کو ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ رمو کی دعا شاید قبول ہو گئی تھی۔ دو کانسٹیبل خاموشی سے آئے اور اسے قید خانے سے نکال کر دوبارہ انسپکٹر گوبند رام کے کمرے میں لے آئے۔ وہاں ایک اور شخص بھی انسپکٹر کے سامنے والی کرسی پر براجمان تھا اور خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔ رمو اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ وہ سندر داس تھا۔ خلاف توقع اس کے پریشان حال بشرے پر اس وقت گہرا اضطراب طاری تھا۔ رمو کو دیکھتے ہی وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تت...... تم وہی ہو نا...... جو اس دن گھر آئے تھے میرے۔" اس نے قدرے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا اور رمو قدرے متحیر ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں...... ہاں...... میں وہی ہوں لیکن میں نے تمہاری بیوی کا خون نہیں کیا ہے۔"

"ہاں...... ہاں...... مجھے معلوم ہو گیا ہے...... مجھے پتہ چل گیا ہے...... یہ ساری کارستانی مورکھ انجنا کی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ انسپکٹر گوبند رام کی طرف متوجہ ہوا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "انسپکٹر صاحب! آ...... آپ کی بڑی مہربانی...... میں رمو کے خلاف اپنی رپورٹ واپس لیتا ہوں اور میں اسی وقت اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر گوبند رام نے خاموشی سے اپنے کندھے اچکا دیئے اور وہ رمو اور سندر داس کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے دونوں پر اسے پاگل پنے کا شک ہو۔ بہر طور...... سندر داس رمو کو اسی وقت اپنے گھر لے آیا۔ رمو کو اس کے دوستانہ رویے پر حیرت اور خوشی بھی ہوئی۔ بہر طور سندر داس نے رمو سے پہلے معذرت کرتے ہوئے اپنے رویے کی معافی مانگی پھر قدرے آزردہ لہجے میں بولا۔ "رمو...... کاش اگر میں تمہاری باتوں پر بھروسہ کر لیتا تو آج میری شکنتلا زندہ ہوتی...... لیکن اس بات کا احساس مجھے اچانک ہی ہوا۔ انجنا کی شیطانی آتما رات کو میرے بیڈ روم میں آئی تھی۔ اس نے شیطانی قہقہے لگاتے ہوئے مجھے بتایا کہ شکنتلا کو اسی نے گلا دبا کر ہلاک کیا تھا تو میں بجائے خوفزدہ ہونے کے طیش میں آ گیا لیکن بہر حال وہ ایک شیطانی آتما تھی، میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اگر چاہے تو مجھے بھی اسی وقت ہلاک کر سکتی تھی

لیکن وہ مجھے اذیتیں دے دے کر مارنا چاہتی ہے۔ پہلے وہ میری پتنی اور پھر میرے معصوم بچے راجو کو میری نگاہوں کے سامنے ہلاک کرے گی اور بعد میں مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس وقت تو وہ چلی گئی مگر میں پریشان ہو گیا۔ پھر اچانک مجھے تمہارا خیال آیا اور میں تم سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ اس دوران انسپکٹر گوبند کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے تمہارے خلاف کی گئی رپورٹ کے مطابق تمہیں گرفتار کر لیا ہے اور یوں میں تمہیں چھڑانے آن پہنچا۔ پر بھگوان کے لئے اگر تم مسلمان ہو تو...... اللہ کی خاطر مجھے اور میرے بچے کو اس شیطان انجنا سے بچا لو۔" اتنی تفصیل بتا کر سندر داس بے اختیار بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

رمو کو اس پر بڑا ترس آیا اور وہ آہستگی کے ساتھ دوستانہ انداز میں اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ "الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور مجھ پر یہ فرض ہے کہ تمہیں ایک شیطانی قوت سے بچانے کی کوشش کروں۔" اتنا کہتے ہوئے رمو نے اسے انجنا کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے کے سلسلے میں مختصراً آگاہ کر دیا۔ نیز اسے یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچے سمیت اس کے ساتھ چل کر رہے جب تک انجنا کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں...... سندر داس فی الفور راضی ہو گیا۔ اس وقت رمو ہی اسے اپنا نجات دہندہ نظر آ رہا تھا۔ بہر طور سب سے پہلے انہوں نے وہاں سر جوڑ کر ایک منصوبہ بنایا اور پھر رمو اور سندر داس اپنا تھوڑا بہت ضروری سامان باندھ کر بچے سمیت چل پڑے۔ رمو بھی یہی چاہتا تھا کہ جب تک انجنا کا خاتمہ نہیں ہو جاتا ان دونوں باپ بیٹوں کی زندگی اسی کے پاس محفوظ رہ سکتی تھی۔ دوسری سب سے اہم بات یہ بھی تھی کہ ان دونوں کی رمو کے ہاں موجودگی کی وجہ سے رمو اور انجنا کا سامنا بہت جلد ہو سکتا تھا یعنی رمو کو انجنا کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بہر طور زندگی سبھی کو عزیز ہوتی ہے...... بے چارے دونوں باپ بیٹے اپنا آرام دہ گھر چھوڑ کر رمو کی اس قبرستان والی جھونپڑی میں آن بسے۔

انجنا کو پھانسنے کا انہوں نے ایک منصوبہ تشکیل دے دیا تھا جس پر انہوں نے آج ہی عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس سے پہلے سندر داس کے بیٹے راجو کو کسی محفوظ جگہ منتقل کرنے کا مسئلہ آن کھڑا ہوا تھا کیونکہ کوئی بعید نہ تھا کہ انجنا اس معصوم کو نقصان

پہنچا دیتی۔ لیکن پھر ذرا سوچ بچار کے بعد یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ رمو نے اس بچے کو بابا علی شاہ کی کٹیا سے ذرا دور ایک درگاہ کے مجاور کے حوالے کر دیا۔ وہ بابا عالی شاہ کا بھی معتقد تھا۔ بہر طور سب سے پہلے رمو اور سندر داس نے مل کر گڑھے کے اندر اور باہر خشک گھاس اور ٹہنیاں پھیلا دیں۔ پھر شہر سے لائے ہوئے مٹی کے تیل کا آدھا کنستر اندر الٹ دیا اور باقی قریب ہی جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ اب انہیں انجنا کا انتظار تھا۔

وہ رات انہوں نے جھونپڑی میں ہی گزار دی اور کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا۔ یہ اس سے اگلی رات کا ذکر تھا...... سندر داس اور رمو جھونپڑی میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور گہرا پُر ہول سکوت چھایا ہوا تھا۔ منصوبے کے مطابق رمو نے سندر داس کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران سندر داس نے رمو سے پوچھا۔

"رمو! کیا تمہیں یقین ہے کہ انجنا اس طرح ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو جائے گی؟ کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے کہ ایسی پراسرار طاقتوں والی بدروحیں بھلا ایسے عام طریقے سے کیونکر نابود ہو سکتی ہیں۔"

اس کی بات سن کر رمو ہولے سے مسکرا کر بولا۔ "سندر جی! درحقیقت ایسی طاقتور بلاؤں کی جانیں محض چھوٹی چیزوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ مگر اصل بات ان کا کھوج لگانا ہوتا ہے اور وہ کھوج میں لگا چکا ہوں۔ اسی لئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ انجنا کی موت کا راز آگ میں جل کر بھسم ہونے میں ہی ہے۔" رمو نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔

سندر داس کو بھی قدرے تسلی ہوئی۔ وہ دونوں اب جھونپڑی سے نکل کر قبروں کے درمیان بنی چاندنی میں چمکتی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چل رہے تھے...... پھر قبرستان کے شکستہ گیٹ پر رمو خود ٹھہر گیا اور سندر داس کو آگے روانہ کر دیا۔ اسے روانہ کرتے ہی رمو کا دل جانے کیوں انجانے خدشے کے تحت دھڑکنے لگا۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ سندر داس اس وقت "چارے" کی سی حیثیت رکھتا تھا۔

دفعتہً رمو کو ایک تیز اور غیر انسانی چیخ سنائی دی۔ اس کا دل یکبارگی دھڑکا۔ پھر اس نے چیخ کی سمت دوڑ لگا دی اور تھوڑی دور جانے کے بعد وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ کیا دیکھتا ہے...... اسی ڈراؤنی

صورت انجنا نے سندر داس کی گردن دبوچ رکھی تھی اور اپنے لمبے لمبے نوکیلے دانت اس کی گردن میں گاڑنے کے لئے بڑھا رہی تھی۔ بے چارہ سندر داس اس خوف و دہشت سے بری طرح کپکپا رہا تھا۔ اس وقت رمو نے اللہ کا نام لے کر اپنے بازو پر بندھے تعویذ پر ہاتھ رکھا اور انجنا پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے انجنا سے ٹکرانے کی دیر تھی کہ انجنا کو جیسے کرنٹ لگا۔ اس نے ایک کریہہ چیخ کے ساتھ سندر داس کو چھوڑ دیا۔ ٹھیک اسی وقت رمو سندر داس کو مخاطب کر کے زور سے چلایا۔ ”گڑھے کی طرف بھاگو۔“

سندر داس انجنا کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی رمو کی ہدایت پر دوڑ پڑا اور توقع کے عین مطابق انجنا اپنے ”شکار“ کو فرار ہوتا دیکھ کر اس کے عقب میں دوڑی اور پھر رمو انجنا کے عقب میں ہولیا۔

وہ دل میں یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ سندر داس کمال ہوشیاری کے ساتھ انجنا کو گڑھے میں دھکیل دے اور پھر یہی ہوا۔ جیسے سندر داس کو اندازہ ہوا کہ وہ اب گڑھے کے قریب پہنچ چکا ہے تو اس نے اس کے اوپر چھلانگ لگا دی۔ ادھر بے تحاشا دوڑتی اور شیطانی قہقہے لگاتی ہوئی انجنا کا جیسے ہی پاؤں گڑھے کے اوپر آیا تو اگلے ہی لمحے اسے یوں لگا جیسے اس کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ گڑھے کے اندر جا گری تھی۔ اس کے عقب میں آتے رمو نے آناً فاناً قریب رکھے کنستر کو گڑھے میں بھری خشک جھاڑیوں کے اندر دبی انجنا کے اوپر انڈیل دیا اور پھرتی کے ساتھ ماچس نکال کر دیا سلائی دکھا دی۔

آن کی آن میں خشک جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی اور انجنا کی دردناک چیخوں سے پورا جنگل گونجنے لگا۔ آگ تیزی کے ساتھ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ شعلے تھے کہ آن کی آن میں آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ سندر داس اور رمو دم بہ خود بھڑکتے ہوئے شعلوں پر نگاہ گاڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ انجنا کی چیخیں آنی بند ہو گئیں اور فضا میں ایک عجیب چراندسی پھیل گئی۔ پھر اس کے بعد آگ ٹھنڈی پڑنے لگی۔ انجنا جل کر بھسم ہو چکی تھی۔

رمو نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس کا ضمیر اب مطمئن تھا کیونکہ اس نے ایک انسان کو ایک موذی بلا سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ دلا دیا تھا۔



موسمِ ہجراں

یہ آغازِ سرما کی ایک رات کا دم بہ خود پہر ہے۔ دریائے سندھ سے آنے والی سبک خرام ہوا کے جھونکوں میں نمی کا عنصر غالب تھا۔ یہ ضلع لاڑکانہ کی تحصیل ڈوکری کا نواحی علاقہ تھا۔

کھلے اور شفاف آسمان پر ٹکے مبہوت چاند کی طلسماتی روشنی پاس سے گزرتی نیم پختہ سڑک سے ذرا دور موئن جودڑو کے خوابیدہ کھنڈرات میں پراسرار ویرانی مسلط کئے ہوئے تھی۔

سناٹے دار ہوائیں، کھنڈرات کے سالخوردہ اور لون کھائے اسٹوپا، بوسیدہ گمٹیوں اور شکستہ برجیوں کے اطراف میں آسیبی چمگادڑوں کی گھمیریاں بھر رہی تھیں۔

مضبوط سے مضبوط دلوں میں ہیبت طاری کر دینے والا یہ مہیب سناٹا اس وقت کھنڈرات کی ناہموار گزرگاہوں اور ٹوٹی دیواروں سے چمٹا نوحہ کناں تھا۔ اس وقت موئن جودڑو، کسی حنوط شدہ لاش کی طرح ابدی نیند میں غرق محسوس ہو رہا تھا، قرن با قرن سے آسیبی سناٹے جیسے اس کا مقدر بن چکے تھے لیکن جب پہر رات کے دم بہ خود سناٹوں میں بین کرتی ہوائیں تاریک روزنوں سے گزرتی ہیں تو صدیوں سے خاموش موئن جودڑو کے دریدہ سینے میں آسیبی سسکیوں کا بھونچال سا آ جاتا ہے اور پھر کھنڈرات کے سیلے سیلے ماحول میں صف ماتم بچھ جاتی ہے اور اس کے پُرہیبت ماحول میں لاتعداد بدروحیں چیختی چلاتی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے فضا ساکت تھی اور پورا ماحول مبہوت، چٹکی ہوئی پراسرار چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔

ذرا پرے ڈوکری جانے والی سڑک بھی ویران تھی جہاں آوارہ کتے بھونکتے اور لڑتے پھر رہے تھے۔ سڑک کے پار گوٹھ الھیار کے گارے مٹی سے بنے بے ترتیب گھروں کی قطاروں سے کہیں کہیں مدھم روشنیاں جگنو کی طرح دور اندھیروں میں جوت

جگاتی محسوس ہوتی ہیں۔ مگر پھر لامحیط تاریکی اس جوت کو آناً فاناً نگل لیتی ہے۔

دفعتہ ہوا کا ایک زوردار جھکڑ اٹھا تو کھنڈرات کی سیلن زدہ گزرگاہوں میں پڑے خزاں رسیدہ پتے لڑکھڑانے لگے۔ ان کی پراسرار سرسراہٹ سے یوں لگا جیسے کوئی ان دیکھی مخلوق دبے پاؤں چل رہی ہو اور پھر ایسے میں ایک سسکاری گونجی...... یہ کرب ناک سسکاری کنڈر کی ایک شکستہ اور لون (اندرونِ سندھ "لون" ایک بد بلا کا نام ہے...... جس طرح دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے، اسی طرح یہ "لون" بھی عمارتوں کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالتی ہے) کھائی دیوار کے پیچھے سے ابھرتی تھی۔

یہاں تاریکی نسبتاً زیادہ تھی اور چاندنی عنقا...... یہ ایک تاریک گوشہ تھا مگر حیرت کی بات تھی کہ وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا جدھر سے سسکی کی پراسرار آواز ابھری تھی۔ دیوار کے بالکل قریب سے ایک ایسی آواز ابھری جیسے کسی نے گہری لمبی سانس کھینچی ہو۔ اس راہ گزر پر پراسرار چاپ کی سرسراہٹ سی ابھری۔ یوں لگا جیسے کوئی ان دیکھی مخلوق دبے پاؤں چل رہی ہو۔ ایک زور کا جھکڑ تنگ موریوں اور رخنوں سے ہوتا اپنے ساتھ برگِ خزاں رسیدہ کو رگیدتا طاغوتی بگولے کی طرح چکرانے لگا تو پورے ماحول میں نسوانی سسکیوں کی گونج تیز ہوگئی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے ایک مردانہ آواز ابھری۔

"ارباطہ......! مت رو...... اب رونے کا کیا فائدہ......؟" اگرچہ اس تشفی آمیز آواز کے لہجے میں قرن ہا قرن کا درد سمٹا ہوا تھا مگر اس تشفی کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ نسوانی درد بھری سسکیوں میں کمی آ گئی تھی۔

"زرمان......! اس مردود آگھ نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا...... کاش...... کاش......"

نسوانی آواز ابھری۔

"نہیں ارباطہ......! ان ناکام حسرتوں کا گلا گھونٹ دو...... ورنہ...... ورنہ...... ہمیں کبھی چین نصیب نہ ہوگا۔" زرمان نامی شخص کی آواز ابھری۔

کھنڈرات کے پُرسکوت آسیبی ماحول میں ابھی یہ پراسرار سرگوشیاں جاری تھیں کہ ذرا پرے تاریکی میں ڈوبی ہوئی سڑک پر روشنی سی ابھری۔ یہ ایک کار کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک تیس، بتیس سالہ خوبرو شخص اسٹیئرنگ پر مُکا مارتے ہوئے غصے سے بڑبڑایا۔

"دھت تیرے کی...... اسے بھی اس منحوس جگہ پر ہی آ کر خراب ہونا تھا۔"

یہ بخش علی تھا۔ اسے لاڑکانہ پہنچنے کی جتنی جلدی تھی اتنا ہی وہ لیٹ ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ اب اس کی کار بھی اس ہولناک ویرانے میں پہنچ کر خراب ہوگئی تھی۔

وہ جلد سے جلد لاڑکانہ پہنچنا چاہتا تھا۔ اب وہ اپنی جلد بازی پر اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا اور دانت پیستے ہوئے بار بار اگنیشن میں چابی گھما گھما کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ادھر کھنڈرات کے اندر ہونے والی پراسرار سرگوشیاں کچھ لمحے کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ اب وہی بھیدوں بھرے سناٹوں کے گدھ منڈلانے لگے تھے۔

بخش علی کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ درحقیقت وہ اس گوٹھ خیر دین میں اپنے ایک دوست سکھیو خان کی شادی سے واپس لوٹ رہا تھا جو اس مقام سے پندرہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر کچے میں واقع تھا۔ حالانکہ سکھیو نے اسے رات اپنے گھر پر ہی ٹھہر جانے کو کہا تھا...... لیکن وہ نہ مانا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لاڑکانہ میں اس کی بوڑھی والدہ اور جوان بہن بھاگی تنہا تھے جن سے بخش علی وعدہ کر آیا تھا کہ وہ شام تک لوٹ آئے گا۔ نہ پہنچنے کی صورت میں وہ دونوں یقیناً اس کی طرف سے پریشانی میں مبتلا ہو سکتی تھیں اور پھر طرح طرح کے خدشات انہیں پوری رات چین سے نہیں رہنے دیتے۔ اگرچہ اب واپسی کے مقررہ وقت سے خاصی تاخیر ہوگئی تھی۔ مگر پھر بھی علی بخش ہر صورت گھر پہنچ کر اپنی ماں اور بہن کو مزید ذہنی کرب میں مبتلا ہونے سے بچانا چاہتا تھا...... لیکن وائے قسمت کہ اس کی گاڑی اس ویرانے میں خراب ہوگئی تھی۔ علاوہ ازیں اسے اگلے دن "ریکوری" کے سلسلے میں بھی گڑھی یاسین پہنچنا تھا۔ وہ ایک کوکنگ آئل کمپنی میں ریکوری آفیسر تھا اور ساتھ ہی مذکورہ کمپنی کی پروڈکٹس کو متعارف کروانا اور آرڈر حاصل کرنا بھی اس کے پیشہ ورانہ فرائض میں شامل تھا۔

وہ دروازہ کھول کر باہر اتر آیا۔ فطری طور پر وہ ایک مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ مگر جانے کیوں سامنے چٹکی ہوئی چاندنی میں نہائے ہوئے موئن جودڑو کے کھنڈرات پر نگاہ پڑتے ہی ایک لمحے کو وہ ہول اٹھا تھا اور چند ثانیے وہ یک ٹک کھنڈرات کو تکتا رہا۔ تب دفعتہ ہی اس پر ایک سحر انگیزی سی چھانے لگی۔ جو اس کے رگ و پے میں سرایت کرتے

ہوئے اسے حال سے بیگانہ کرنے لگی اور پھر اسی وقت اس کا دل انجانے انداز میں زور سے دھڑکا اور اس نے ایک دم سے اپنا سر جھٹک دیا اور جلدی سے کار کا بونٹ اٹھا کر خرابی ڈھونڈنے لگا۔ اگرچہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ گاڑی گرم ہو چکی تھی مگر وہ ہیڈ کھول کر ریڈی ایٹر کا پانی چیک کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر تھوڑا بہت پانی بھی ہوا تو وہ ذرا ستا کر آگے ہو لے گا۔ کم از کم اس منحوس ویرانے سے اسے چھٹکارہ تو مل جائے گا جواب رفتہ رفتہ اس کے اعصاب پر طاری ہونے لگا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے پانی بالکل ختم ہو گیا تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالے بغیر گاڑی ایک انچ بھی ہلنے والی نہ تھی۔

بخش علی نے ایک گہری اور تھکی تھکی سانس لے کر بونٹ گرا دیا۔ پھر وہ کار کی پچھلی سمت آیا...... ڈگی کھولی...... اندر سے ایک پندرہ بیس لیٹر کا خالی کین اٹھایا اور چاروں طرف تاریکی میں متلاشی نظریں دوڑانے لگا۔ اسے اس وقت پانی ملنے کی امید کم ہی تھی مگر تلاشِ آب کی سعی کیے بغیر چارہ بھی نہ تھا کیونکہ کم از کم وہ اس ویرانے میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔

اچانک اس کی ایک بار پھر نگاہ سامنے ملگجی سی چاندنی میں آغشتہ کھنڈر پر پڑی اور پھر جانے کیوں، اس کا دل اس طرف کھنچنے لگا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک قدم آگے بڑھا دیا اور پھر بڑھاتا ہی چلا گیا۔

فضا میں اب نرم نرم ہوا کے جھونکے چلنا شروع ہو گئے تھے اور تھپک تھپک کر لوری دیتے محسوس ہو رہے تھے۔ چاروں طرف گہرے سکوت کا راج تھا۔ دور پرے گیدڑوں کے رونے کی منحوس آوازوں سے لمحہ بھر کو خاموشی کا پردہ چاک ہوتا مگر پھر وہی گہرا سناٹا یکلخت مسلط ہونے لگتا۔

کھنڈرات کی طرف بڑھتے ہوئے بخش علی کو خود حیرت تھی کہ آخر وہ اس طرف کیوں چلا جا رہا ہے جبکہ اسے اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ...... یہاں پانی کا قطرہ بھی ملنے کی امید نہیں مگر جانے کیوں پھر بھی وہ آگے بڑھتا رہا۔ نرم ہوا کی سبک روی جاری تھی کہ اچانک وہ کھنڈر کے قریب پہنچ کر لحظہ بھر کو رکا، اس کی یک ٹک نگاہیں منجمد سی ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر جیسے کسی کے زیر عمل، اس کے قدم دوبارہ اٹھنے لگے۔ ایک اجاڑ

حوض کے کنارے پہنچ کر اس نے اندر جھانکا تو دنگ رہ گیا۔ حوض پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا...... اور اس کی سطح پر چاند کا عکس کسی اپسرا کی مانند جھلک رہا تھا۔ لمحہ بھر کو بخش علی کو حیرت ہوئی کہ اس بوسیدہ اور ٹوٹے پھوٹے حوض میں اتنا شفاف پانی کہاں سے آ گیا۔ ایک خیال کچھ عرصہ قبل ہونے والی دھواں دھار بارش کا آیا تھا کہ یہ جمع شدہ آب ایستادہ اس کا رہین منت ہو گا۔ مگر باوجود اس کے بخش علی کو اس قدر شفاف پانی پر اچنبھا ہو رہا تھا۔ بہرطور...... اس کا دل ایسی جگہ پانی کی موجودگی پا کر جہاں اس کی توقع بالکل نہ تھی...... بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ اس نے اپنی حیرت پر لعنت بھیجی اور فوراً حوض کی شکستہ منڈیر پر سینے کے بل لیٹ کر اس نے کین کو پانی سے بھر لیا اور کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

پانی کا کین سنبھالے...... واپسی کے لئے ابھی اس نے قدم اٹھائے ہی تھے کہ اچانک اسے اپنے قریب ہی کہیں ایک تیز سسکاری کی آواز سنائی دی۔ اب پہلی بار اس کے دل کو ان جانے خوف نے جکڑ لیا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اور اسے اپنے وہم کی کارستانی سمجھ کر ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دفعتہً پھر اسے کسی کے گہرے سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ اب اس کا دل تیزی کے ساتھ دھک دھک کرنے لگا۔

رات کے مہیب اور تاریک سناٹے میں ایک تن تنہا شخص کا اس اجاڑ ویران جگہ پر موجود ہونا بلاشبہ قوی سے قوی اعصاب رکھنے والے انسان کا بھی دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزانے کے لئے کافی تھا۔ مزید برآں ایک پراسرار سسکاری کا سنائی دینا پوری جان نکال لینے کے مصداق تھا۔ مگر بخش علی نے غیر معمولی طور پر اگلے ہی لمحے اپنی لرزیدہ کیفیت پر قابو پا لیا۔ درحقیقت وہ فطری طور پر تجسس پسند شخص تھا۔

معاً دوبارہ ٹھٹھکا۔ اس بار اسے ایک سرد آہ کے ساتھ کھنکتی ہنسی کی بھی آواز سنائی دی تھی۔ بخش علی جو اب تک بدستور اسے اپنے وہم پر ہی محمول قرار دے رہا تھا...... لیکن اب اسے یقین ہونے لگا کہ اس کے آس پاس کوئی موجود تھا...... کون تھا...... وہ......؟ کیا کوئی روح......؟ روح کے تصور سے ہی بخش علی کے رگ و پے میں خوف سرایت کرتا چلا گیا۔ اسے جتنی آیاتِ کریمہ یاد تھیں، اس کا دل ہی دل میں ورد کرتے ہوئے بہ

مشکل آگے بڑھنے لگا۔ اسے اپنے قدم من من بھر کے محسوس ہونے لگے۔

پھر دفعتہً ہی بخش علی کو اپنے چہرے اور گردن کے بالکل قریب کسی کی گرم گرم سانسوں کی آنچ محسوس ہوئی اور اگلے ہی لمحے اسے اپنی گردن پر کسی کی سرد انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ بخش علی اپنی جگہ ساکت و صامت کھڑا رہ گیا...... اور تب اس کے کانوں کے بالکل قریب ایک سرگوشی ٹکرائی۔

"زرمان......! میں...... میں...... تمہاری ارباطہ ہوں۔ میرے پاس آؤ...... میں...... میں تمہارا صدیوں سے انتظار کر رہی ہوں۔" بخش علی کے اوسان خطا ہو گئے۔ حلق جیسے خشک ہو گیا۔ خوف کی ایک سرد لہر پھریری بن کر اس کے پورے وجود کو آکٹوپس کی طرح جکڑنے لگی اور وہ سر تا پا پسینے سے شرابور ہونے لگا۔ اسے اپنے لرزیدہ وجود پر قابو پانا دوبھر ہونے لگا۔ حتیٰ کہ وہ لڑکھڑا گیا اور پھر سنبھل نہ سکا۔



پو پھٹ چکی تھی۔ مشرقی اُفق پر ملگجا سویرا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ گوٹھ اس سے پہلے بیدار ہو چکا تھا۔ مغرب سے آنے والی ہوا کے عطر بیز نرم جھونکے صحرا میں حسین و دلفریب صبح کی سحر خیزی کو حیات آفریں بنا رہے تھے۔ گوٹھ کے جنوب میں کھجیوں کے پیڑوں کے دامن میں بنی سفید پتھروں کی مسجد سے اذانِ فجر بلند ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی اس صبح خیز ماحول کو ایک عجیب طرح کا حُسن بخشتی ہوئی متھل شاہ کی آٹے کی چکی کی مخصوص پک...... پک...... کرتی آواز بھی بلند ہونے لگی تھی۔

یہ گوٹھ بہ مشکل ساڑھے تین سو نفوس پر مشتمل تھا۔ اس کے ایک سمت دریائے سندھ کا چوڑا پاٹ بہہ رہا تھا۔ یہاں سے موئن جودڑو کے آثار صاف نظر آتے تھے۔ حد نگاہ تک چاولوں کی تیار فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ ان میں "اری" سب سے نمایاں تھی۔ البتہ ساٹھی کو مال مویشی چر چکے تھے جو انہی کے لئے ہی مخصوص ہوتی ہے تاکہ دودھ زیادہ دے سکیں۔

کچے اور بے ترتیب مکانوں کی قطاروں میں گارے یا مٹی کے لیپ سے بنی دیواروں پہ جا بجا اپلے تھپے ہوئے تھے۔ انہی میں ایک دو کوٹھڑی نما تنگ و تاریک گھر کے کشادہ صحن میں گاچنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ صحن کے وسط میں دو

کھری چارپائیاں آڑی ترچھی دھری تھیں جہاں کچھ مرغیاں اور چوزوں کی فوج ظفر موج دانے دنکے چگنے میں مصروف تھی۔ ایک کونے میں جہاں ساٹھی لوسن کی گھاس وغیرہ کا ڈھیر تھا ایک آہنی چارہ کاٹنے والی مشین بھی نصب تھی۔ ساتھ ہی پھونس کے چھپر نما سائبان تلے دو بیل بیٹھے معصومانہ انداز میں کمروں کے بند دروازوں کو خاموشی سے تکے جا رہے تھے۔

اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے کو تھا اور فضا میں آمد سرما کی ہلکی ہلکی یخ بستگی طاری تھی۔ گھر کی کچی دیواروں کی منڈیروں پر ننھے منے شبنمی قطرے صبح کاذب کے تاروں کی طرح دمک رہے تھے۔ معاً ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک السائی ہوئی آنکھیں مسلتی ہوئی جوان لڑکی نمودار ہوئی۔ اس کی رنگت گندمی اور آنکھیں غزالی تھیں۔ کین جھر جھیل جیسی گہری آنکھوں میں موئن جودڑو کی سی عمیق اُداسی تھی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا پھولدار لاچا زیب تن کر رکھا تھا جو کہیں کہیں سے میلا ہو رہا تھا۔ مہندی سے بھورے مائل سیاہ بالوں کی چوٹی کمر پر ڈالی ہوئی تھی۔

یہ سدھوری تھی جو کسلمندی کے ساتھ چلتی ہوئی ایک کونے میں لگے ہینڈ پمپ سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد چارے کے ڈھیر کی طرف آئی۔ تب اس نے ایک نگاہ...... دوسری کوٹھڑی کے بند دروازے کی سمت دیکھا اور دانت پیس کر رہ گئی ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں نفرت کی لہر سی اُڈ آئی، جس میں غصے کی پوری شدت کے ساتھ ایک گہرے کرب کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ اس نے حقارت سے اپنا سر جھٹکا اور چارے کی گٹھیاں بنا بنا کر چارہ مشین کا آہنی پہیہ تیز تیز چلانے لگی۔ اس قدر تیز کہ وہ جلد ہی ہانپنے لگی۔ چارے کی چھوٹی چھوٹی کترنیں ڈھیر کی صورت نیچے جمع ہونے لگیں۔ غیر معمولی طاقت سے مشین کا دستی پہیہ وہ خاصی رفتار سے چلا رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اپنے اندر کی بھڑاس نکالنا چاہ رہی ہو۔ جب وہ خاصا چارہ کاٹ چکی تھی تو اس نے اٹھا اٹھا کر بیلوں کے آگے ڈال دیا اور ساتھ ہی کھرلی کے اندر پانی سے بھر کر بالٹی بھی انڈیل دی اور اس کے اندر بھی تھوڑا چارہ ڈال دیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ رسوئی میں آ گئی۔

دفعتہً دوسرے کمرے سے ایک پکی عمر کی سانولی عورت برآمد ہوئی۔ وہ بھرے

بھرے خدوخال کی مالک تھی۔ اس نے عام سی شلوار قمیض اور اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ رسوئی کے قریب آئی۔ یہ سدھوری کی ماں خیراں تھی۔ اس نے رسوئی میں بیٹھی اپنی بیٹی سدھوری کو دیکھا پھر سرد لہجے میں بولی۔

"سدھوری......! چائے کا پانی تھوڑا رکھنا...... تیرا پیو (باپ) منہ اندھیرے ہی نکل گیا ہے آج......" یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑنے لگی تو سدھوری نے قدرے تلخی سے ماں کو مخاطب کر کے کہا۔

"اماں......! اس شخص کو میرا پیو (باپ) نہ کہا کر...... تُو جانتی ہے وہ میرا پیو نہیں ہے۔"

خیراں نے ایک لمحہ رک کر اڈتی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا پھر تیوری پر بل ڈال کر غصے سے بولی۔ "تُو نے پھر...... صبح صبح نحوست پھیلانی شروع کر دی......!"

سدھوری نے یہ سنا تو چوکی پر بیٹھے بیٹھے اس نے گھوم کر ماں کو قدرے تلخ نگاہوں سے دیکھا اور زہرخند لہجے میں بولی۔ "ہمارے گھر میں کس نے نحوست پھیلائی ہے یہ تُو اچھی طرح جانتی ہے۔"

"اچھا...... بند کر اب اپنی بکواس...... مار نہ کھا لینا صبح صبح میرے ہاتھوں......"

اس کی ماں بھی ایک خرانٹ عورت تھی۔ مگر حالات کی زہرناکیوں نے سدھوری کے مزاج میں بھی تمرد اور سخت گیری بھر دی تھی۔ ترکی بہ ترکی جواباً بولی۔

"تو پھر...... میرا حوالہ اس شخص سے کیوں جوڑتی ہے جسے میں نے دل سے تسلیم ہی نہیں کیا اور نہ کروں گی۔"

اس کی ماں کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھرنے لگیں مگر جوان بیٹی کے چہرے پر کسی قسم کے ڈر اور خوف کی بجائے سرکشی محسوس کرتے ہوئے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

سدھوری نے استہزائیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

چائے پاپوں کا "ناشتہ" کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی رلی بچھی چارپائی پر آ کر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہو رہے تھے۔ اسے اپنا باپ یاد آنے لگا

جو منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔

سدھوری بچپن سے ہی اپنے باپ کی لاڈلی تھی مگر اس محبت آمیز لاڈ نے اس کے اندر روایتی قسم کا بگاڑ پیدا نہیں کیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کے مزاج میں ایک جرأت انگیز دلیری ضرور عود کر آئی تھی۔ اسے اپنی ماں خیراں سے بالکل محبت نہ تھی۔ حالانکہ وہ اس کی سگی ماں تھی اور اسے چاہتی بھی تھی۔ مگر سدھوری کے مسلسل نازیبا رویے نے ماں کو بھی غصہ ور بنا دیا تھا۔ مگر وہ اپنی خودسر بیٹی کے منہ لگنے سے ڈرتی بھی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب اس کے پہلے شوہر یعنی سدھوری کے باپ کو دق نے آن دبوچا تھا۔ سوڈھل ایک غریب مگر محنتی ہاری تھا۔ اسے ٹی بی ہو گئی تھی۔ وہ ایک طویل عرصے سے چارپائی پر خون تھوکتے تھوکتے زندگی گھسیٹ رہا تھا۔ ایسے میں اس کی بیوی خیراں شوہر کی تیمارداری تو ایک طرف اس کے کمرے میں پھٹکتی بھی نہ تھی۔ یہ سدھوری ہی تھی جس نے آخر وقت تک باپ کی خدمت کی۔ مگر ماں بیٹی کے درمیان نفرت کی جو خلیج تھی، اس کی وجہ اس سے زیادہ اہم اور کریہہ تھی اور وہ وجہ اس کے باپ کا دوست مٹھو لعل تھا جس سے اس کی ماں خیراں کے تعلقات بہت پہلے ہی استوار ہو چکے تھے۔ سدھوری کا باپ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ٹی بی کا مریض بھی بن چکا تھا۔ مٹھو اکثر اپنے دوست (سدھوری کے باپ) کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر آیا کرتا تھا۔ یہ ایک بہانہ تھا خیراں سے ملنے کا...... مگر سدھوری سب جانتی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ اپنے صاحب فراش باپ کو اس تلخ حقیقت سے آگاہ کر دے...... مگر پھر وہ اس کی جاں بہ لب زندگی کو دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیتی۔ لیکن ایک روز جب سدھوری سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اپنی ماں کے سامنے سینہ سپر ہو گئی۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب سدھوری کا بوڑھا باپ اندر کوٹھڑی میں چارپائی پر پڑا کھانس کھانس کر بے حال ہو رہا تھا اور دوسرے کمرے میں اس کی ماں خیراں، مٹھو کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھی۔

سدھوری کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ اسے غصے کے علاوہ اپنی ماں کی بے حسی کے ساتھ دلیری پر بھی تعجب تھا کہ اسے اتنا بھی احساس نہ تھا کہ اس کا شوہر بے چارہ ایک کونے میں پڑا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور وہ دوسرے کمرے میں بیٹھی

مٹھو کے ساتھ بڑی ڈھٹائی سے خوش گپیوں میں مصروف ہے۔

اس روز پہلی بار دونوں ماں بیٹی کے درمیان جھگڑا ہوا...... مٹھو تو کان دبا کر وہاں سے فوراً نکل گیا۔ درحقیقت وہ بھی خیراں کی طرح سدھوری سے ڈرتا تھا۔ جب سدھوری کا غصہ ٹھنڈا پڑا تو اس کی ماں خیراں زار و قطار رو پڑی اور سدھوری سے رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں کیا کروں پھر...... تیرا باپ تو ایک عرصہ سے چارپائی سنبھال کر بیٹھ گیا ہے۔ پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہے نا...... مٹھو مجھے بھاجائی کہتا ہے۔ وہ اگر تھوڑی مدد کر دیتا ہے تو کیا برا ہے؟“ اور سدھوری ماں کی مکاری پر ششدر رہ گئی۔ یعنی وہ سرے سے ہی انکاری تھی کہ اس کے اور مٹھو کے بیچ کوئی غلط تعلق ہے۔

اسے ماں سے پھر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے اب اپنے لب سی لئے تھے۔ مگر اس وقت اس کے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب وہ اپنے بوڑھے بیمار باپ کو سہارا دے کر اسے دوا پلا رہی تھی تو وہ خود پر قابو نہ پا سکی۔ اس کا دل ماں کے کرتوتوں سے چھلنی تھا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس کا باپ پریشان ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”بابا......! امڑ...... امڑ...... (اماں) بہت بری ہے۔“ سدھوری نے معصومیت سے صرف اتنا ہی کہا تو اس کا باپ اپنی کھانسی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولا۔

”غم نہ کر دھی رانی......! میکوں...... میکوں (مجھے) سب پتہ ہے۔“

سدھوری کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ پھر اس میں باپ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

اس کے چند روز بعد اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔

عدت گزرتے ہی سدھوری کی ماں خیراں نے مٹھو سے بیاہ رچا لیا۔ باپ کے مرنے کے بعد سدھوری خود کو اور بھی تنہا محسوس کرنے لگی۔ اسے اب اس گھر میں گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ وہ دونوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھی۔

آج صبح پھر اس کا دل بہت مجبور سا ہو رہا تھا۔ اس پر قنوطیت چھاتی جا رہی تھی۔ ماں کی بے حسی اور سوتیلے باپ کی عجیب عجیب گھورتی نظروں نے سدھوری کو گستاخ اور خود سر بنا ڈالا تھا۔ خیراں بیٹی پر جتنی سختی کرتی اتنا ہی سدھوری بگڑتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ نوبت

ایک دن یہاں تک آن پہنچی کہ سدھوری نے ان دونوں کو دھمکی دے ڈالی کہ اگر انہوں نے اسے زیادہ تنگ کیا یا اس کی زندگی میں دخل انداز ہونے کی کوشش کی تو وہ پورے گوٹھ والوں کو ساری حقیقت بتا دے گی کہ ان کی شادی کے پیچھے اصل کہانی کیا ہے۔

دونوں نو بیاہتا میاں بیوی ششدر رہ گئے اور خوف زدہ بھی...... یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب اس کی ماں خیراں اور سوتیلا باپ مٹھو سدھوری سے جان چھڑانے اور ٹکے کھرے کرنے کی خاطر اس کی شادی ایک بڈھے سے کرنا چاہ رہے تھے۔ بس پھر کیا تھا، سدھوری نے بڑے دھڑلے سے واشگاف انداز میں دونوں کو دھمکاتے ہوئے کہہ ڈالا تھا کہ...... انہیں اس کے بارے میں فکر کرنے، سوچنے یا کسی قسم کا فیصلہ صادر کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تب سے اب تک ان کے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ طے پا گیا اور انہوں نے ایک دوسرے کے معاملے میں دخل دینا چھوڑ دیا تھا مگر سدھوری کو اس طرح بھی تو چین نہیں ملا تھا۔ وہ پھر بھی دونوں کو دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔ اسے سب سے زیادہ نفرت مٹھو سے تھی۔

اس کا دل غم سے آج پھر بھرنے لگا تھا۔ اس کا جی گھبرانے لگا۔ وہ چارپائی سے اٹھی...... اجرک اوڑھی...... پتلی ٹہنی ہاتھ میں پکڑی اور کسی الھڑ دوشیزہ کی مانند گھر سے نکل پڑی۔

باہر چاروں طرف چمکیلی دھوپ پھیل چکی تھی۔ اس نے عام راستے کی بجائے گھروں کے عقبی طرف کا راستہ اپنایا تھا۔ یہاں دور تک چاولوں اور مٹر کے کھیت تھے۔ وہ کھیتوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتی پتلی سی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ آس پاس مرد، عورت اور جوان کاموں میں مشغول تھے۔

سدھوری نہر کے قریب آ کر ریتیلے کنارے پر بیٹھ گئی۔ ٹخنوں تک اس نے اپنے پاؤں پانی کے اندر ڈبو دیئے تھے۔ دھوپ سے پانی کی سطح کا انعکاس آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا...... خوشگوار موسم کی ہلکی ہلکی ممتا کی لوری جیسی تھپکیاں دیتی ہوا بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

دفعتہً ایک شناسا سا آواز سدھوری کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”اڑی...... سدھوری...... تو

یہاں بیٹھی ہے۔ چل اٹھ ری...... چھوٹی وڈیرنی نے تجھے بلایا ہے حویلی۔''

سدھوری نے قدرے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ یہ سورٹھ تھی، اس کی سہیلی۔ اس کی بات سن کر وہ متفکر سی ہوگئی۔

''خیر تو ہے نا......؟'' یہ کہتے ہوئے سدھوری فوراً پانی سے اپنے پاؤں نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی اور سورٹھ کی طرف تکنے لگی۔

''میں کیا جانوں...... تیری ہی گہری سائتری (سہیلی) ہے۔ اپنے دل کا حال تو تجھ سے ہی کہہ سکتی ہے۔'' سورٹھ نے قدرے معنی خیز انداز میں کہا اور اٹھلاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ سدھوری اپنی جگہ کچھ متفکر سی کھڑی رہ گئی۔ وہ سوچنے لگی ضرور کوئی خاص بات ہے ورنہ چھوٹی وڈیرنی کے پاس تو وہ روزانہ شام میں جاتی ہی ہے۔ آج صبح صبح بلانے کا ضرور کوئی اہم مقصد ہوگا۔ پھر وہ فوراً وڈیرے مشوری خان کی حویلی کی طرف چل دی۔

سب جانتے تھے کہ سدھوری...... چھوٹی وڈیرنی شہزادی کی گہری سہیلی ہے، اسی لئے اسے حویلی میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی...... لہٰذا حویلی پہنچ کر وہ بے دھڑک اندر زنان خانے میں چلی گئی...... اور سیدھی اپنی عزیز سہیلی شہزادی (چھوٹی وڈیرنی) کے پاس پہنچ گئی۔

شہزادی...... وڈیرے مشوری خان کی جوان اور خوبصورت بیٹی تھی۔ سترہ سالہ نرم و نازک اور میدے جیسی سپید اور بے داغ رنگت، اس پر بیضوی چہرہ، آنکھیں کجراری کجراری اور ٹھوڑی میں چاہ زنخدان کے قریب سیاہ تل اس کے ملکوتی حسن کو مزید سجل اور دلکش بنائے ہوئے تھا۔ بلاشبہ سروقد شہزادی اپنے نام ہی کی طرح شہزادی تھی۔

سدھوری اور وہ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ کسی بھی طبقاتی تفاوت سے بے نیاز...... شہزادی، سدھوری سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور یہی حال سدھوری کا بھی تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی نہ صرف غمگسار تھیں بلکہ رازداں بھی تھیں۔

شہزادی کی ماں حسنہ خاتون ایک تیز مزاج عورت تھی۔ شہزادی سے بڑے دو بھائی...... رستم خان اور وزیر خان تھے۔ شہزادی دونوں سے چھوٹی اور سب سے زیادہ لاڈلی تھی۔ بالخصوص اپنے باپ اور ماں کی آنکھوں کا نور تھی۔

سدھوری اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے سامنے ہی نقشیں پایوں والی جہازی مسہری پر نیم دراز شہزادی کو کھویا کھویا سا پایا۔ حتیٰ کہ جب سدھوری نے اندر قدم رکھا تو بھی اس کی آمد کا شہزادی کو احساس نہ ہو سکا تھا۔ تب بالآخر سدھوری کو ہی اسے مخاطب کرنا پڑا۔ بولی۔

''سائیٹری......! خیر تو ہے...... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تیری......؟''

شہزادی کی مخمور نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر اٹکی ہوئی تھیں۔ مگر سدھوری کی آواز پر وہ چونکی اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور محبت سے اپنا ہاتھ دوستانہ انداز میں بڑھایا تو سدھوری نے فوراً نہایت احترام اور انسیت کے ساتھ شہزادی کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے قریب ہی مسہری پر براجمان ہوگئی۔ سدھوری بہ غور...... اب شہزادی کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔

شہزادی نے سدھوری کی طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''سدھوری......! میں نے...... میں نے آج ایک خواب دیکھا...... بالکل عجیب خواب......!''

سدھوری بڑی دلچسپی کے ساتھ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ یہ سدھوری ہی تھی جس سے شہزادی اپنے دل کی بات بلا تکلف کہہ ڈالتی تھی۔ اس سے کچھ بھی نہیں چھپاتی تھی۔ ایک سدھوری ہی تو تھی اس کی غمگسار اور ہمدرد۔

سدھوری جواباً مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شہزادی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''پتہ ہے...... سدھوری...... میں نے خواب میں خود کو ایک شہزادی کے روپ میں دیکھا تھا۔ قدیم طرز کے شاہانہ لباس میں...... میرے آس پاس بڑے خوبصورت اور دلفریب نظارے تھے۔ وہ شہر یا شاید ملک ہی اور تھا۔ لوگ بھی پرانے دور کے تھے۔ قدیم طرز تعمیر کی خوبصورت عمارتیں...... سنگ مرمر کے حوض...... سنگ سرخ سے بنی راہداریاں...... نوکر چاکر...... مہین لباسوں میں کنیزیں...... جو میری خدمت پر مامور تھیں۔''

شہزادی بے خودی کے عالم میں کہے جا رہی تھی اور سدھوری ایک ٹک اسے تکنے میں محو تھی۔

''پھر ایک شہزادے کو میں نے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ وہ بھی محویت کے عالم میں

میری طرف تکے جا رہا تھا۔ اس نے بڑے احترام اور محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کی سنگت میں چہچہاتے گلستانوں...... خوبصورت وادیوں اور مہکتے گلزاروں کی سیر کرنے لگے کہ اچانک...... ایک مکروہ شخص نے سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ وہ کوئی بڑا جادوگر تھا۔ اس کا چہرہ بدوضع اور انتہائی مکروہ تھا۔ اس کے چہرے میں اس کی بدصورتی کو مزید نمایاں کرتی ہوئی شے اس کے چہرے کا عجیب تکونہ پن تھا۔ اس نے میرے اور اس خوبصورت شہزادے کے بیچ طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرنی شروع کر دیں۔" اتنا کہہ کر شہزادی لمحہ بھر کو رکی۔ اس کے دلکش چہرے پر گہری محویت چھائی ہوئی تھی تاہم اس نے سلسلۂ کلام لحظہ بھر کو قطع کر کے سدھوری کو مخاطب کر کے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"سدھوری......! تمہیں شاید میری بات پر یقین نہ آئے لیکن یہ سچ ہے کہ یہ سارا کچھ میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ یہی نہیں بلکہ میں نے ایک پورا زمانہ...... ایک پوری داستان...... جس کا خود میں ایک کردار تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے سے گزری۔ پھر یوں ہوا کہ اس منحوس تکونی چہرے والے دشمن نے اس شہزادے کو ہلاک کر دیا۔ پھر سب کچھ تباہ ہو گیا...... جب میری آنکھ کھلی تو سدھوری......! تم...... تم شاید یقین نہ کرو میں نے...... میں نے خود کو موئن جودڑو کے کھنڈرات کے درمیان کھڑے پایا...... اور پھر میرا خواب ٹوٹ گیا۔"

شہزادی اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ اس کے حسین چہرے پر عجیب قسم کی اُداسی اور غم آگیں تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ مجبور سی نظر آنے لگی جیسے اس کی کوئی قیمتی شے کھو گئی ہو۔ ادھر سدھوری معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔ پھر معنی خیز لہجے میں شہزادی سے بولی۔ "لگتا ہے...... اب تمہیں وہ شہزادہ یاد آ رہا ہے۔"

"ہاں...... وہ واقعی بہت خوبصورت تھا سدھوری...... مگر...... مگر اس کا انجام بہت برا ہوا تھا۔" شہزادی کی آواز میں دکھ تھا اور مجبور سے لہجے میں گہرائی تھی۔ تب وہ اچانک جیسے اک بے خودی کی کیفیت سے نکلتے ہوئے سدھوری کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولی۔ "سدھوری...... چل میرے ساتھ......"

"کہاں......؟" سدھوری کو اس کی بات سن کر اچنبھا ہوا۔

"آ میرے ساتھ...... کوئی سوال نہ کر...... چل اٹھ......" شہزادی نے بے قراری سے کہا۔ تاہم جب وہ دونوں حویلی سے باہر نکلیں تو شہزادی نے سدھوری کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اس کا دل آج موئن جودڑو کے کھنڈرات دیکھنے کو چاہ رہا تھا۔



بخش علی کی جب آنکھ کھلی تو وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے ہنوز خود کو موئن جودڑو کے کھنڈرات کے درمیان موجود پایا۔ اس وقت چاروں طرف تیز دھوپ پھیل چکی تھی۔ وہ جلدی سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ساری رات اس پراسرار کھنڈر میں سویا...... یا بے ہوش پڑا رہا تھا۔ تب اسے دھیرے دھیرے سب کچھ یاد آنے لگا۔ اس کے بے ہوش ہونے کی وجہ ایک پراسرار نسوانی سرگوشی تھی جو گزشتہ رات اس نے اس مقام پر اور بالکل اپنے کانوں کے نزدیک سنی تھی۔ یہی نہیں اس نے اپنی گردن اور چہرے پر کسی کی مخروطی انگلیوں کا نرم و گداز لمس بھی محسوس کیا تھا۔ مگر اس سے بڑھ کر وہ خود کو اس طویل خواب کے اثر سے نہیں نکال پایا تھا جو اس نے سوتے میں دیکھا تھا۔

خواب کیا تھا، زمانہ قدیم کی کوئی بھولی بسری داستان تھی۔ ایک دلگداز داستان، ایک درد بھری کتھا...... اس نے خواب میں خود کو ایک دراوڑی شہزادے کے روپ میں پایا تھا جو کسی آریائی دور کی دوشیزہ کے عشق میں گرفتار تھا اور دونوں کو ایک دوسرے سے والہانہ عشق تھا...... مگر پھر ایک تکونی چہرے والے بدصورت شخص نے سب کچھ ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ وہ اسے یعنی بخش علی کو قتل کر کے اس آریائی دوشیزہ کو لے اُڑا تھا۔

خواب سے جاگنے کے بعد علی بخش کو پورا خواب اچھی طرح یاد تھا۔ یہی نہیں اس پری وش حسین دوشیزہ کا سجل سندر چہرہ بھی اب اس کے دل و دماغ میں ثبت ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں اس اپسرا کے لئے بھی ایک عجیب سی بے قراری تھی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا تھا کہ کاش وہ یونہی سویا رہتا اور اس ماہ وش کی سرور آگیں قربت میں مگن رہتا۔ وہ ایک خواب تھا، اس لئے بخش علی نے اسے اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی مگر بے سود، اس کے دل کی بے چینی اور بے قراری بڑھتی ہی چلی گئی۔ حتیٰ کہ خواب میں نظر آنے والی اس حسین و دلکش اپسرا کے دیدار کے لئے اس کا دل بے اختیار مچل اٹھا۔

تب اسے خود پھر اپنی اس عجیب خواہش پر ہنسی سی آ گئی۔ وہ اٹھا، اس نے کین اٹھایا اور سامنے کھڑی اپنی کار کی جانب بڑھا تو دفعتہً وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کی نظر سامنے دو لڑکیوں پر پڑی۔ وہ اسی طرف آ رہی تھیں۔ وہ دونوں سہیلیاں سدھوری اور شہزادی تھیں۔ انہوں نے بھی بخش علی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ دونوں قریب آ کر رک گئیں۔

بخش علی اور شہزادی کی نگاہیں ایک لمحے کو چار ہوئیں تو دونوں کے دل جیسے دھڑکنا بھول گئے۔ شہزادی جیسے اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ ادھر شہزادی کو دیکھ کر بخش علی کو بھی اپنا دل سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ دونوں ایک ٹک ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے میں محو ہو گئے۔ بخش علی کے ہاتھ سے پانی سے بھرا کین بھی چھوٹ کر گر گیا۔ دونوں دم بہ خود سرتا پا سوالیہ نشان بن گئے۔

”ناقابل یقین...... یہ...... یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے......؟“

دونوں کے ذہنوں میں بیک وقت ابھرنے والا یہ جملہ اگر ان کی زبان تک آ جاتا تو بلاشبہ دونوں کی حیرت دیدنی ہوتی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے لئے سراسر اجنبی تھے، ایسے میں ان کے مرتعش ہونٹوں پر کسی بھی نوعیت کی شناس گوئی نہ صرف ان دونوں کو مزید ورطۂ حیرت میں مبتلا کر سکتی تھی بلکہ پاس کھڑی سدھوری بھی ششدر رہ جاتی۔ لیکن موجودہ صورتحال مختلف بھی نہ تھی۔

بخش علی اور شہزادی کی متعجب اور شناسا نگاہیں ہنوز ایک دوسرے کے متحیر چہروں پر گڑ کر رہ گئی تھیں...... وہ دونوں جیسے نگاہوں کے جام جم میں ڈوب کر اپنے گرد و پیش سے غافل ہو گئے تھے اور نظروں ہی نظروں میں صدیوں کی شناسائی کی منزلیں طے کر رہے تھے...... بظاہر اتھاہ خاموشی میں ڈوبے ہوئے ان کے وجود درون خانہ حیرتوں کے بحر بیکراں میں غوطہ زن تھے...... شہزادی کے ساتھ کھڑی سدھوری کی بھی کیفیت کچھ مختلف نہ تھی...... وہ متحیر نگاہوں سے کبھی ساکت و صامت کھڑے اس اجنبی شخص کو دیکھتی تو دوسرے ہی لمحے اپنی سہیلی شہزادی کو ایک اجنبی شخص میں محو پا کر اسے تعجب ہونے لگتا۔

”کیا یہ دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں......؟“

سدھوری سرتا پا سوالیہ نشان بن گئی۔

کم از کم ان کی باہم دیوانوں اور فرزانوں کی سی محبوبیت اور محویت سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ معاً دوسرے ہی لمحے سدھوری کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا جب ان دونوں نے دھیرے دھیرے اپنا دایاں ہاتھ قدرے اٹھاتے ہوئے اپنی انگشت شہادت سے ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیک وقت کہا۔

”تت...... تت...... تم......“

کپکپاتے ہوئے متحیر لبوں سے بیک وقت برآمد ہونے والے اس مختصر ترین جملے میں صدیوں کی پیاس اور قرن با قرن کی شناسائی تھی۔

ایک عجیب اور پراسرار سی کیفیت تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بالآخر پراسراریت کے ان مبہوت لمحوں کو ختم کرنے کی غرض سے سدھوری نے بے اختیار شہزادی کو ٹہوکا دے کر مخاطب کیا۔

”سائیٹری......! کون ہے یہ...... کیا تُو اسے جانتی ہے......؟“

”ہاں...... نن...... نہیں......“ عالم بے خودی میں شہزادی کے مرتعش لبوں سے برآمد ہوا...... وہ قدرے چونکی...... ذرا بوکھلائی اور پھر جیسے ہوش میں آ گئی اور پھر جلدی سے سدھوری کا ہاتھ تھام کر کپکپاتی آواز میں بولی۔

”چلو...... سدھوری...... چلو...... یہاں سے......“ یہ کہتے ہوئے شہزادی نے ایک آخری نگاہ ہنوز گم صم کھڑے بخش علی پر ڈالی اور واپس مڑ گئی۔

سدھوری حیران و پریشان کبھی اپنی سہیلی کا چہرہ تکتی تو کبھی مڑ کر اجنبی کی طرف دیکھتی۔ یہی حال شہزادی کا بھی تھا...... دور ہوتے ہوئے بھی اس نے دو تین بار اپنی گردن موڑ کر بخش علی کی طرف دیکھا تھا...... ادھر بخش علی کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

چونکا وہ اس وقت جب شہزادی اپنی سہیلی سمیت اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب اس نے ہولے سے اپنے سر کو جھٹک کر ایک لمبی سانس بھری...... وہ اب ایک نئی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا...... اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی تھی...... اس کے دل کی بیقراری پھر سوا ہونے لگی تھی...... بے اختیار اس کا دل اس حسین اپسرا کی طرف کھنچنے لگا...... اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ خواب میں جس حسین

دوشیزہ کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا، اسے اس نے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

"بالکل وہی تو تھی......" اس کے دل بے قراری نے گواہی دی۔ "وہی ستواں ناک...... چٹکی ہوئی چاندنی میں شفاف اور پُرسکون جھیل کی سطح پر چمکتے پورے چاند جیسا حسین دمکتا چہرہ...... نہنگ کے درخت کی سی رعنائی و قامت...... بڑی بڑی کجراری آنکھیں...... گلاب کی پنکھڑیوں کے سے نرم و نازک لبوں پر ہر سمے مچلنے والا غیر محسوس سا معصوم تبسم جو بیک وقت اداسی اور خوشی کی غمازی کرتا تھا...... بھلا وہ دلکشی اور رعنائی کے اس پیکر جمال کو کس طرح بھلا سکتا تھا بلکہ اب تو اسے بھلانا ناممکن ہی ہو چکا تھا۔

ساتھ ہی بخش علی کے مہجور دل میں مسرتوں کی بے پایاں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

اسے یک گونہ سکون، خوشی اور طمانیت ہونے لگی تھی کہ یہ ماہ رخ اسی دھرتی کی باسی تھی۔ تب پھر اچانک اسے کچھ یاد آیا...... اس نے فوراً اس لڑکی کا تعاقب کرنے کی ٹھانی اور کشاں کشاں اپنے قدم اس ماہ جبیں کے تعاقب میں بڑھا دیئے۔

شروع شروع میں اسے یہ عجیب سا محسوس ہوا مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا...... محبت اسی کو تو کہتے ہیں جو خود سے بیگانہ کر دے...... اس کی کسلمندی، تھکان، بھوک، پیاس، گھر جلد پہنچنے کی عجلت اور فکر...... سب کچھ وہ فراموش کر چکا تھا...... بہرطور اس سے اس لڑکی کے تعاقب کرنے کا بخش علی کا خاص مقصد تھا...... اس نے موجودہ صورتحال پر تھوڑا غور کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کم از کم وہ اس لڑکی کے ٹھکانے سے تو آگاہ ہو جائے۔

دھول اڑاتے کچے رستے پر چلتے چلتے اسے سامنے اپنی سہیلی کے ساتھ جاتی تیز تیز قدم اٹھاتی وہ لڑکی نظر آ گئی تھی...... بخش علی اب نہایت محتاط ہو کر ان کے تعاقب میں تھا...... حتیٰ کہ پھر ایک کھیت کے درمیان بل کھاتی پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے بخش علی کو ایک خاصی بڑی سرخ پتھروں والی حویلی کی پختہ عمارت نظر آ ہی گئی...... وہ ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں ہو گیا اور بغور سامنے نظریں گاڑ دیں...... وہ دونوں لڑکیاں حویلی میں داخل ہو چکی تھیں...... بخش علی کے چہرے پر گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھر وہ واپس پلٹ آیا...... وہ نہ صرف اس حویلی کو بلکہ گوٹھ کو بھی ذہن نشین کر چکا تھا...... درحقیقت اس جیسے چھوٹے چھوٹے حتیٰ کہ چند گھروں پر مشتمل گوٹھوں کی یہاں خاصی

تعداد پھیلی ہوئی تھی۔

بخش علی نے اب سرعت کے ساتھ اپنا کام نمٹایا اور کار اسٹارٹ کر کے اسے ذیلی شارع پر لے آیا...... اب اس کا رخ لاڑکانہ کی طرف تھا۔



شہزادی نے حویلی پہنچ کر دم لیا...... اس کی سانس پھولی ہوئی تھی...... سدھوری اسے حیرت سے تکے جا رہی تھی۔ "سائیٹری......! کیا ہوا...... تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" بالآخر اس نے بغور اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں...... ٹھیک ہوں میں...... مگر...... مگر...... یہ...... یہ...... کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟" جواباً شہزادی نے اٹکتے ہوئے جیسے خود کلامی کے انداز میں کہا تو سدھوری متعجب ہو کر بولی۔

"کیا کیسے ممکن ہو سکتا ہے...... سائیٹری! مجھے تیری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

شہزادی کی پُرسوچ نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جم سی گئیں اور پھر وہ بھید بھرے لہجے میں دھیرے سے سدھوری سے مخاطب ہو کر بولی۔ "سدھوری......! خواب میں، میں نے جس شہزادے کو دیکھا تھا، وہ...... وہ یہی نوجوان تھا جسے ابھی ابھی ہم موئن جودڑو کے کھنڈر میں دیکھ کر آ رہے ہیں۔"

شہزادی نے اپنی بات ختم کی تو سدھوری کے حلق سے بے اختیار کھنکتی ہوئی ہنسی چھوٹ گئی...... وہ اب اپنی چہیتی سہیلی کو ایک خاص انداز سے پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی...... اگرچہ شہزادی نے یہ بات انتہائی سنجیدگی سے کہی تھی مگر سدھوری کے لئے بہرحال یہ ایک رومانی کہانی بن گئی تھی اور تب اس نے شہزادی کے چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

"بہانے کیوں بناتی ہے تُو...... سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی کہ تجھے سوہنے چھوکرے سے عشق ہو گیا ہے؟"

سدھوری اس کی رازدار اور بے تکلف سہیلی تھی...... اس کی بات سے شہزادی کا چہرہ مارے حیا کے گلگوں ہو گیا مگر پھر فوراً ہی اس کے دلکش چہرے پر سوگواری کھنڈ آئی۔

سدھوی بغور اس کے چہرے پر نظریں گاڑے شہزادی کی کیفیت دروں کا اندازہ

لگانے کی سعی کر رہی تھی...... اس کے نسوانی وجدان نے خطرے کا الارم بجا دیا تھا کہ اس کی سہیلی اچانک ہی کسی اجنبی پردیسی سے دل لگا بیٹھی ہے مگر سدھوری، شہزادی کی خواب والی اہم بات فراموش کر چکی تھی جبکہ شہزادی کو سو فیصد اس بات کا یقین تھا کہ اس نے جاگتی آنکھوں سے موئن جودڑو کے کھنڈرات کے پاس جس نوجوان کو دیکھا تھا، ہو بہو یہ وہی دراوڑی شہزادہ تھا جس کے ساتھ خواب میں وہ سیر کر رہی تھی نہ صرف یہ بلکہ وہ اس من موہنے اور پُر وجاہت شہزادے کے عشق میں بھی مبتلا ہو چکی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار شہزادی کا دل اس خوابوں والے شہزادے کی طرف کھنچا جاتا تھا اور یہی نہیں جب شہزادی خواب سے بیدار ہوئی تو کافی دیر تک اس کا دل مہجور اور اداس رہا تھا، اس خواب کے بعد سے وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کا دل زیادہ گھبرانے لگا تو وہ اپنی عزیز سہیلی سدھوری کے ساتھ اس کا دل موئن جودڑو کے کھنڈرات کی سیر کرنے کو چاہا تھا...... وہاں جب اس نے اپنی کھلی آنکھوں سے ایک خوبرو نوجوان کو دیکھا تو جیسے اس کے دل کی دنیا تلپٹ ہو گئی۔

وہ شہزادوں کی سی وجاہت جیسا من موہنا چہرہ کیسے بھلا سکتی تھی...... یہ بالکل وہی شہزادہ تھا جسے شہزادی نے خواب میں دیکھا تھا، اسے دیکھ کر شہزادی کو اپنے دل بے طرح و بے قرار پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جلدی سے لوٹ آئی تھی۔

مگر اب اسے پھر ایک بے نام سی اُداسی نے آلیا تھا۔

سدھوری واپس جا چکی تھی۔

شہزادی کے دل و دماغ کے مناظر بدل گئے تھے...... وہاں اب ایک ہی منظر جیسے جامد ہو کر رہ گیا تھا، کھوئی کھوئی اور عمیق سوچوں میں غلطاں شہزادی معاً چونکی...... اسے اچانک یاد آیا کہ اسے دیکھ کر اس نوجوان کی بھی کیفیت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی جیسی کہ خود اس کی اسے دیکھ کر ہوئی تھی...... اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی تھی۔

''کیا اس نے بھی اس طرح کا کوئی خواب دیکھا تھا......؟'' شہزادی کے دماغ میں معاً یہ سوال ابھرا تھا۔

اسی لمحے اس کے دروازے پر آہٹ ابھری...... ایک چالیس پینتالیس سالہ عورت زرق برق لباس میں اندر داخل ہوئی...... یہ حسنہ خاتون تھی...... شہزادی کی ماں...... سرخ

و سپید رنگت اور جسم فربہی مائل...... چہرے پر ہر سمے دبدبہ طاری رہتا تھا مگر اس وقت اس کے چہرے پر ممتا کے سائے رقصاں تھے...... شہزادی اپنے خیالات سے چونکی اس وقت جب اس نے بڑی ممتا بھری حلاوت سے کہا۔

''دھی رانی......! کیا سوچ رہی ہے تُو......؟''

''جج...... جی...... کچھ نہیں...... امڑ......! بس...... ایسے ہی ذرا......'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

حسنہ خاتون چہرے پر ممتا بھری مسکراہٹ لئے اس کے قریب آئی تو شہزادی کو ممتا کی سوندھی خوشبو نے بے اختیار ماں کی طرف کھینچا...... وہ بڑی محبت اور لاڈ کے ساتھ ماں کے بازو سے لگ کر اپنا گال ملنے لگی...... حسنہ خاتون رسان کے ساتھ بیٹی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

''کیا بات ہے دھیئے...... کوئی گڑتی (پریشانی) ہے تجھے......؟'' ماں نے ملائمت سے پوچھا۔

جواباً شہزادی خاموش رہی...... اس کی آنکھیں نمناک تھیں جنہیں وہ چپکے چپکے اپنے پلو سے پونچھتی جا رہی تھی...... تب حسنہ خاتون کو بیٹی کے وجود میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی...... اب کی باران کے چہرے پر بھی تشویش کے سائے لرزے۔

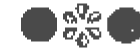
اس نے آہستگی سے شہزادی کا چہرہ دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں...... حسنہ خاتون کے دل کو جھٹکا سا لگا...... شہزادی ان کی اکلوتی بیٹی تھی، اسے چھینک بھی آتی تو سب پریشان ہو جاتے...... حکیم یا ڈاکٹر آن کی آن میں حویلی بلا لئے جاتے۔

بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ بہ یک ترت گہری تفکیر و پریشانی سے بولی۔ ''دھی رانی......! کیا ہوا...... کیوں روتی پڑی ہے تُوں......؟''

اپنی کیفیت پر شہزادی کو خود اچنبھا ہوا...... وہ خود حیران تھی کہ یہ اسے یکدم کیا ہو گیا تھا...... وہ کیوں اچانک گلوگیر اور آزردہ ہو گئی تھی، اتنی کہ ماں کی موجودگی کا بھی خیال نہ آیا...... تب وہ ماں کی بات پر قدرے چونک کر اور اس سے ذرا الگ ہوئی پھر جلدی جلدی اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی اور چور سی نگاہوں سے اپنی ماں کو بھی دیکھنے لگی...... اس کا دل جانے کیوں ایک دم گھبرا گیا تھا...... حسنہ خاتون کو اپنی جوان

اور خوبصورت بیٹی کا یہ عجیب و غریب بھیدوں بھرا انداز تفکر آمیز ایک عجیب سے گماں میں مبتلا کرنے لگا تھا۔

''امڑ......! میں ٹھیک ہوں......بس ذرا سر میں درد ہو رہا تھا...... دوا کھائی تھی میں نے...... اب تھوڑا آرام ہے......سو جاؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر شہزادی لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ جہاندیدہ حسنہ خاتون بغور بیٹی کے محبوب چہرے کو تکنے میں محو تھی......اس کے پُرسوچ چہرے پر اب پریشانی کے آثار مزید گہرے ہونے لگے تھے۔



''اڑے بابا مٹھو......!'' اونچی چھت والی ایک خاصی کشادہ اوطاق کے وسط میں رلی بچھی لمبی چوڑی نقشین اور موٹے پایوں والی چارپائی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقہ گڑگڑاتے ہوئے نیم دراز ایک بھاری تن و توش اور گھنی داڑھی، مونچھ والے شخص نے بارعب انداز میں قریب کھڑے رجسٹر تھامے دبلے پتلے منشی مٹھو ماچھی کو مخاطب کیا تو وہ فوراً مستعدی سے بولا۔

''حاضر سائیں وڈا......!''

''اڑے بابا ساٹھی تیار ہے......کتنا کام ہو چکا ہے؟'' یہ بارعب آواز والا وڈیرا مشوری خان تھا۔

''سائیں بھوتار......! تین سو جریب کی ساٹھی (سیمنٹ کے پتھر پر چاولوں کی کٹی ہوئی فصلوں کو دھوبی پٹے کی طرح پیٹا جاتا ہے تاکہ پھونس علیحدہ ہو جائے) ہو چکی ہے، باقی پر ''رھاک'' (کسان) مصروف ہیں۔''

''ھالا......!'' وڈیرے نے گمبھیر کھنکاری بھر کر مختصراً کہا پھر لحظہ بھر توقف کے بعد دوبارہ تاکیداً بولا۔ ''ان رھاکوں کو پہلے سے بتا دینا کہ فصل اترتے پر ڈھل (ٹیکس، لگان)، بیج، کھاد انہی لوگوں کو بھرنا پڑے گا۔''

''ہاؤ سائیں وڈا! انہیں پہلے سے معلوم ہے...... بھلا کسی میں جرأت ہے کہ آپ کے حکم کے آگے دم ماریں۔'' منشی مٹھو ماچھی نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ اس کی سرنگت انتہائی خاکستری تھی اور چہرے سے ہی وہ ایک حریص انسان نظر آتا تھا۔

''اور اس بار ان لوگوں کو آدھی فصل سے کم اناج ملے گا...... بتا دینا...... اس مرتبہ

ہمیں وارے کا پانی کم ملا تھا۔'' وڈیرے نے دوبارہ رعونت سے کہا۔

''برابر سائیں بھوتار......!'' منشی نے کمینگی سے دیدے مٹکائے۔

''اگر کوئی کندھار خان (تیس مار خان) بننے کی کوشش کرے تو مجھے بتانا...... ہم اسے اچھی طرح مزہ چکھائیں گے۔'' وڈیرے مشوری خان کے لہجے میں حد درجہ سفاکی تھی۔

''آپ گرتی (فکر) ہی نہ کرو اس کی سائیں وڈا!'' منشی اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپڑیں سارے رھاکوں کو میں نے قرضوں کے پتھر تلے اتنا دبا دیا ہے کہ کسی کو اعتراض کرنے کی ہمت ہی نہ ہوگی۔''

اس کی بات سن کر وڈیرے مشوری خان کے چہرے پر گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی۔



شہزادی اپنے دونوں بڑے بھائیوں رستم خان اور وزیر خان سے ہمیشہ خائف رہتی تھی...... انہیں اپنی بہن شہزادی کا ایک کم تر چھوکری سدھوری کے ساتھ آزادانہ گھومنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، اکثر دونوں بھائی شہزادی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے رہتے تھے مگر چونکہ شہزادی کو اپنے باپ کی حمایت حاصل تھی اسی لئے دونوں محض دانت پیس کر رہ جاتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہی تھی کہ وڈیرا مشوری خان اپنے ان دونوں جوان بیٹوں کو اپنا بازو سمجھتا تھا، دونوں ہی بھائی اکھڑ مزاج تھے، اس میں کوئی شک نہ تھا...... غریب ہاری اور رھاک...... وڈیرے سے زیادہ اس کے انہی دونوں بیٹوں سے خوف زدہ رہتے تھے۔

اس دن جب ان دونوں نے اپنی بہن شہزادی اور اس کی سہیلی سدھوری کو موئن جودڑو کے کھنڈرات کی سیر سے واپس آتے دیکھا تو کھول اٹھے...... اس مرتبہ انہوں نے اپنی بہن کو آڑے ہاتھوں لینے کی بجائے اصل محرک پر ہاتھ ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔

لہٰذا جب سدھوری، شہزادی سے رخصت ہو کر حویلی سے باہر نکلی اور چاولوں کے کھیتوں کے درمیان بنے ڈھول اڑاتے کچے راستے پر چلی جارہی تھی تو رستم خان اور وزیر خان اپنی بغیر ہڈ والی پاور لائٹس جیپ دوڑاتے ہوئے اس کے پیچھے ہو لئے اور پھر اس کے قریب پہنچ کر انہوں نے زور سے بریک لگائے۔

بھربھری مٹی کا ایک بگولا فضا میں بلند ہوا، جس نے بے چاری سدھوری کو بھوت بنا کر رکھ دیا...... وہ یکدم ہراساں ہوگئی اور گرد وغبار کی لپیٹ میں آ کر بے اختیار کھانسنے لگی...... دونوں بھائی اپنے چہروں پر خشونت طاری کئے جیپ سے اتر آئے۔

گرد وغبار کے مرغولے چھٹتے ہی سدھوری کی نگاہ ان دونوں پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو ڈر سی گئی...... وہ دونوں اس کے ہراساں چہرے پر اپنی برماتی ہوئی خونخوار نظریں گاڑتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ پھر رستم خان نے کرختگی سے سدھوری کو مخاطب کر کے کہا۔

’’اڑی چھوکری......! اپنی اوقات میں رہ...... ایسا نہ ہو کہ کہیں تو اس کے بھی قابل نہ رہے۔‘‘

رستم خان کے تنبیہی لہجے نے بے چاری غریب سدھوری کو سرتاپا لرزا کر رکھ دیا۔

پھر وزیر خان نے بھی سدھوری کو سرتاپا گھورتے ہوئے خشمگیں لہجے میں دھمکایا۔

’’تیرے جیسی غریب چھوکریوں کے دھندوں سے ہم اچھی طرح واقف ہیں...... کسی امیر زادی سے دوستی لگانے کا مقصد تمہارا اپنا پیٹ بھرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔‘‘

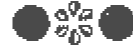
سدھوری ان دونوں کے بیچ گھری خوف سا محسوس کر رہی تھی مگر وزیر خان کی استہزائیہ گفتگو نے ایک لمحے کو اس کی عزتِ نفس کو مجروح کر کے رکھ دیا اور دل میں اب خوف کی بجائے احساسِ ذلت نے لے لی تھی۔ مگر وہ بے چاری مہر بہ لب ہی کھڑی رہی۔

وہ دونوں شکروں کی طرح اب اس کے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے تھے، ان کی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیضوں کے ساتھ بغلی ہولسٹر جھول رہے تھے اور اجرک پوش کاندھوں پر ڈبل بیرل بندوقوں کی سفاک آہنی نالیں جھانک رہی تھیں۔

بالآخر رستم خان نے ایک جھٹکے سے اپنے کاندھے سے جھولتی بندوق اتار کر ایک ہوائی فائر کر دیا۔

فضا میں کارتوس کے دھماکے اور سدھوری کی اضطراری چیخ گونجی اور پھر سناٹا چھا گیا...... سدھوری کا دل لرز اٹھا تھا اور کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے...... اس نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ دیئے تھے۔

’’اگر ہم نے تجھے پھر اپنی بہن کے ساتھ دیکھا تو یاد رکھ تجھے نہیں بلکہ تیری عزت کو اس کارتوس کی طرح اُڑا کر اچھال دیں گے، سمجھی......!‘‘ رستم خان نے کہا اور پھر اپنے بھائی کو اشارہ کیا۔ پھر وہ دونوں سدھوری کو خونیں نظروں سے گھورتے ہوئے جیپ میں جا سوار ہوئے۔



سدھوری گھر پہنچی تو اس کا پورا دماغ سُن ہو چکا تھا۔ دل خوف کے مارے ساکت تھا اور پورا وجود ہنوز کسی برگ خزاں رسیدہ کی طرح لرزیدہ تھا...... ایک انجانے خوف کے احساس تلے مجروح سی ہوگئی تھی...... وہ منتشر اور بکھری بکھری سی گھر کے اندر داخل ہوئی تو ذرا ٹھٹک سی گئی۔

صحن میں دور لی بچھی چارپائیوں پر اس کی ماں اور سوتیلا باپ دادن ایک ادھیڑ عمر اجنبی شخص کے ساتھ محوِ گفتگو تھے...... مذکورہ شخص گینڈے کی جسامت کا تھا...... اس نے سفید لٹھے کی شلوار قمیض پر اجرک اور سر پر ننھے منے شیشوں کے کام والی سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی...... اس کا سیاہ رو چہرہ لمبوترا اور انتہائی بد ہیئت تھا...... سدھوری کو دیکھ کر ان تینوں کو ایک دم سانپ سونگھ گیا اور وہ خاموشی سے اسے گھورنے لگے...... سدھوری اپنی ابتر حالت پر قابو پاتی نظریں چراتی ہوئی اپنی کوٹھڑی میں آ گئی۔

اب وہ خود پر بتدریج قابو پانے لگی تھی...... اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب ایک نئی اور گنبھیر کیفیت سے دوچار ہونے لگی تھی کیونکہ ابھی ذرا دیر پہلے اس نے صحن میں اپنے ماں، باپ کے ساتھ محوِ گفتگو جس بد رو شخص کو دیکھا تھا، وہ اسے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکی تھی...... وہ بڑے دھڑلے کے ساتھ ان کے گھر آن ٹپکتا تھا...... جب اس کا سوتیلا باپ دادن گھر میں نہ ہوتا اور صرف اس کی ماں خیراں اور وہ خود بھی موجود ہوتی تھی...... کئی بار سدھوری نے اس سیاہ رو شخص کو اپنی جانب بھی گھورتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

اس کا نام لانقو تھا...... وہ ایک بھٹے کا مالک تھا...... سدھوری کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا تاہم اس بدبخت لانقو کی بار بار آمد نے اسے ایک عجیب سی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا...... لانقو کی بے دھڑک اور بے سبب آوک جاوک خالی از علت نہ تھی...... سدھوری نے اکثر ماں کو اس کے سامنے لانقو کی بلاوجہ ہی تعریفیں کرتے سنا تھا۔

سدھوری نے اپنی کوٹھڑی کے بند دروازے سے آنکھ چپکا دی۔

باہر صحن میں اسے لاکھو اب رخصت ہوتا دکھائی دے رہا تھا پھر سدھوری نے اسے کہتے سنا...... وہ قدرے بھاری لہجے میں اس کے ماں باپ سے کہہ رہا تھا۔

"اب میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا...... میرے دو چھوٹے چھوٹے بالک ہیں...... مجھے اب دو ایک روز میں جواب چاہئے ورنہ میرا حساب صاف کر دو...... میں کوئی اور در دیکھوں۔" سدھوری نے دیکھا لاکھو کی بات سن کر اس کے ماں باپ کا چہرہ اتر سا گیا۔ وہ فوراً ہی اس کی خوشامد پر اتر آئے، بولے۔

"لاکھو سائیں...... تھوڑا ماٹھ (صبر) تو کرنا پڑے گا ناں...... بابا...... آخر تیرے کو جوان چھوکری کا سنگ مل رہا ہے...... اتنی تکڑ (جلدی) اچھی تو نہیں ہوتی ناں......"

"میں تکڑ کر رہا ہوں......؟" لاکھو کے لہجے میں برہمی اور حیرت تھی۔ "اڑے بابا! چار مہینوں سے ماٹھ (صبر) ہی تو کر رہا ہوں...... اگر جوان چھوکری کا سنگ (رشتہ) مجھے مل رہا ہے تو اس کا مول بھی تو تم نے تگڑا وصول کیا ہے مجھ سے......" اس کی آواز بلند ہو گئی تھی...... سدھوری نے دیکھا، اس کے ماں باپ پریشان سے ہو کر اس کی کوٹھڑی کی طرف تکنے لگے۔ شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اندر موجود سدھوری کے کانوں تک باتوں کی بازگشت کس حد تک پہنچ رہی ہو گی۔ تاہم انہوں نے کسی طرح لاکھو کو منت سماجت اور تسلیاں دے کر وہاں سے رخصت کیا اور دونوں متفکر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

سدھوری اب دروازے سے ہٹ گئی تھی...... اس کے دل میں ایک دھکڑ پکڑ ہونے لگی...... لاکھو سے متعلق اس کے دل و دماغ میں اندیشوں کی یلغار اب شک و شبے سے بالاتر ہونے لگی تھی...... اسے حالات کی چیرہ دستیوں کا ادراک ہونے لگا تھا۔ کچھ بھی تھا، ان لوگوں کی معنی خیز گفتگو سے سدھوری کو یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہ لگی تھی کہ اس کا حاصل مراد درحقیقت اس کی اپنی ہی ذات تھی۔

بالآخر یہ قلعی بھی اس رات کھل گئی۔

سدھوری تنہا اپنی کوٹھڑی میں کھانا کھایا کرتی تھی...... کھانا کیا ہوتا، بڑی سی جست کی پرات نما تھالی میں تھوڑے ابلے ہوئے چاول اور پتلی دال، پودینے کی چٹنی لئے اپنے

کمرے میں آ جاتی تھی، آج اس سے کھانا بھی پوری طرح نہیں کھایا گیا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ بیک وقت وہ دگرگوں سے حالات کی زد میں آ گئی تھی...... ایک طرف آج شہزادی کے دونوں بھائیوں کی دھمکی ہنوز اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی تو دوسری طرف وہ اپنے ماں باپ کی خفتہ کارستانیوں پر پریشان تھی مگر اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ جو اس کی ماں چاہتی ہے، کسی بھی صورت میں اس کی بات نہیں مانے گی کیونکہ سدھوری نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ دونوں اسے لاکھو کے پلے باندھنے کا منصوبہ بنانے میں سرگرم تھے اور قرائن سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے لاکھو سے اس سلسلے میں بھاری معاوضہ وصول کر لیا تھا۔

بہرطور وہ ابھی چارپائی پر لیٹی ہی تھی...... دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری...... وہ چونکی...... دروازہ کھلا تھا...... اس کی ماں خیراں اندر داخل ہوئی۔

اس کمرے میں مدھم روشنی تھی...... سدھوری دانستہ سوئی بن گئی...... اس کا دماغ گرم ہونے لگا تھا...... وہ ماں کی آمد کا مقصد اچھی طرح جانتی تھی۔ اندر آ کر خیراں نے لالٹین کی روشنی تیز کر دی...... سدھوری نے آنکھیں موندے ہی موندے باریک جھری بنا کر دیکھا...... اس کی ماں کے ہاتھوں میں ایک پلیٹ تھی جس کی وجہ سے کوٹھڑی میں خوشبو سی پھیل گئی تھی...... یہ سوجی اور بیسن کا حلوہ تھا جو وہ سدھوری کے لئے لے کر آئی تھی...... یہ حلوہ سدھوری شوق سے کھاتی تھی مگر اس وقت اسے یہ بھی زہر لگا...... دفعتہً اس کے کانوں سے ماں کی آواز ٹکرائی۔

"اڑی گودی......! (پیاری) تو آج اتنی جلدی سو گئی؟"

سدھوری نے کوئی توجہ نہ دی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ یوں آنکھ بند کرنے سے کوئی بلا نہیں ٹلتی...... اس کا سامنا کرنا چاہئے...... یہ سوچ کر وہ چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

خیراں اس کے سر پر پیار سے ہاتھ دھرتے ہوئے قریب ہی پائینتی پر بیٹھ گئی۔

"لے...... یہ حلوہ کھا...... تجھے پسند ہے ناں بہت...... تیرے لئے ہی بنایا ہے میں نے......" وہ ٹرے سدھوری کے آگے کرتے ہوئے ممتا سموئے بولی۔

سدھوری کا جی تو نہ چاہا مگر یہ سوچ کر کہ اس وقت اس کی ماں جو خاص بات اس

سے کہنے آئی تھی، وہ جلد بتا ڈالے...... اس نے پلیٹ لے لی اور یونہی دکھاوے کی خاطر ایک دو چمچ کھائے پھر بولی۔ ”بس امڑ......! تُو جا...... بھلے آرام کر...... میں یہ بعد میں آہستہ آہستہ کھا لوں گی۔“

”اچھا...... اچھا...... کھا لینا...... میں بھی چلی جاؤں گی۔“ ماں لہجے میں اپنائیت سی طاری کرتے ہوئے بولی۔ پھر وہ توقف کر کے ازراہِ محبت اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”دھیئے......! تُو مجھ سے جتنی چاہے نفرت کر لے، پر رہے گی تو تُو میری بیٹی ہی ناں...... تیرا بھلا آخر کو میں نے ہی سوچنا ہے، اسی طرح تیری ذمہ داری بھی میرے ہی ذمے ہے...... چاہتی ہوں یہ بھی خیر سے اتر جائے تو میں بھی سکون سے مر جاؤں۔“

ماں کی بات سن کر سدھوری نے چونک کر اس کے روہانسے چہرے کی طرف دیکھا...... اسے ماں کے چہرے کے تاثرات سے ہی نہیں بلکہ گفتگو سے بھی جھوٹ اور مکر ٹپکتا نظر آیا۔

جان تو وہ گئی تھی کہ ماں اس کے پاس کس مقصد کی خاطر آئی تھی اور برسوں کی سوئی ہوئی ممتا آج اچانک کیونکر بیدار ہو گئی تھی...... یہ وہ سب جانتی تھی مگر جواباً اس نے بھی ڈھکے چھپے استہزائیہ لہجے میں ماں سے کہا۔

”امڑ گودی......! تُو میری گڑتی (فکر) نہ کر...... ویسے بھی ابھی تیرے مرنے کے دن کہاں ہیں...... ابھی تو تُو نے دادن کے بچوں کی ماں بننا ہے۔“

سدھوری کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ اس کی ماں خیراں یکدم بھڑک اٹھی...... آناً فاناً اس کے چہرے سے ممتا بھری حلاوت معدوم ہو گئی اور چہرہ آتش فشاں کی مانند بھڑ کنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے حیرت انگیز طور پر خیراں نے اپنی ابلتی بھڑکتی کیفیت پر قابو پا لیا پھر قدرے توقف کے بعد بڑے رسان سے بولی۔

”دھیئے......! میری بات مان لے تو بہت سکھی رہے گی اور میرا خیال ہے تو یہاں ہمارے پاس خوش رہنے کی بجائے آپڑیں سسرال میں زیادہ سکھی اور خوش رہ سکتی ہے کیونکہ تُو نے ابھی تک دادن کو آپڑاں پیو (باپ) قبول نہیں کیا ہے اور...... اور مجھ سے بھی تیرا دل خراب ہو چکا ہے...... اب تُو خود ہی بتا بھلا یہ اچھا نہیں ہے کہ تُو جلد سے

جلد آپڑیں گھر کی ہو جائے۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش نظروں سے سدھوری کا چہرہ تکنے لگی۔

سدھوری نے اک نگاہِ نفرت ماں پر ڈالی مگر منہ سے کچھ نہ بولی...... درحقیقت اسے ماں کی دوسری شادی پر اتنا غصہ نہ تھا جتنا اس بات پر تھا کہ جب سدھوری کا بیمار باپ کوٹھڑی میں پڑا کھانستا رہتا تھا اور اس کی ماں دوسری کوٹھڑی میں دادن کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہوتی تھی...... ان سب باتوں کے باوجود بھی سدھوری نے کیسے خود کو سنبھالا ہوا تھا، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا...... اسے ایک طرح سے ماں کی یہ بات بھی درست ہی محسوس ہوئی تھی کہ اس کا ان دونوں کے بیچ رہنا اسے مزید ذہنی طور پر بیمار کر سکتا تھا مگر سدھوری کو خاموش پا کر اس کی ماں دوبارہ بولی۔

”دیکھ دھیئے......! تُو اگر ہاں کر دے تو ایک بڑا ہی گبھرو جوان ہے ہماری نظر میں...... بہت پیسے والا ہے...... بڑے سے بھٹے کا مالک ہے...... بہت راج کرے گی...... تیرے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔“ ماں تعریف کر رہی تھی اور سدھوری کے اندر پھر آتش غیظ سلگنا شروع ہو گئی تھی...... اس نے سردست خود پر قابو پا رکھا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ تعریفوں کے یہ پل لالقو کے سوا اور کسی شخص کے لئے نہیں باندھے جا رہے تھے...... سدھوری نے ایسے ہی پوچھا۔

”وہ ناں (نام) کیا ہے اس کا......؟“

”لالقو......!“ ماں جیسے امید سی پا کر یکدم بولی۔ ”وہی ناں جسے تُو دیکھتی ہے...... گھر بھی آتا ہے۔“ ماں نے جملہ مکمل کیا۔

سدھوری کے تن بدن میں آگ لگ گئی...... وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ انتہائی زہرناک لہجے میں بولی۔

”لالقو کو تو میں نے بہت مرتبہ گھر میں دیکھا ہے...... بالکل اس طرح جیسے دادن آیا جایا کرتا تھا...... میں سمجھی شاید اب تیرا دل دادن سے بھی بھر گیا ہے اور اب یہ لالقو تیری خاطر......“

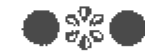
”بکواس بند کر ڑی چھوکری...... ورنہ منہ توڑ دوں گی تیرا......“ بیٹی کی زہر افشانی پر خیراں غصے سے کانپنے لگی اور ایک جھٹکے سے چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی...... اس کی

شعلہ اگلتی آنکھیں سدھوری کے چہرے پر گڑسی گئی تھیں۔

ماں کو سراپا غیظ و غضب میں مبتلا دیکھ کر سدھوری کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی جیسے وہ ماں کی ابلتی کھولتی ہیئت کذائی سے حظ اٹھا رہی ہو...... درحقیقت وہ چاہتی بھی یہی تھی۔ کیونکہ اسے اپنی ماں سے انتہائی نفرت تھی...... اپنے محنت کش شوہر سے بے وفائی کرنے کے بعد اب وہ اپنی بیٹی کو بھی روپوں کے بدلے ایک شادی شدہ رنڈوے اور بچوں والے دگنی عمر والے شخص کے ساتھ اسے بیاہنا چاہ رہی تھی۔

”تیرا اب کوئی اور ہی بندوبست کرنا پڑے گا...... دادن ٹھیک ہی کہتا ہے کہ تجھے......“ خیراں نے غصے سے سدھوری کو گھور کر کہا اور پھر الفاظ اس کے منہ میں گھٹ گئے۔

”کیا کہتا ہے دادن...... بول...... کیا کہتا ہے وہ بے غیرت مردود شخص......“ سدھوری کو بھی غصہ آ گیا اور وہ عالم طیش میں چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ماں کے مقابل کھڑی ہو گئی...... ماں نے ایک زوردار تھپڑ سدھوری کے گال پر رسید کر دیا...... ماں کے سخت اور شرمناک انداز اور مزاج نے ایک تو پہلے ہی سدھوری کے مزاج میں سرکشی اور گستاخی بھر دی تھی، اب ماں کے ہاتھ اٹھانے پر سدھوری بھی آپے سے باہر ہو گئی۔ اسی دوران دادن جو شاید دروازے سے کان لگائے کھڑا جانے کب سے ماں بیٹی کی گفتگو سننے میں مگن تھا، حالات مخدوش پاتے ہی اندر آ گیا۔ اگر وہ دونوں کے درمیان نہ آتا تو یقیناً ماں بیٹی کے درمیان ہاتھا پائی کی نوبت بھی آ جاتی۔



اس دن کے بعد سے تو بخش علی کا قرار ہی لٹ گیا تھا۔ وہ ڈوکری (موئن جودڑو) سے لاڑکانہ اپنے گھر تو خیریت سے پہنچ گیا تھا مگر اس کا دل و دماغ اب اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا حتیٰ کہ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسے اگلے دن علی الصباح آرڈر لینے گڑھی ٹلیین بھی جانا تھا...... وہ ساری رات موئن جودڑو کے پُر فریب ماحول میں بیتی اس اندھیری اور بھیدوں بھری رات کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

اس پر گویا شب گزیدگی سی طاری ہو گئی تھی...... شہزادی کے پیکر حُسن و جمال کا تصور اس کے دل و دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا اور وہ ”دوبارہ دیکھنے کی ہوس“ میں مبتلا ہو گیا

تھا...... ماں اور چھوٹی بہن بھاگی نے بھی بخش علی کو خلافِ معمول گم صم اور متفکر سا پایا مگر اس کا اظہار نہیں کیا تھا...... وہ اس کی خاموش پریشانی کو اس کی پیشہ ورانہ مصروفیت پر محمول کر کے خاموش ہو گئی تھیں۔

ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ بخش علی کا دل بے چینی و بے قراری کی آخری حدود کو چھونے لگا اور پھر اس کے جی میں نجانے کیا فرزانگی سمائی کہ وہ ایک دن اپنی انگوری رنگ کی کار میں بیٹھا اور کشاں کشاں ڈوکری (موئن جودڑو) کی طرف روانہ ہو گیا...... وہ اپنی اس کیفیت پر خود بھی حیران تھا...... اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بڑا لئے دیئے رہنے والا شخص تھا...... صرف اپنے کام سے کام رکھتا تھا...... پہلے کبھی اس قسم کے ذہنی ہیجان یا ایسی کسی بھی جذباتی کیفیت سے نہیں گزرا تھا۔

لگ بھگ پون گھنٹے بعد وہ موئن جودڑو کے سوگوار کھنڈرات کے سامنے موجود تھا...... تیز مگر خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور موسم بھی زیادہ سرد نہ تھا...... بخش علی نے کار میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک نگاہ سامنے کھنڈرات پر ڈالی، اس کے بعد رسٹ واچ میں وقت دیکھا، دن کے بارہ بج چکے تھے۔ پھر جانے کیا سوچ کر اس نے کار ایک دھول اڑاتے اور نسبتاً تنگ کچے راستے پر اتار دی۔

یہ راستہ شہزادی کے گوٹھ کی طرف جاتا تھا جس کا ایک دن وہ خود پیچھا کرتا ہوا اس کی حویلی تک پہنچ گیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے...... وہ اپسرا...... اس زہرہ جبیں سے اس کا بھلا کیا تعلق ہے...... وہ کس حیثیت سے اس سے ملنے جا رہا ہے؟

مگر بخش علی کو جب وہ پُراسرار خواب اور شہزادی کا اس کی طرف دیکھ کر چونکنا اور پھر دونوں کی نگاہوں کا قربت کی منازل طے کرتے ہوئے پل بھر میں صدیوں کے فاصلے طے کرنا یاد آیا تو وہ اسیر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

وہ دونوں اب اجنبی نہیں رہے تھے بلکہ شاید وہ تو کبھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے ہی نہیں...... انہی خیالات میں غلطاں اچانک بخش علی کی نگاہ سامنے پڑی اور غیر ارادی طور پر اس کا پاؤں بریک دباتا چلا گیا...... کار کے ٹائر جامد ہو گئے...... گرد و غبار کا مرغولہ سا بلند ہوا اور تھوڑی دیر بعد بخش علی چہرے پر بیک وقت حیرت اور خوشی لئے

دروازہ کھول کر کار سے نیچے اتر آیا...... اس کی یک ٹک نظریں اس پری وش اپسرا کے رخ روشن پر جم کر رہ گئی تھیں۔

وہ شہزادی تھی...... اس کی سہیلی سدھوری بھی حسب معمول اس کے ساتھ تھی...... شہزادی بھی بخش علی کو دیکھ کر اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر چلتے چلتے رک کر کھڑی ہو گئی تھی...... اس کے قریب کھڑی سدھوری کے چہرے پر قدرے استعجاب اور ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ طاری تھی۔

بخش علی اور شہزادی نگاہوں کی غیر مرئی ڈور سے بندھے بندھے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے...... بخش علی، شہزادی کی کین جھر جیسی آنکھوں میں ڈوبنے لگا اور شہزادی، بخش علی کی نظروں سے گھائل ہونے لگی...... دونوں کی نگاہوں کے سامنے محبت و اُلفت کے دیوان وا ہونے لگے اور پھر جیسے بخش علی نے اپنا حالِ دل بے اختیار شہزادی کے سامنے کھول ڈالا۔

میں عشق دوست میں ہر دم درون نار رقصاں ہوں
کبھی ہوں خاک پر غلطاں کبھی برخار رقصاں ہوں
میں ہوں بدنام اس کے عشق میں اے پارسا لیکن
مجھے کیا خوف رسوائی بہر بازار رقصاں ہوں
ادھر اے مطرب ساقی سماع ذوق گرما دے
خوشی میں وصل جاناں کی قلندر وار رقصاں ہوں
ملامت کرتی ہے ہر دم اگر خلقت تو کرنے دو
ہوں اپنے ذوق پر نازاں کہ پیش یار رقصاں ہوں

(حضرت لعل شہباز قلندرؒ)

دل سے نکلے ہوئے محبت کے یہ اشعار امرت بن کر شہزادی کے دل پر برسات بن کر ٹپک رہے تھے...... شہزادی کے دل و دماغ میں "میرے سرتیجن...... میرے سرتیجن" کی گردان ہونے لگی تھی۔

سدھوری دونوں کو ایک دوسرے میں کھویا دیکھ کر ورطۂ حیرت میں مبتلا تھی۔

فضا ساکت تھی...... لمحے جیسے رک گئے تھے...... وقت جیسے تھم گیا تھا۔

اچانک دم بخود فضا بندوق چلنے کی آواز سے لرز اٹھی، ساتھ ہی سدھوری کے حلق سے بڑی کریہہ چیخ خارج ہوئی۔ جس نے بھی گولی چلائی تھی، بلاشبہ اس کا نشانہ سدھوری ہی تھی...... وہ گولی کھا کر تیورا کر گری تھی۔ ادھر شہزادی خوف زدہ ہو کر بے اختیار بخش علی کے قریب آ گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے سامنے نظر پڑتے ہی اس کی روح فنا ہو گئی۔ پھر وہ تڑپ کر بخش علی سے دور ہو گئی۔

سامنے اس کے دونوں بھائی رستم خان اور وزیر خان اپنی بندوقیں سیدھی کیے قہر آلود نظروں سے ان دونوں کو گھور رہے تھے۔

سدھوری کے چہرے پر تکلیف سے زیادہ دہشت ناکی طاری تھی...... گولی اس کی دائیں ٹانگ کی پنڈلی پر لگی تھی اور وہ زمین پر پڑی اپنی خون آلود ٹانگ پر ہاتھ رکھے اذیت کے مارے کراہ رہی تھی اور ساتھ ہی پھٹی پھٹی وحشت ناک نگاہوں سے بندوقیں تانے سامنے کھڑے رستم خان اور وزیر خان کو بھی تکے جا رہی تھی۔

وہ دونوں اب جیسے سدھوری کو بھلا کر قہر آلود نظروں سے اپنی بہن شہزادی اور اس اجنبی یعنی بخش علی کو گھور رہے تھے...... شہزادی کی بڑی بڑی آنکھوں میں اندیشوں کی لپک تھی جبکہ اس کے قریب کھڑے بخش علی کے چہرے سے بھی پریشانی مترشح تھی۔

ادھر رستم اور وزیر خان کے چہرے غصے اور جوش غیظ کے مارے سرخ ہوتے جا رہے تھے۔ تب رستم نے اپنی بندوق چند قدم کے فاصلے پر سامنے کھڑے بخش علی پر تان لی اور ابھی لبلبی پر اس نے اپنی انگلی رکھی ہی تھی کہ اچانک شہزادی جیسے ہوش میں آ گئی...... وہ تڑپ کر بخش علی کے سامنے آ گئی۔

یہ دیکھ کر رستم خان کی آنکھوں میں خون کی سرخی اور گہری ہو گئی...... جی میں آئی کہ بہن کی بھی پرواہ نہ کرے اور اس اجنبی کے ساتھ اسے بھی ڈھیر کر دے۔ مگر پھر اسے اپنے باپ وڈیرے مشوری خان کا خیال آ گیا۔ یقیناً وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے اس انجام پر خوش نہیں ہوتا۔ وہ ان دونوں سے باز پرس کر سکتا تھا...... وزیر خان کا بھی یہی خیال تھا کہ غیرت کی خاطر بہن کو بھی قربان کر دیا جائے۔ جب اس نے اپنے بڑے بھائی کو متذبذب دیکھا تو اس نے فوراً بہن اور اس اجنبی کا خاتمہ کرنے کی غرض سے اپنی بندوق سیدھی کر لی۔

"نہیں ادا...... ایسا مت کرنا، یہ بے گناہ ہے...... تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" معاً شہزادی زور سے چلا کر بولی۔

تب رستم خان نے چھوٹے بھائی کو بھی فائر کرنے سے روک دیا۔ پھر وہ بہن کے چہرے پر اپنی خونیں نظریں گاڑتے ہوئے اس کے قریب آیا اور دائیں ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا...... شہزادی کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی اور وہ ایک طرف لڑکھڑا گئی۔

بخش علی کا دل شہزادی کی حالت زار پر تڑپ اٹھا۔ اس نے ابھی کچھ کہنے کے لئے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ وزیر علی بھی رستم کے ساتھ آن کھڑا ہوا اور اپنی بندوق کا کندھا اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

بخش علی کے حلق سے کراہ آمیز آواز خارج ہوئی اور وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑاتا ہوا الٹ گیا۔

ادھر دہشت زدہ سدھوری آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی پھلاہی کی جھاڑیوں کی طرف چلی گئی...... وہ پہلے ہی ان دونوں بھائیوں سے خائف تھی، اب ان دونوں کے سروں پر خون سوار تھا جس کا بخوبی سدھوری کو اندازہ تھا...... اس کی ٹانگ سے خون نکل کر بھربھری مٹی میں جذب ہوتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے اس پر اب نقاہت آمیز غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ تکلیف کی شدت کے باوجود وہ لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی...... اسے یہی خوف تھا کہ کہیں وہ دونوں بھائی اسے گولیوں سے نہ بھون کر رکھ دیں...... وہ اب اسی طرح مقدور بھر گھسٹ گھسٹ کر کہیں دور نکل جانا چاہتی تھی...... اسے اپنی سہیلی اور اس اجنبی کا عبرتناک انجام بھی صاف نظر آ رہا تھا مگر وہ افسوس کے سوا اور کیا کر سکتی تھی...... خود اس کی جان پر بھی بنی ہوئی تھی۔

پھر اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی...... اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو چکی تھی......!

ادھر بخش علی کے زمین پر گرتے ہی وزیر خان نے بخش علی کو ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا...... اس بے گناہ اور معصوم اجنبی کی اپنے ظالم بھائی وزیر خان کے ہاتھوں بنتی درگت دیکھ کر شہزادی کا دل کٹ کر رہ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر بھائی کو اس ظلم

سے روکتی، بخش علی موجودہ ماحول کے "ٹرانس" سے نکل آیا...... اس نے زمین پر لیٹے لیٹے وزیر خان کی ٹانگ پکڑ لی اور ایک زوردار جھٹکا دیا۔ نتیجتاً وزیر خان دوسری ٹانگ پر اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر آ رہا...... بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر چکی تھی...... بخش علی کو بھی غصہ آ گیا تھا...... وہ بزدلوں کی طرح پٹنے سے لڑتے ہوئے مرنا بہتر سمجھتا تھا لہٰذا اب زمین بوس وزیر خان کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ ادھر وزیر خان کے بڑے بھائی رستم خان کا غیظ وغضب آسمان کو چھونے لگا۔

وہ آگے بڑھا اور بندوق کا کندھا بخش علی کی کنپٹی پر رسید کر دیا...... بخش علی اس اچانک وار پر بلبلا اٹھا۔ اسے اپنے دماغ میں پٹاخہ چھوٹتا محسوس ہوا تھا مگر جب تک وہ سنبھلتا، رستم خان نے دوبارہ جچا تلا وار اس کے سر پر کیا...... اب بخش علی کو اپنی لرزیدہ ٹانگوں پر کھڑا رہنا دشوار محسوس ہونے لگا...... وہ اپنا سر تھامے زمین پر گر گیا۔

وزیر خان بھی جلدی سے اٹھ کر بے ہوش بخش علی پر ٹوٹ پڑا۔ ادھر اس کی بہن شہزادی کا دل خون کے آنسو رونے لگا...... اس میں دوبارہ جرأت نہیں ہوئی کہ اپنے دونوں سنگدل بھائیوں کو اس بے قصور اور نہتے اجنبی کو مارنے سے روکتی۔ مگر پھر جب اس "کار خیر" میں وزیر خان اور رستم خان دونوں ہی زمین بوس بخش علی کو لاتوں، مکوں اور بندوقوں کے آہنی اور ٹھوس دستوں سے مارے جا رہے تھے اور وہ لہولہان ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا شہزادی کا دل جیسے پھٹ پڑا۔ وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھی اور اپنے دونوں سفاک بھائیوں کو پاگلوں کی طرح اس بے ہوش اجنبی کے وجود سے پرے دھکیلنے لگی اور ساتھ ہی ہذیانی انداز میں روکتے ہوئے چلا کر بولی۔

"چھوڑ دو اسے...... اللہ سائیں کا خوف کرو...... یہ بے قصور ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں...... تمہیں اللہ کا واسطہ، مت مارو اس غریب کو......"

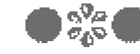
وہ دونوں بھائیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... بالآخر رستم اور وزیر خان جب تھک کر ہانپنے لگے تو انہوں نے خود پر قابو پایا پھر ایک خشونت آمیز نظروں سے بہن کی طرف دیکھا تو شہزادی نے انہیں دیکھ کر رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اللہ کا خوف کرو...... اتنے جاہل نہ بنو تم لوگ...... مجھے رب سائیں کی قسم ہم

دونوں ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں اور نہ ہی ہم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہے جس پر ہمیں شرمندگی ہو۔"

"بکواس بند کر...... چل ہمارے ساتھ...... تیرا فیصلہ اب بابا سائیں ہی کرے گا...... بڑی لاڈلی تھی ناں اس کی......!" رستم خان نے بہن کو گھورتے ہوئے قہربار لہجے میں کہا...... اس کے لہجے میں کینہ مترشح تھا۔

وہ دونوں بہن کو گھسیٹنے کے انداز میں ساتھ لے جانے لگے...... شہزادی نے ایک آخری بار زخمی نگاہوں سے پیوندِ خاک اس اجنبی دیوانے کو دیکھا اور رنجور سی ہو کر قدم آگے بڑھا دیئے۔ البتہ اس کے دل سے بے اختیار اجنبی کے لئے دعائیہ کلمات ضرور برآمد ہو رہے تھے۔



دور اُفق پر کھجی کے بلند و بالا درختوں کے جھنڈ پر دن بھر کا تھکا ماندہ سورج جیسے ستانے کے لئے ان پر ٹکا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا...... اب وہاں دھیرے دھیرے شام کجلانے لگی تھی...... سارا دن آب و دانہ کے متلاشی پرندوں کی واپس اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتی تھکی تھکی مگر ترتیب وار ڈاریں عجیب سوگوار انداز میں محوِ پرواز تھیں بلکہ یہ کہنا بہتر تھا کہ یہ پوری شام ہی سوگوار تھی۔

بخش علی گو ابھی تک اپنے زخمی وجود کے ساتھ بے سدھ ریتیلی زمین پر پڑا تھا...... اس سے ذرا دور جدھر پھلاہی کی جھاڑیوں کی بہتات تھی، اس سے ذرا پرے سدھوری ہنوز بے ہوش پڑی تھی...... اس کی پنڈلی سے نکلنے والا خون اب بہنا بند ہو چکا تھا...... اس کی وجہ یہ تھی کہ شاید بے ہوشی کے دوران یا اس سے پہلے غیر ارادی طور پر لیٹے لیٹے حرکت کرنے سے ریت خون آلود زخم پر گاچنی مٹی کی طرح چپک کر خون کے جریان کو روکنے کا باعث بنی تھی۔

اطراف میں گہرا سکوت طاری تھا۔ تب دفعتہً ہی گہری خاموشی کی اس چادر کو دور سے گونجنے والی صدائے جرس چاک کرنے لگی...... یہ خانہ بدوشوں کا ایک مختصر سا کارواں تھا بلکہ کارواں بھی کیا تھا ایک خاندان ہی تھا...... بھاڑو کولہی کا خاندان...... جسے برادری سے نکال دیا گیا تھا، یہ لوگ سہون شریف کی پہاڑیوں میں واقع گورکھ ہل کے اطراف

میں جھونپڑیوں میں رہتے تھے...... انہیں نہ صرف اپنی برادری سے بلکہ علاقے سے ہی بے دخل کر دیا گیا تھا...... اگرچہ ان کا کوئی ایک علاقہ نہیں ہوتا...... گرمیوں میں یہ لوگ پہاڑی یا سندھو دریا کے قریب پڑاؤ ڈالتے تھے یا پھر سردیوں میں نشیب کے جنگلوں میں آن بسیرا کرتے تھے...... یہ مختصر سا کارواں صرف گیارہ افراد، تین شکاری کتے، ایک بجو، تین عدد گو، چار خچر، ایک مرگھلا سا گھوڑا اور آٹھ دس بھیڑ بکریوں پر مشتمل تھا۔

مرگھلے سے گھوڑے پر خود بھاڑو کولہی سوار تھا، اس کی عمر سو سال کے لگ بھگ تھی...... دیکھنے میں وہ انتہائی لاغر ضعیف نظر آتا تھا...... اس کی کمر دہری ہو کر کُب کی شکل اختیار کر گئی تھی...... اس کی رنگت پیلی تھی۔ باقی سب سانولے تھے، ان میں عورتیں، مرد اور چند ایک بچوں کے علاوہ دو تین لاوارث نوعمر چھوکرے بھی تھے جو ان کی چاکری کیا کرتے تھے۔ گدھوں اور خچروں کی چھوٹی چھوٹی پیٹھوں پر الا بلا سامان اور جھاڑ جھنکار لدا ہوا تھا...... یہ کارواں جیسے ہی بے سدھ پڑے بخش علی کے نزدیک پہنچا تو سب سے پہلے بوڑھے سرغنہ کبڑے بھاڑو کولہی کی لاڈلی بیٹی لالاں ایک تنومند گدھے سے زقند بھر کر نیچے اتری اور اپنے سینے پر دوہتڑ مار کر چلائی۔

"را......! ہے کون ڑ...... چھوکرا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے وہ دوڑتی ہوئی دوزانو ہو کر بخش علی پر جھک گئی...... اسے ہلایا جلایا اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکنیں محسوس کیں پھر اس کے زخموں کو دیکھا۔ اس کے بعد چلا کر کسی کو آواز دی۔

"را...... میرو......! ادھر آ...... پاڑیں مشکیزہ بھی لائے کے آ......"

اس کی آواز پر ایک چرخ سا نوعمر لڑکا جس نے بھاڑوں کولہی کے خچر کی رسی تھام رکھی تھی، ایک دوسرے خچر پر لدے الا بلا ساز و سامان کے بقچوں کے ساتھ جھولتا پانی کا ایک چھوٹا مشکیزہ تلاش کر کے لالاں کی طرف بڑھا...... لالاں کے تیکھے چتونوں اور سانولے پُرکشش چہرے پر اس سے گہری تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ وہ پچیس تیس سالہ ایک دبنگ اور خرانٹ عورت دکھائی دیتی تھی...... اس نے پیلی چولی اور چھینٹ کا میلا چیکٹ گھاگھرا زیب تن کر رکھا تھا، اس کی تیکھی سانولی جلد چکنی اور چمکیلی دکھائی دے رہی تھی جیسے اس نے اپنے کمان کی طرح کسے ہوئے بدن پر "جاں ڑ" کے تیل کی

مالش کی ہو۔ جاں ڑ اگر کوئی بوڑھی اور جھریوں زدہ عورت اپنے بدن پر مل لیتی ہے تو کچھ عرصے تک نہ صرف اس کی جھریاں اور ڈھیلے پڑے رگ و پٹھے بھی تن کر کسی نوخیز دوشیزہ کے شریر کی مثال پیش کرتے بلکہ حیرت انگیز طور پر وہ جوان لڑکیوں جیسے جذبات بھی محسوس کرنے لگتی تھی۔ ”جاں ڑ“ کی فصل صرف اندرونِ سندھ کے دور افتادہ بارانی گوٹھوں میں ہی ہوتی تھی جو جنوری اور فروری میں کاشت ہوتی تھی۔ مگر لالاں کا یہ تیکھا حُسن و شباب قدرتی اور فطری تھا۔ بہرطور اس نے میرو نامی چھوکرے سے مشکیزہ لے کر پانی کے چند چھینٹے اس کے چہرے پر مارے تو وہ ذرا کسمسایا۔ تب لالاں نے جلدی سے ایک دو اور جوان چھوکروں کو بھی بلایا اور بخش علی کو اپنے گدھے پر لاد لیا..... کارواں کے باقی سب لوگ جن میں لالاں کے علاوہ دو چار اور افراد بھی تھے، خاموش کھڑے رہے تھے۔ یہ کارواں اب دوبارہ اپنی انجانی منزل کی طرف چل پڑا۔



سدھوری کی جب آنکھ کھلی تو اس کے کانوں میں بچوں کا شور سنائی دیا۔ ذرا دیر بعد جب پوری طرح اس کے ذہن و دماغ سے دھند کی چادر چھٹی تو اس نے بے اختیار گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو اپنے سامنے ایک بد ہیئت سے شخص کو دیکھ کر بری طرح دہل گئی..... یہ لانقو تھا..... وہ اس وقت لانقو کے گھر میں موجود ایک چارپائی پر پڑی ہوئی تھی..... اسی لمحے اسے اپنی ٹانگ میں شدید ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔

”سدھوری.....! تمہارا زخم بہت گہرا ہے..... آرام سے لیٹی رہو..... میں نے دوائی لگا کر پٹی کر دی ہے۔“ لانقو نے کھرکھراتے مگر نرم سے لہجے میں کہا۔ ”شکر کرو کہ گولی صرف گوشت چھیدتی ہوئی نکل گئی ہے..... ہڈی بچ گئی۔“

اس نے اپنی بات مکمل کی تو سدھوری وحشت زدہ ہو کر بولی۔ ”مم..... میں آپڑیں گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”دیکھو ڈرمت..... میں تمہیں خود تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا بلکہ میں تمہاری ماں اور پیو (باپ) کو بھی ادھر ہی لے آتا ہوں مگر ابھی تمہارا چلنا پھرنا مناسب نہیں ہوگا۔“ اس نے انتہائی شائستہ لہجے میں کہا تو جانے کیوں سدھوری کے دل و دماغ سے کدورت چھٹنے لگی اور اس کا خوف بھی کچھ کم ہونے لگا تھا اور اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

سدھوری نے کن انکھیوں سے گھر کا جائزہ لیا..... اس کی چارپائی برآمدے میں بچھی ہوئی تھی، گھر خاصا بڑا اور نیم پختہ تھا..... دو کمرے اور ایک کشادہ صحن تھا جدھر تین بچے جن کی عمریں بالترتیب چھ، آٹھ اور گیارہ سال تھیں، آپس میں کھیل رہے تھے۔ مگر سدھوری کو ہوش میں آتا دیکھ کر وہ اب نیم دائرے کی صورت میں معصوم چہروں پر حیرت لئے اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے..... لانقو چارپائی کے قریب رکھے ایک مونڈھے پر بیٹھا تھا..... تینوں بچوں میں ایک لڑکا بڑا اور منجھلی بچی تھی، تیسرا سب سے چھوٹا تھا..... یہ تینوں بچے ماں کے سائے سے محروم تھے اور لانقو ان کا باپ تھا..... سدھوری بڑے غور سے ان تینوں معصوم بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی، اسے پتہ نہیں کیوں ان تینوں پر ترس آ رہا تھا۔

پھر لانقو نے اپنے بڑے بچے سے کہا۔ ”اڑے علی محمد.....! جا دودھ کا گلاس لے کر آ، جلدی.....!“

علی محمد نامی بچہ فوراً وہاں سے چلا گیا تو لانقو نے دھیرے سے سدھوری کو مخاطب کر کے اپنے بچوں کے بارے میں بتایا۔

”یہ تینوں میرے بچے ہیں..... یہ منجھلی بیٹی کونجاں ہے اور یہ تیسرا ننھا شیطان منٹھار ہے..... بے چارے اچھے ہیں..... مجھے تنگ بھی نہیں کرتے، ہاں کبھی کبھی اپنی ماں کو یاد کر کے اُداس ضرور ہو جاتے ہیں..... ابھی ان کے ذہن معصوم اور کچے ہیں..... سوچتا ہوں اگر کوئی عورت آ جائے تو یہ بے چارے اپنا دکھ بھول کر اسے ہی اپنی ماں سمجھ کر بہل جائیں گے کاش.....!“ لانقو اتنا کہہ کر چپ ہو رہا..... اس کے لہجے میں بلا کا درد تھا جسے سدھوری بھی محسوس کئے بنا نہ رہ سکی تھی۔

اس سے اسے لانقو ایک سلجھا ہوا شریف انسان محسوس ہو رہا تھا..... اتنے میں علی محمد جست کے ایک بڑے اور صاف ستھرے گلاس میں سدھوری کے لئے دودھ لے آیا تھا۔ سدھوری نے اس کے معصوم چہرے پر ایک ترحم آمیز نگاہ ڈالی اور گلاس اس کے ہاتھوں سے لے کر منہ سے لگا لیا۔ اسے وہ تینوں بھولے بھالے بچے بہت پیارے لگ رہے تھے..... ایک لمحے کو اپنا درد بھی بھول گئی تھی..... اتنے میں لانقو کا سب سے چھوٹا بیٹا منٹھار، سدھوری کی طرف تکتے ہوئے باپ سے معصومیت کے ساتھ بولا۔

"بابا...... یہ ہماری اماں ہے......؟"

سدھوری کا دل دھک سے رہ گیا...... لالقو خاموشی کے ساتھ اپنے بیٹے منٹھار کی طرف تکنے لگا پھر اس نے اسے بے اختیار اپنے ساتھ لگا لیا...... صاف عیاں تھا کہ اسے اپنے تینوں بچوں سے بہت محبت تھی...... وہ اس کے بالوں بھرے سر کو چوم کر شفقت سے بولا۔

"ہاں پت......! یہ تمہاری اماں ہے......" اتنا کہہ کر اس نے ان تینوں کو وہاں سے چلے جانے کو کہا۔

"تو ناراض مت ہونا...... میں اس کی معافی مانگتا ہوں...... یہ میں نے محض بچے کے دل کو خوش کرنے کے لئے کہا تھا۔ ورنہ یہ ساری رات رو رو کر اپنی آنکھیں سرخ کر لیتا۔" لالقو کا لہجہ آخر میں غمگین ہو گیا تھا۔

"تو پھر ان بچوں کو بتا کیوں نہیں دیتا کہ ان کی ماں مر چکی ہے...... اب وہ کبھی نہیں آ سکتی۔" سدھوری نے پہلی بار بے اختیار لالقو کے مسئلے پر گفتگو کی ابتداء کی۔

وہ بولا۔ "ان بے چاروں کو پتہ ہی نہیں کہ مرنا کیا ہوتا ہے، ہاں یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ کوئی جنی یا راکاس (شیطان) اٹھا لے گیا ہے۔"

سدھوری خاموشی سے لالقو کا چہرہ تکنے لگی۔ پھر دفعتہً اسے اپنی پنڈلی پر ٹیس سی محسوس ہوئی اور بے اختیار اس کے حلق سے تکلیف دہ کراہ سی نکل گئی...... اس نے دیکھا اس کے زخم پر خوب جما کر پٹی کی گئی ہے، اس نے یونہی اپنے زخم کی طرف دیکھا۔ ادھر لالقو اس کی تکلیف پر پریشان سا ہو گیا، وہ بولا۔

"کیا ہوا...... تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟"

جواباً سدھوری نے ہونٹ دباتے ہوئے اپنا سر ہولے سے اثبات میں ہلایا۔ لالقو فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک گلاس میں دوا ڈال کر اس کے لبوں سے لگا دیا...... دوا پینے کے بعد سدھوری کے ذہن میں اچانک ایک خیال کوندا...... اپنی سہیلی شہزادی اور اجنبی کو وہ یکسر فراموش کئے بیٹھی تھی...... حالات اتنی تیزی کے ساتھ گردش میں آئے کہ سدھوری خود کو غیر متوقع طور پر لالقو کے ہاں پا کر اتنی پریشان اور خوف زدہ سی ہو گئی تھی کہ اس کے ذہن میں چھائی ہوئی دھند پوری طرح نہیں چھٹی تھی، اب جبکہ کچھ قرار ملا تھا تو

اسے اچانک ہی یاد آیا تھا کہ وہ کس المیے سے دوچار ہوئی تھی اور موت کے منہ سے کس طرح بال بال بچی تھی...... اس کے تصور میں اب وہ بھیانک خونی منظر پوری طرح واضح ہونے لگا تھا۔ شہزادی کے بھائی وزیر خان نے اس پر گولی چلائی تھی۔

اپنی بہن شہزادی کو ایک اجنبی کے آمنے سامنے دیکھ کر اس کے دونوں بھائی رستم خان اور وزیر خان خطرناک قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے، اس کا ذمہ دار بھی ان دونوں نے اسے ہی سمجھتے ہوئے پہلی گولی اس پر ہی چلائی تھی مگر خوش قسمتی سے وہ زندہ بچ گئی تھی مگر بری طرح زخمی ہونے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

اب سدھوری کو اپنی عزیز سہیلی شہزادی کی فکر ستانے لگی تھی...... نجانے اس اجنبی اور شہزادی کا کیا حشر ہوا تھا...... اس تصور سے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا تھا...... لالقو اس کے سامنے موڑھے پر بیٹھا بغور سدھوری کے چہرے کے چڑھتے اترتے تاثرات کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تب دفعتہً ہی سدھوری نے وہ سوال لالقو سے کیا جو اسے غالباً ہوش میں آتے ہی کرنا چاہئے تھا۔

"مجھے یہاں کون اور کیسے لایا؟"

لالقو جو کافی دیر سے اس کی ذہنی حالت کے سدھرنے کا منتظر تھا اور اس بات کا بھی کہ وہ سدھوری سے پوچھتا کہ اس کے ساتھ آخر یہ جانکاہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا...... بہر طور سدھوری کی ابتداء پر وہ اس کے ہراساں اور گھبرائے ہوئے چہرے کی طرف اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

"یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس وقت بھٹے سے لوٹ رہا تھا...... ایک جگہ ڈھینگر پر مجھے تمہارا دوپٹہ پھڑپھڑاتا نظر آیا...... قریب پہنچا تو تم پر بھی نظر پڑ گئی۔ مگر سب سے پہلے میں تمہیں سیدھا حکیم کے پاس لے کر گیا تھا تو انہوں نے زخم پر مرہم پٹی کر دی اور پھر میں تیرے کو ایک بیل گاڑی میں ڈال کر سیدھا ادھر لے آیا...... تیرا گھر تو دور تھا ناں، پھر میں ابھی جا کر تیرے ماں، پیو کو اطلاع کرتا ہوں۔ تو گھبرا مت......" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سدھوری نے اچانک کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"ایک بات بتا......"

"ہاں بول......!"

"کیا تُو نے مجھے اکیلا ہی وہاں ڈھینگروں میں بے ہوش پڑے پایا تھا...... میرا مطلب ہے وہاں اور کوئی تجھے نظر نہیں آیا تھا؟" سدھوری نے پوچھا تو لانگو نے پُرخیال انداز میں نفی میں سر ہلایا پھر بولا۔

"ویسے میں یہ پوچھنا بھول ہی گیا، تیرے ساتھ یہ بیر کس نے کیا...... تیرے کو گولی لگی تھی، کس بدبخت نے یہ ظلم کیا تیرے پر......؟" لانگو غصے سے دانت پیسنے لگا۔

اس سمے سدھوری کو جانے کیوں لانگو اپنا اپنا سا لگا تاہم وہ بات کو ٹالتی ہوئی ملتجی لہجے میں لانگو سے بولی۔ "دیکھ تُو میرے ماں، پیو کو خبر کر دے جلدی...... میرا جی گھبرا رہا ہے بہت۔"

"اچھا...... اچھا...... تو گرتی نہ کر...... میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر لانگو پھر ایک لمحہ نہ رکا۔ البتہ جاتے سمے اس نے صحن میں موجود اپنے تینوں بچوں کو قریب بلا کر کوئی تاکید کی، اس کے بعد وہ باہر نکل گیا۔

لانگو کے تینوں بچے، باپ کے گھر سے نکلتے ہی ایک بار پھر اپنا کھیل بھول کر سدھوری کی چارپائی کے گرد آ کھڑے ہوئے...... ان کی معصوم اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اب حیرت کی بجائے دلچسپی اور اشتیاق سا جھلک رہا تھا...... سدھوری کو ان کی آنکھوں میں دور کہیں احساسِ محرومی کا بے نام اور انجان سا دکھ بھی ہلکورے لیتا محسوس ہوا۔

"اے کونجاں......! ادھر آ میرے پاس......" سدھوری نے منجھلی کو بڑے پیار سے بلایا...... وہ معصومانہ انداز میں لجاتی ہوئی سدھوری کی چارپائی کے قریب آئی۔ اسی لمحے سدھوری بھی بہ دقت تمام کہنیوں کے سہارے اٹھی پھر اپنا ایک بازو کونجاں کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کیا اور اس کے گال کو چوما۔ پھر ملائمت سے پوچھا۔

"میری سائیٹری (سہیلی) بنے گی؟"

اس کی بات سن کر معصوم کونجاں نے پُر اشتیاق انداز میں مسکراتے ہوئے اپنا سر زور سے اثبات میں ہلایا پھر سدھوری نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے اور قریب کر لیا اور دوبارہ چوما۔ اس کے بعد اس نے ننھے منٹھار اور علی محمد کو بھی باری باری اپنے قریب بلا

کر پیار کیا......! ذرا ہی دیر بعد وہ تینوں سدھوری کے ساتھ گھل مل گئے بلکہ خود سدھوری کو بھی تینوں بچوں کے ساتھ مزہ آنے لگا تھا۔ اس کی دل جوئی کا خوب سامان پیدا کیے ہوئے تھے یہ تینوں بچے۔

لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور لانگو کے ہمراہ دادن اور خیراں اندر داخل ہوئے...... ان کے چہروں پر تشویش صاف عیاں تھی...... خیراں کی نظر چارپائی پر لیٹی سدھوری پر پڑی تو وہ سرعت کے ساتھ اس کے قریب آئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔

"کیا ہوا میری دھیئے......! تُو ٹھیک تو ہے ناں...... کس مردود نے تیرے ساتھ یہ ظلم کیا ہے......؟"

وہ بری طرح ہانپنے لگی...... اسی لمحے دادن اور لانگو بھی قریب آ گئے تھے...... لانگو نے بہ غرض تشفی خیراں سے کہا۔ "ادی......! یہ ابھی ٹھیک ہے۔ لیکن زخم پوری طرح صحیح ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا، کوئی خطرے والی بات نہیں۔"

پھر دادن نے بھی ہولے سے سدھوری کے سر پر ہاتھ دھرا، اس کے بعد خیراں نے سدھوری سے پوچھا تو اس کے لہجے میں سراسیمگی کی واضح جھلک موجود تھی۔

"دھیئے...... تیرے ساتھ یہ کس نے کیا...... کچھ تو بول۔" جواباً سدھوری خاموشی سے ماں کا چہرہ تکنے لگی۔ اتنے میں دادن نے بھی سدھوری کو جیسے حوصلہ دیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں دھیئے...... بتا، تجھ پر کس نے گولی چلائی تھی؟"

اس سمے سدھوری کو اپنا سوتیلا باپ بھی برا نہیں محسوس ہوا تھا حالانکہ وہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی اور کہیں زیادہ اپنی سگی ماں خیراں سے۔ مگر جانے کیا بات تھی اس سمے اسے کوئی بھی برا نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہی رہی ہوگی کہ وہ اچانک ہی عجیب و غریب مگر مخدوش گردشِ حالات کی زد میں آئی ہوئی تھی، اس سے کوئی بہانہ بھی نہیں بن رہا تھا...... وہ عجیب سی کشش و پنج میں بھی مبتلا تھی کہ آیا وہ یہ حقیقت کسی کو بتائے یا پی جائے۔ مگر پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اس بات کو پوشیدہ رکھنا مزید خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے پھر دھیرے دھیرے ان لوگوں کو سب کچھ بتا ڈالا۔ اس کی بات سن کر تینوں کے بشروں پر گہری تشویش سی پھیلتی چلی گئی۔



کمرے میں ماتمی سکوت طاری تھا۔ البتہ وقفے وقفے سے ابھرنے والی ہلکی ہلکی سسکیوں سے یہ سکوت بجائے ٹوٹنے کے مزید کرب انگیز اور گہرا ہونے لگتا تھا۔ یہ شہزادی کی خواب گاہ تھی...... وہ اس وقت اپنی مسہری پر اوندھی لیٹی تکیے میں سر دیئے روئے چلی جارہی تھی...... رات ابتدائی پہر میں تھی...... ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی ماں اسے محبت بھری تسلیاں اور تھپکیاں دیتے ہوئے رخصت ہوئی تھی...... ماں کی موجودگی میں وہ چپ چاپ آنسو بہاتے بہاتے سوتی بن گئی تھی، وہ تنہا رہنا چاہتی تھی اس لئے ماں کی موجودگی میں جھوٹ موٹ سوتی بن گئی تھی۔ پھر ماں کے جاتے ہی اس نے ہولے ہولے سسکنا شوع کر دیا تھا۔

غم اسے اس بات کا نہیں تھا کہ زندگی میں پہلی بار اس نے باپ سے نہ صرف ٹھیک ٹھاک ڈانٹ سنی تھی بلکہ اس پر باہر نکلنے کی بھی پابندی لگا دی گئی تھی...... اس کے دونوں بھائیوں رستم اور وزیر خان نے خوب نمک مرچ لگا کر اس باپ کے سامنے اس کی شکایت کی تھی۔ درحقیقت اسے دُکھ اس من موہنے اجنبی کا تھا جس کا اس کے دونوں ظالم بھائیوں نے مار مار کر بھرکس نکال دیا تھا اور اب جانے اس کی کیا حالت ہوئی ہو گی...... وہ بے چارہ نجانے اب زندہ بھی تھا یا...... اس سے آگے کا تصور کرتے ہی وہ کانپ کر رہ جاتی تھی۔ ایک اجنبی کے لئے اس کے دل کی حالت کا دگرگوں ہونا خود اس کے لئے بھی اچنبھے کا باعث تھا، ایک عجیب سے احساسِ اُنسیت کی غیر مرئی ڈور میں وہ دھیرے دھیرے خود کو اس اجنبی کی شخصیت اور ہیئت کذائی پر دل گرفتہ محسوس کرنے لگی تھی...... ایک انجانا سا جذبہ تھا جو ماہیئت قلب میں ڈھل کر آپوں آپ اسے صلہ رحمی کے لئے مہمیز کر رہا تھا۔ ''ایسا کیوں تھا......؟'' دُکھ اور نارسائی سے مجبور و مغموم ہو کر وہ سوچتی۔ ''وہ میرا کیا لگتا تھا، میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ پھر...... پھر کیوں میرا دل اس کے لئے تڑپ تڑپ اٹھتا ہے؟'' بے بسی اور جھنجلاہٹ کی انتہائی منزل پر مصلحت کوشی پر اترنے کی سعی کرتی تو مزید اس کے دل کی حالت دگرگوں ہونے لگتی تب جیسے وہ دل کے نہاں اور عمیق گوشوں سے مجاز جذبوں کے استعارے ڈھونڈتی تو اس پر خیالوں ہی خیالوں میں یہ حقیقت منکشف ہونے لگتی کہ دل تو دل ہے، قربتیں اور نزدیکیاں لمحوں یا

صدیوں کی محتاج نہیں ہوتیں، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ دو دل سالوں تک ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی آپس کے فاصلے گھٹانے کی تگ و دو میں عمریں گزار دیتے ہیں اور بعد میں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ساری عمر دریا کے دو کناروں کی طرح سچی قربت کی آس میں تمام عمر رائیگاں ہی گزار دی۔ لیکن کبھی ساتھ بیتے چند لمحات بھی یہ باور کرانے لگتے ہیں کہ یہ ساتھ تو جیسے صدیوں پر محیط تھا۔ کچھ اسی طرح کے جذبات شہزادی اس اجنبی کے لئے اس وقت محسوس کر رہی تھی مگر وہ اجنبی...... اجنبی تھا ہی کب......؟ وہ تو حقیقتاً اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا...... ایسا شہزادہ جو خوابوں سے حقیقت کی دنیا میں آ کر اسے اپنا بنا گیا تھا...... آج شہزادی کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ماں، باپ کی جتنی لاڈلی تھی، اتنی ہی بے بس تھی...... تب اسے اپنی عزیز سہیلی معصوم سدھوری کا خیال آیا، ظالموں نے اسے بھی کہاں بخشا تھا۔ انہوں نے اسے بھی تو گولی مار دی تھی۔ یہ سب کچھ یاد کر کے شہزادی کو آپ اپنا اندر ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا...... ان ظالمانہ رویوں سے وہ اپنے اندر ایک تمرد اور سرکشی سی محسوس کرنے لگی تھی...... محبت کے سوا اسے سب کچھ بے معنی محسوس ہونے لگا تھا۔

دُکھ اور غم کی انتہائی کٹھنائیوں سے گزرنے کے بعد جب اس کے اندر کی کدورت آنکھوں سے امڈنے والے اشکوں سے خار و خس کی طرح بہہ نکلی تو اس کا ذہن مائل بہ خرد ہونے لگا...... اس نے اب ذرا غیر جذباتی ہو کر حالات کا جائزہ لینا شروع کیا...... اسے ایک یہی فکر لاحق تھی کہ کسی طرح اس اجنبی کی خیر خیریت معلوم ہو جائے اور سدھوری کے بارے میں بھی جاننے کے لئے اسے بے چینی ہو رہی تھی...... اس کے اندر کا تمرد آپ آتش فشاں کی مانند جوالا مکھی بننے لگا تھا۔

اگلے دن اس نے حویلی کی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ بختاں کے ہاتھ پر نوٹ رکھے اور اسے بڑی راز داری سے سدھوری کا حال معلوم کرنے کو کہا۔

وہ ایک ضرورت مند غریب عورت تھی، نوٹ دیکھ کر اس نے حامی تو بھر لی مگر پھر ڈرتے ہوئے بولی۔ ''بی بی جی......! اگر کسی کو پتہ چل گیا تو میں بے موت ماری جاؤں گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا...... تم پر کوئی شک نہیں کرے گا۔'' شہزادی نے اسے تسلی دی مگر پھر

بھی جب اس نے بختاں کے چہرے پر تردد کے آثار دیکھے تو بات بنانے کی غرض سے بظاہر لاپروانہ انداز میں بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے......تم نہیں کرتی ہو، کوئی بات نہیں...... میں کسی دوسرے سے یہ کام باآسانی کروالوں گی۔''

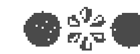
بے چاری بختاں نے جو ڈھیر سارے نوٹوں کو ہاتھ سے جاتے دیکھا تو جھٹ رضامند ہوتے ہوئے بولی۔''اچھا......اچھا بی بی جی......! میں آج ہی آپ کو سدھوری کی خیر خیریت لادیتی ہوں۔''

''صرف خیر خیریت نہیں، اسے ایک پیغام بھی دینا ہوگا میرا......'' شہزادی نے گمبھیر لہجے میں کہا اور اضافہ کیا۔''اسے کہنا کہ کسی طرح مجھ سے فوراً ملے۔''

وہ ادھیڑ عمر ملازمہ بختاں کچھ زیادہ ہی سبک ثابت ہوئی۔ اس نے فوراً شہزادی کو آکر انتہائی رازداری سے اطلاع پہنچائی۔

''بی بی جی......! میں اس کے گھر گئی تھی...... وہ بے چاری چارپائی سے لگی ہوئی ہے، آنہیں سکتی۔''

شہزادی نے یہ سنا تو شش و پنج میں مبتلا ہوگئی۔ تب اس نے بختاں کو ایک نئی ذمہ داری سونپی...... اسے باہر گوٹھ میں یہ سن گن لینے کی تاکید کی کہ لوگوں کی زبان پر کسی زخمی اجنبی کا تذکرہ تو نہیں ہو رہا۔ بختاں نے تھوڑی ردوقدح کے بعد یہ ذمہ داری بھی قبول کر لی۔



گوٹھ کی جنوبی سمت جدھر قبرستان تھا، اس کے سامنے ایک وسیع میدان تھا...... یہاں کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں...... زمین بھی جگہ جگہ سے کلر اور سیم زدہ تھی...... خانہ بدوش بڈھے بھاڑو کولہی کے خاندان نے یہاں ڈیرا جما لیا تھا اور آن کی آن میں پھونس کی جھونپڑیاں ڈال کر فروکش ہو گئے تھے......اس کی چہیتی بیٹی لالاں نے بھی ایک جھونپڑی میں زخموں سے چور بخش علی کو زمین پر بچھے پھونس پر رلی ڈال کر لٹا دیا تھا...... اس نے اس کے زخموں پر بڑی مہارت اور تندہی کے ساتھ جڑی بوٹیوں کا لیپ کر دیا تھا...... جڑی بوٹیوں کے لیپ نے جیسے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام

دکھایا...... ٹیس دوبارہ جاگ اٹھی جس سے بخش علی پوری طرح ہوش میں آکر کراہنے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے حیرت انگیز طور پر اسے اپنے زخموں پر ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی۔ لیکن اندرونی چوٹوں کی وجہ سے کراہنے پر مجبور تھا۔ لالاں نے اسے ایک مٹی کے آب خورے میں لیس دار دوا نگلنے کو دی جو بخش علی کو زہر مار کرنا پڑی۔ مگر اس کے پینے کے ذرا دیر بعد ہی اسے افاقہ محسوس ہونے لگا۔

اس وقت جھونپڑے میں بخش علی اور لالاں کے علاوہ نوعمر لڑکا میرو بھی لالاں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ لالاں نے یہ جھونپڑا اضافی طور پر خاص بخش علی کے لئے ہی کھڑا کروایا تھا......بخش علی پوری رات بے ہوشی کی نیند میں رہا تھا، اب صبح ہو چلی تھی۔

اس کا ذہن بتدریج بیدار ہونے لگا تھا...... ماضی کے بیتے ہوئے تلخ حالات کی فلم تیزی کے ساتھ اس کے ذہن میں چلنے لگی تھی کہ اسے وہ سب کچھ یاد آتا چلا گیا تھا۔

لالاں اسے ہوش میں آتا دیکھ کر بڑے غور سے اس کا چہرہ تکنے لگی...... پتہ نہیں کیوں اس معصوم سے من موہنے نوجوان سے ہمدردی کرنے کو اس کا دل بے اختیار اُمڈا پڑ رہا تھا۔

''تت......تم کون ہو......؟ میں کہاں ہوں......؟'' معاً بخش علی نے لیٹے لیٹے اپنے قریب اکڑوں بیٹھی لالاں سے کہا تو لالاں اپنے ہونٹوں پر بڑی دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ جواباً بولی۔

''تُو ادھر زخمی پڑا تھا ڑے...... میں اٹھا لائی...... تیری یہ حالت کس نے کی...... کیا کوئی دشمنی تھی؟''

بخش علی نے ایک نظر اس کٹیلی عورت کی طرف دیکھا پھر آہستگی کے ساتھ بولا۔

''ہاں......! پر میرے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی تھیں، ان میں سے ایک میری طرح زخمی تھی...... وہ کہاں ہیں؟''

اس کی بات پر لالاں نے اپنے تیکھے چتونوں پر شکنیں ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔''نہیں تو...... ہمرے کو تو صرف تُو ہی پڑا نظر آوے تھا۔''

''لیکن......لیکن تم کون ہو؟'' بخش علی، لالاں کے بارے میں کچھ کچھ اندازہ تو لگا

چکا تھا کہ یہ یقیناً اس کی محسنہ ہی تھی مگر پھر بھی وہ ذہن میں ابھرنے والے سوال کو نوکِ زباں پر لائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

"ہمرے کو اور کچھ نہیں سمجھنا...... ہم خانہ بدوش ہیں۔" وہ تیز لہجے کے ساتھ بولی۔

"پر تیرے ساتھ ہوا کیا...... کچھ تو بتا؟" اس نے دلچسپ نظروں سے بخش علی کی طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

بخش علی نے اپنے حلق سے ایک طویل سانس خارج کی پھر کچھ بولے بنا ہی اپنی آنکھیں موند لیں۔ لالاں کو اس سمے وہ ایک معصوم اور مصیبت کا مارا ہوا لگا...... اسے بے اختیار ترس آنے لگا...... اس کے گھاگ ذہن نے بخش علی کی بھیدوں بھری خاموشی کے پس پردہ کچھ کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔

"سو رہا ہے تُو...... بھوک لگی ہے تو کچھ منگواؤں؟" معاً لالاں نے پھر اسے پکارا۔

بخش علی نے فوراً آنکھیں کھول کر ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر مشکور لہجے میں بولا۔

"تیری بڑی مہربانی...... پر مجھے بھوک نہیں ہے...... میں...... میں اب جانا چاہتا ہوں۔"

"را...... یہ کیا بولے ہے چھورا...... تیرے زخم ابھی ہرے ہیں...... ذرا بھی ہلا تو کھون رِسنے لگے گا۔" لالاں نے یکدم تنبیہ آمیز انداز میں کہا۔ بخش علی کو اس کی بات ماننی پڑی۔ حقیقت یہی تھی کہ اس سے ہلا جلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

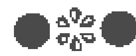
"تیراں ناں کیا ہے ڑے......؟" لالاں نے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

"بخش علی......!" اس نے مختصراً بتایا پھر پوچھا۔ "اور تیرا نام......؟"

"میرا لالاں......" اس نے شوخ لہجے میں اپنا نام بتایا...... ابھی انہیں باتیں کرتے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک جھونپڑے کے باہر کسی کے تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں...... پھر دوسرے ہی لمحے جھونپڑے کے دروازے سے ٹاٹ پرے سرکا اور لالاں کا عمر رسیدہ کبڑا باپ بھاڑو کوبلی اندر داخل ہوا، اس کے ہمراہ دو تین اور افراد بھی تھے...... ان کے چہروں پر زردی چھائی ہوئی تھی...... اندر آتے ہی بھاڑو کوبلی نے بیٹی کو قدرے ہراساں لہجے میں کہا۔

"چل دھیئے! جلدی کر...... ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہے ورنہ خیر نہیں ہماری......"

اس کی بات سن کر لالاں سراسیمہ نظر آنے لگی اور بخش علی بھی پریشان سا ہو گیا۔



خیراں اور دادن سدھوری کو لائقو کے گھر سے اسی وقت ایک بیل گاڑی میں ڈال کر اپنے گھر لے آئے تھے۔ لائقو کے حُسنِ سلوک اور اس کے گھر کے ماحول نے سدھوری کو لائقو کے بارے میں رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر ڈالا تھا...... وہ اتنا برا تو نہیں جتنا وہ سمجھتی تھی۔ پھر اسے لائقو کے تینوں چھوٹے چھوٹے بچوں کی اپنی جانب تکتی معصومانہ نظریں بھی یاد آنے لگیں جن میں احساسِ محرومی ہلکورے لے رہا تھا...... وہ سدھوری کو اپنی ماں کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔

بہر طور سدھوری کے ماں باپ پریشان تھے، انہوں نے بھی سدھوری کو یہی مشورہ دیا تھا کہ بہتر ہے وہ وڈیرا زادی (شہزادی) کی دوستی چھوڑ دے...... ایسے لوگوں کی دشمنی بری ہے تو دوستی بھی اچھی نہیں...... مگر ان سب باتوں سے قطع نظر سدھوری کو اپنی سہیلی کی فکر ہو رہی تھی...... نجانے وہ کس حال میں تھی...... اس کے دونوں اکھڑ اور غصہ ور بھائیوں نے نجانے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہو گا اور...... اور وہ بے چارہ اجنبی، وہ تو شاید بے موت مارا گیا تھا۔

اس کی پنڈلی کا زخم اب بھرنے لگا تھا...... اس دوران لائقو برابر آ کر اس کی خیریت پوچھتا رہتا تھا...... اس کی سہیلی شہزادی کی ملازمہ بھی خفیہ طریقے سے سدھوری تک شہزادی کا پیغام پہنچاتی رہتی تھی...... سدھوری نے ایک دن بختاں کے ہاتھ شہزادی کو یہ اطلاع بھجوا دی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح اجنبی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے...... جانے وہ کس حال میں اور کہاں ہے۔

پھر ایک دن اس کی ماں خیراں نے سدھوری سے پرانا موضوع چھیڑ دیا۔

"دیکھ دھیئے......! تو مجھے کچھ بھی سمجھ پر ہوں تو میں تیری ماں...... مجھے تیری بڑی کُڑتی رہتی ہے...... میں چاہتی ہوں تُو اپنے گھر کی ہو جا۔"

جواباً سدھوری خاموش رہی تو خیراں، بیٹی کی خاموشی پر حوصلہ پا کر اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولی۔ "یہ اوپر والے کی مرضی سے ہی ہوا کہ تُو نے خود لائقو کو پرکھ لیا کہ وہ کیسا ہے...... وہ اس سے بھی زیادہ اچھا ہے۔ تُو شاید اس کی صورت سے دھوکا کھا گئی ہو ورنہ وہ جتنا بدصورت ہے، اندر سے اتنا ہی خوبصورت اور اُجلا ہے...... میں تو

کہتی ہوں تُو اس کے ساتھ بہت سکھی رہے گی بلکہ وہ غریب تیرے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا...... بول تو پکی کر دوں بات تیری......؟''

ماں کی بات سن کر سدھوری کے چہرے پر بدستور خاموشی چھائی رہی۔ یہ حقیقت تھی کہ ابتداء ہی سے سدھوری نے ایسے نامساعد حالات میں آنکھ کھولی تھی جہاں خواب تک دیکھنا نصیب میں نہیں تھے...... یہاں صرف تپتی جھلستی زندگی کی بے رحم حقیقتوں کے سوا کچھ نہیں تھا...... یہی وجہ تھی سدھوری کی فطرت میں خواب پرستی کی بجائے حقیقت پسندی کا عنصر غالب تھا...... وہ عام الہڑ لڑکیوں کی طرح خواب دیکھنے والی لڑکی نہ تھی...... حالات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکی تھی...... چندن بننا وہ نہیں چاہتی تھی...... حالاتِ دگرگوں نے اسے وقت سے پہلے پختہ شعوری کی طرف دھکیل دیا تھا...... وہ جانتی تھی کہ ان کے سماج میں جوان لڑکی کیسے کیسے عبرت سوز مصائب و مسائل کا شکار رہتی ہے، جو جتنی زیادہ امیدیں باندھنے کی کوشش کرتی ہے، اتنا ہی زیادہ وہ مصائب و آلام کا شکار رہتی ہے...... ایسے میں اسے لالو برا نہ لگا تھا اور جب خوب سوچ و بچار کے بعد اس نے خیراں کو اپنی مرضی سے آگاہ کیا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی...... وقت دھیرے دھیرے دونوں ماں بیٹی کے درمیان موجود خلیج کو ان دیکھے مرہم سے بھر رہا تھا۔



دن بدن شہزادی کی حالت دل زار دگرگوں ہوئی جا رہی تھی۔ سدھوری کی تو خیریت کی اطلاع اسے اپنی رازدار ملازمہ بختاں سے ملتی رہتی تھی مگر اس من موہنے اجنبی کا خیال ایک لمحے کے لئے اس کے دل ناصبور سے محو نہ ہوا تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں شدت ہی آتی جا رہی تھی...... ہنوز اس کی خیریت کی اطلاع وہ حاصل نہ کر پائی تھی...... اتنے عرصے سے اس نے ٹھیک طرح کھایا پیا بھی نہ تھا۔

اس کی ماں حسنہ بیگم، بیٹی کی حالت زار سے بخوبی واقف تھی اور خوفزدہ بھی تھی...... وہ اپنی مضطرب الحال بیٹی کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی اور پریشان رہتی تھی۔

''آمڑ......! (اماں) وہ...... وہ بے قصور تھا...... میری وجہ سے جانے اس کا کیا حشر ہوا ہو گا؟'' ایک روز اس نے ماں کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے اپنے دل اور

ضمیر کی حالت کا بیک وقت اظہار کیا تو اس کی ماں تڑپ کر بولی۔

''دھیئے......! تُو اسے بھول کیوں نہیں جاتی...... وہ تیرا کیا لگتا ہے...... آپڑیں بھائیوں اور پیو کو نہیں جانتی، وہ تیرے ٹکڑے کر دیں گے...... یہ تو تیری خوش نصیبی ہے کہ تجھے انہوں نے چھوڑ دیا...... پر بار بار ایسا نہ ہو گا۔''

پھر ایک دن جیسے بھونچال آ گیا۔

حویلی میں کچھ مہمان آئے، ماں نے آ کر شہزادی کو بتایا۔ ''شہزادی......! تیرے پیو نے پاس گوٹھ کے ایک زمیندار حاجی سالار خان کے بیٹے ہشام خان کے ساتھ تیری بات پکی کر دی ہے۔''

ماں کی بات سن کر شہزادی اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گئی...... اسے یوں لگا جیسے اس کے پورے جسم سے جان نکل گئی ہو!

شہزادی کافی دیر تک اپنی جگہ ساکت و صامت کھڑی رہی...... اس کی ماں کمرے سے جا چکی تھی...... وقت جیسے شہزادی کے لئے رک چکا تھا...... اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی طے کر دیا جائے گا...... اس کے رشتے کی بات، منگنی اور پھر شادی...... وہ حالات اور وقت کی نزاکت کو جانتی تھی...... کوئی اور موقع ہوتا تو وہ شادی سے ہی صاف انکار کر کے ٹال سکتی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس کی بات کی اب کوئی وقعت نہ رہی تھی اور یہ سب کیونکر اس قدر عجلت کے ساتھ ہو رہا تھا، وہ اس کی وجہ بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

شہزادی کو اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے...... پیروں پر کھڑا رہنا دوبھر ہونے لگا۔ پھر وہ جیسے اپنے ریختہ وجود کو گھسیٹتی ہوئی مسہری تک آئی اور قریب تپائی پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور لرزتے خشک ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں پی گئی...... اس کا پورا وجود جل رہا تھا...... دماغ سلگ رہا تھا اور آنکھیں اُمڈ سی رہی تھیں۔

بار بار چشم تصور میں اس من موہنے اجنبی کی شبیہہ ابھرتی اور دل ناصبور، مجبور سا ہونے لگتا...... ایک اجنبی کے لئے اپنے دل میں ایسی تڑپ پر اب اسے کوئی اچنبھا نہیں محسوس ہو رہا تھا...... وہ اب اجنبی کہاں رہا تھا، اسے تو اب یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے

وہ اس سے پہلے بھی برسوں ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور رگ جاں تک اتر چکے ہوں...... پور پور میں ایک دوسرے کا نام بس چکا ہو۔

شہزادی نے ایک گلاس اور پانی پیا...... چند ثانئے گہرے گہرے سانس لئے اور اب اس کے چہرے پر گمبھیر خاموشی چھا گئی اور اس کی سرمگیں آنکھیں خلاء میں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہو گئی تھیں...... ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کے کسی اہم فیصلے پر غور کر رہی ہو۔



''پیو......! آخر ہوا کیا ہے......؟'' اپنے بوڑھے باپ کوبلی کی بات سن کر لالاں اپنے دبے دبے ہراس پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ قریب رلی پر پڑا بخش علی بھی اس نئی افتاد پر پریشان ہو گیا تھا اور خاموشی سے لیٹا دونوں باپ بیٹی کے چہروں کو تک رہا تھا۔

''اوس کنجڑے کادو نے ہمارا راستہ دیکھ لیا ہے...... آپڑیں ڈشکروں کے ساتھ ادھر ہی آ رہا ہے وہ......'' باپ کی اطلاع پر لالاں کے چہرے پر پہلے یکدم ہی برہمی کے آثار نمودار ہوئے...... بخش علی نے صورتحال کی نزاکت کا کچھ کچھ اندازہ لگا لیا تھا تاہم اس نے پوچھا۔

''لالاں......! کیا ہوا......! یہ کادو کون ہے؟''

اس کی بات سن کر لالاں دانت پیستے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ ''کادو میرا مرد ہے۔ پر وہ ایک بے غیرت آدمی ہے اور جالم (ظالم) بھی...... اس کی کھاتر تو ہمیں برادری سے نکلنا پڑا۔''

اس نے بتایا تو کوبلی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے سرزنش کی۔ ''یہ وکھت باتوں کا نہیں...... یہ سوچو کرنا کے ہے؟''

''کڑراں کا ہے...... ہمرے کو جات برادری سے نکال کر اب ایدھر کیا کرن آ رہا ہے؟'' لالاں اپنے تیکھے چتونوں پر بل ڈالتے ہوئے غصے سے بولی۔

پھر اسی لمحے باہر شور سا سنائی دیا...... لالاں، میرو اور کوبلی لپک کر جھونپڑے سے باہر نکلے...... اندر بخش علی اب تنہا رہ گیا تھا مگر یوں پڑے رہنا اسے قبول نہ تھا۔

خانہ بدوش عورت اب اس کے لئے ایک محسنہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ نہ صرف

یہ بلکہ اس نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی بھی کی تھی۔ لہٰذا وہ بدقت تمام اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹاٹ اٹھا کر باہر نکل آیا...... اسے اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہونا دوبھر محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے سامنے دیکھا کہ آٹھ دس بدمعاش قسم کے افراد ہاتھوں میں ڈنڈے تھامے کھڑے ہیں...... ان کے ہمراہ ایک ٹھگنا اور موٹا سا شخص بھی موجود تھا جو کینہ توز نظروں سے کوبلی اور لالاں کو گھورے جا رہا تھا...... وہ لالاں کو بڑی رعونت کے ساتھ مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

''لا...... لالاں......! میرے بالکے (بچے) لوٹا دے میکوں (مجھے)...... میں چلا جاؤں گا۔ ورنہ بڑا کھون کھرابہ ہو جاوے گا۔''

''رے جا......! تیرا بالکوں پر کوئی حق نہیں سردار وڈے نے ایسی کوئی گالھ (بات) آپڑیں پھیسلے (فیصلے) میں نہیں کی تھی...... یہ اب میرے پاس ہی رہیں گے۔'' لالاں اپنے دونوں ہاتھ کمر پر دھرتے ہوئے بڑے دبنگ لہجے میں اس مسٹنڈے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

بخش علی کھڑا یہ سب سن رہا تھا...... اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ مسٹنڈا لالاں کا شوہر کادو ہی تھا...... اس کے بال گھنگھریالے اور بڑی بڑی آنکھوں میں خونخواری جھلک رہی تھی...... سر بالکل صاف اور رنگت انتہائی خاکستری تھی...... اس نے صرف صدری اور میلی سی لاک (تہبند) باندھ رکھی تھی...... ہاتھ میں ڈنڈا تھام رکھا تھا۔

اس کے دیگر ساتھیوں کا بھی کم و بیش یہی حلیہ تھا...... بخش علی کو اس کے تیور خاصے خطرناک نظر آ رہے تھے...... ان کے بشروں اور گھورتی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور وہ کسی بھی وقت خرن خرابہ کے لئے تیار تھے...... ایسے میں بخش علی کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھا۔ اثنائے راہ کادو کی بھی نظر بخش علی پر پڑی، وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا...... اب وہ بڑے غور سے بخش علی کا سرتاپا جائزہ لے رہا تھا۔

اسے غالباً بخش علی جیسے ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص کو خانہ بدوشوں کے درمیان پا کر حیرت بھی ہوئی تھی...... بخش علی کو ابھی تک اپنے پورے وجود میں درد کی ٹیسیں اور نقاہت کا احساس ابھر رہا تھا مگر وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر تنا کھڑا تھا...... بالآخر اس نے لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے کادو کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے سنو......! تم جو کچھ کرنا چاہ رہے ہو، یہ غیر قانونی ہے۔ اس بدمعاشی کی تم سزا بھی بھگت سکتے ہو۔" بخش علی کے بارعب لہجے نے ایک لمحے کو کادو کو کمزور سا کر ڈالا تھا...... اس کے چہرے پر الجھن کے ساتھ ساتھ کسی حد تک مرعوبیت کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے تھے۔ تاہم پھر وہ بخش علی کے چہرے پر اپنی سرخ انگارہ آنکھیں جمائے جمائے چند قدم اس کی طرف بڑھا اور کھرکھراتی آواز میں بولا۔

"را تُو کون ہے ڑے جو ہمرے کو دھمکیاں دے رہا ہے؟"

"میں دھمکیاں نہیں دے رہا۔" بخش علی نے اس بار زیادہ سخت لہجے میں جواب دیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "میں پولیس انسپکٹر ہوں، بخش علی نام ہے میرا۔ ڈاکوؤں سے لڑتا ہوا زخمی ہو کر ادھر آن نکلا تھا، اب یہ لوگ میرے محسن ہیں، تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ ان کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ ابھی میرے پولیس کے آدمی پہنچنے والے ہیں۔" بخش علی نے موقع کی نزاکت کے مطابق دروغ گوئی سے کام لینا مناسب سمجھا تھا۔ تاہم اس کی بات کا کادو پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا...... اگرچہ اس کے چہرے پر اب کشمکش و پیچ اور تردد کے آثار زیادہ نمایاں ہو رہے تھے مگر ان تاثرات میں غالب عنصر یہی تھا کہ وہ بخش علی کو پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے جان کر کافی حد تک خوفزدہ ہو گیا تھا۔

پھر اس کے جارحانہ ارادوں پر اوس پڑنے لگی...... اس نے قریب آ کر آخری بار معاندانہ نظروں سے لالاں کو گھورا جیسے دھمکانا چاہ رہا ہو کہ اس بار میں ناکام لوٹ رہا ہوں مگر ہر بار ایسا نہیں ہوگا۔

پھر ذرا دیر بعد کادو اپنے ڈشکروں کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کولبی اور اس کی بیٹی لالاں حیرت اور خوشی سے منہ کھولے بخش علی کے چہرے کی طرف تکے جا رہے تھے جیسے انہیں یقین ہی نہیں آ رہا ہو کہ کادو جیسی گندمی اور ہلاکت خیز بلا اتنی آسانی کے ساتھ ٹل چکی ہے۔

"را سائیں......! توں ڑیں تو کمال کر دیا...... یہ بڑا کمینہ ہے کادو۔ آپڑیں پیو کو بھی نہ بخشنے والا۔ پر تُو نے......" لالاں نے استعجاب آمیز انداز میں خوشی سے کہا۔ وہ بخش علی کے قریب آ گئی تھی...... مارے خوشی کے اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

بخش علی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ خاموشی سے واپس جھونپڑی کی طرف لوٹنے لگا تو لالاں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

بخش علی جانتا تھا کہ آن کی آن میں اب اس کی حیثیت "بوجھ" کی بجائے محسن کی سی ہو گئی تھی اور لالاں بڑی سرگرمی اور سرشاری کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ بخش علی کو سہارا دیتی اندر لے آئی۔

"صاحب......! توں ڑیں تو مجھ گریبن پر بڑا تھورا (احسان) کر ڈالا۔" اس کا لہجہ ممنونیت سے لبریز تھا۔

بخش علی اب فرش پر بچھی رلی پر خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا تھا، پر لالاں کہاں چپ ہونے والی تھی، بولی۔

"صاحب......! اگر...... اگر یہ مردود میرے بالکے (بچے) لے جاتا ناں تو میں جیندہ نہ رہتی...... اپھٹ مر جاتی...... پر ہک بات بتا، کیا سچ مچ تُو کوئی وڈا پولیس والا ہے؟"

جواباً بخش علی کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بولا۔ "نہیں! یہ میں نے ایسے ہی اسے ڈرانے کے لئے کہا تھا۔"

"بس...... بس صاحب! آگے کچھ مت کہنا...... آپ پولیس کے بڑے صاحب ہو۔" اس نے کسی خیال کے تحت پُرسوچ انداز میں کہا پھر چند ثانئے بخش علی کے گم صم چہرے کو گہری نظروں سے یک ٹک دیکھتے رہنے کے بعد دوبارہ اسے مخاطب کر کے بولی۔ "صاحب......! مجھے تم اندر سے دُکھی لگے ہو...... ایسا لگتا ہے جیسے تمہارا کچھ کھو گیا ہے۔"

بخش علی اس کی بات پر بری طرح چونک کر اس کا سلونا تیکھا چہرہ تکنے لگا۔ وہ اس خانہ بدوش عورت کی زود فہمی پر متحیر تھا...... اس نے اس کی ذہنی حالت کا بالکل درست اندازہ لگایا تھا اور اتنے معصوم اور انسیت بھرے لہجے میں پوچھا تھا کہ بخش علی نے پھر اپنے اس ہمدرد مونس سے کچھ نہ چھپایا اور بلا کم و کاست اس کے سامنے اپنا حال دل کھول دیا۔ لالاں نے اس کی کتھا سن کر اپنے ہونٹوں میں انگلی دبا لی۔ بخش علی نے بڑے رسان اور امید بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

''لالاں...... تو میرا ایک کام کرے گی؟''

''ہاں...... ہاں بولو صائب......!'' وہ جلدی سے بولی۔

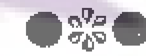
''تو کسی طرح شہزادی کی خیر خیریت کے بارے میں مجھے خبر لا دے...... میں اس کی طرف سے بڑا پریشان ہوں...... یہ پاس ہی کے گوٹھ میں وہ رہتی ہے۔'' لالاں اس کی بات پر کچھ سوچتی رہی پھر یکدم چٹکی بجا کر بولی۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں...... میں ابھی کھلونے بیچنے والی کے بھیس میں وڈیرے مشوری خان کی حویلی میں چلی جاتی ہوں۔''

بخش علی خوش ہو گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اس کے ذہن میں بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک خیال کوندا۔ وہ بولا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی تیرے ساتھ چلوں...... میں خود بھی شہزادی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اس کی بات سن کر لالاں چند ثانیے کچھ سوچنے کے بعد بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ پر تجھے بھی کھلونے بیچنے ''والی'' کا بھیس بھرنا پڑے گا۔''

بخش علی نے فوراً حامی بھر لی اور لالاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔



سدھوری کے ''ہاں'' کرنے کی دیر تھی کہ اس کی ماں خیراں نے فوراً لانقو کے ساتھ اس کے رشتے کی بات پکی کر دی اور شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔ سدھوری کی خواہش تھی کہ اس کی عزیز سہیلی شہزادی بھی اس کی خوشی میں شریک ہو۔ مگر اس کا معاملہ اتنا گمبھیر تھا کہ وہ کچھ نہ کر سکتی تھی، اس نے چپ سادھ لی۔

سدھوری اب بھلی چنگی تو ہو گئی تھی مگر اس میں اب ایک نقص پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں لنگ آ گیا تھا مگر پھر بھی لانقو نے اسے قبول کر لیا تھا۔ پھر بڑی سادگی کے ساتھ دونوں کا نکاح کر دیا گیا اور یوں سدھوری ادھیڑ عمر لانقو کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔

بلاشبہ لانقو اس کے لئے ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا اور وہ تینوں بچے بھی اس کے ساتھ گھل مل گئے تھے...... سدھوری ان تینوں کو اپنی ہی اولاد کی طرح چاہتی تھی اور یہی لانقو چاہتا تھا مگر سدھوری نے محسوس کیا تھا کہ لانقو کا بڑا بیٹا علی محمد اس سے کھنچا کھنچا سا

رہتا تھا جبکہ کونجاں اور ننھا منٹھار، سدھوری کو ہی اپنی ماں سمجھنے لگے تھے۔ مگر سدھوری کو گیارہ سالہ علی محمد کے کھنچے کھنچے رہنے کی وجہ نہ معلوم ہو سکی تھی۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سدھوری کو خود ہی اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ علی محمد کا شعور کچھ کچھ بیدار ہو چکا تھا...... اس کے ذہن سے اپنی مرحومہ ماں کی صورت ابھی محو نہیں ہوئی تھی...... وہ اب اپنی ذات میں کھویا رہنے والا معصوم بچہ نظر آنے لگا تھا...... سدھوری نے بھی سب سے زیادہ توجہ اس پر ہی دینا شروع کر دی تھی۔

ادھر لانقو بھی خوش تھا کہ اس کے ننھے منے معصوم بچوں کو سدھوری جیسی نیک دل ماں مل گئی تھی جس نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے بچوں کو سوتیلی ماں کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ مگر پھر سدھوری بجھی بجھی سی رہنے لگی تھی...... اسے اپنی سہیلی شہزادی کے بچھڑنے کا غم تھا...... ایک دن وہ اپنے شوہر لانقو سے برملا اس کا اظہار کر بیٹھی۔ بولی۔

''رے لانقو......! مجھے اپنی سہیلی بہت یاد آتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں صرف ایک بار شہزادی سے ملاقات کر لوں؟''

لانقو ایک جہاندیدہ شخص تھا، اسے سدھوری اور شہزادی کی دوستی کا علم تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی بیوی سدھوری کو اس کی کتنی بڑی سزا بھگتنی پڑی تھی جس کی وجہ سے اس کی ایک ٹانگ میں بھی نقص پیدا ہو گیا تھا مگر وہ اپنی چہیتی بیوی کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

وہ بولا۔ ''سدھوری......! یہ ذرا مشکل کام ہے لیکن پھر بھی میں سوچوں گا۔ ویسے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ اب اپنی سہیلی کو بھول جاؤ۔ ایسے لوگوں سے دوری ہی بھلی ہے، اس کا تمہیں اندازہ ہو چکا ہو گا کہ اس کے دونوں بے رحم بھائیوں کے ہاتھوں مرنے سے تم بال بال بچی تھیں۔''

شوہر کی بات سن کر سدھوری کا چہرہ مغموم سا ہو گیا...... اسے اپنے شوہر کی بات ٹھیک معلوم ہوئی لہٰذا اس نے سردست خاموشی اختیار کر لی۔



شہزادی اپنی زندگی کے جس اہم فیصلے کے بارے میں سوچ و بچار کر رہی تھی، وہ یہ تھا کہ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بہرصورت اس اجنبی کو تلاش کر کے رہے گی۔

جب تک اس کی خیریت نہیں مل جاتی، وہ چین سے نہیں بیٹھے گی۔

وہ ایک چمکیلی سہانی صبح تھی۔ خوشگوار دھوپ کی کرنیں دریچے سے اندر ضوفشاں ہو رہی تھیں۔ شہزادی اس وقت دریچے کے قریب ہی پیڑھا سرکائے سوگوار سی بیٹھی تھی کہ اچانک ایک آواز پر چونکی۔

''کھلونے لے لو...... بالکوں (بچوں) کے کھلونے...... بیل گاڑی، گھوڑا اور گائیں...... جاپانی گڑیاں بھی لے لو۔'' شہزادی نے یونہی محرابی دریچے کا پردہ سرکا کر ذرا نیچے دیکھا تو اس کی نظر دو خانہ بدوش عورتوں پر پڑی۔ دونوں نے سر پر سرکنڈوں کے بنے ٹوکرے اٹھا رکھے تھے۔

شہزادی کو ٹوکروں میں دھری جاپانی گڑیاں دکھائی دے گئیں۔ دل بہلانے کے لئے یہ اچھا سامان نظر آیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک خادمہ کو بلا کر انہیں اوپر لانے کو کہا۔

پھر ذرا دیر بعد ہی ایک سیاہی مائل عورت سر پر بڑا سا کھلونوں کا ٹوکرا لے کر اندر داخل ہوئی...... اس عورت نے ایک چونکتی ہوئی گہری نظر شہزادی پر ڈالی تھی...... ایک لمحے کو شہزادی کو بھی اس کی آنکھوں میں عجیب کھنچاؤ کی سی جھلک محسوس ہوئی اور تب وہ بری طرح چونکی...... ایک عجیب خیال اور امید سے اس کا دل مسرت سے بے قابو ہو کر دھڑک اٹھا۔

خادمہ کو شہزادی نے چلے جانے کا حکم دیا...... خانہ بدوش عورت نے شہزادی کو بھاری لب و لہجے میں سلام کیا، اس کے بعد ٹوکرا فرش پر رکھنے کے بعد سر سے ''اینڈوا'' بھی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب وہ دونوں کمرے میں تنہا تھے۔

''شہزادی......! کیسی ہے...... تُو نے مجھے پہچانا...... مم......میں......'' خانہ بدوش عورت نے یکدم اپنی اصل اور بھاری آواز میں کہا۔ یہ بخش علی تھا جو محسنہ خانہ بدوش لالاں کے ساتھ کھلونے بیچنے والی کے روپ میں یہاں تک پہنچا تھا۔

شہزادی کا چہرہ کھل اٹھا...... اس نے لہجے کی متوقع اور امید افزا غیر معمولی تبدیلی کا اندازہ لگا لیا تھا اس لئے وہ بھی بخش علی کو پہچان کر بے اختیار اس کی طرف کھنچی چلی گئی اور پھر جیسے صدیوں سے پیاسے دل جامِ محبت سے لبریز ہونے لگے...... کبھی نہ جدا

ہونے کے لئے یک جان و دو قالب ہونے لگے...... وقت کم تھا اور حالات جان لیوا حد تک مخدوش......

''تمہارا نام کیا ہے اے اجنبی شہزادے......! تجھے زندہ دیکھ کر میں دوبارہ جی اٹھی ہوں۔ بہت مارا تھا ناں میرے بھائیوں نے تمہیں......؟'' ذرا دیر بعد شہزادی نے بہ آہستگی جدا ہو کر مخمور لہجے میں کہا۔

''بخش علی نام ہے میرا......!'' اس نے بتایا پھر محبت پاش لہجے میں شہزادی کے دلکش اور معصوم چہرے پر محبوبیت سے تکتے ہوئے مزید بولا۔ ''تمہاری خاطر مجھے جو بھی درد اور آزار ملے گا، وہ میرے لئے خوشی سے کم نہ ہوگا۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''تمہارا نام شہزادی ہے ناں......؟''

''ہاں......!'' شہزادی نثار ہو جانے والی نگاہوں سے بخش علی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

دونوں کی نگاہیں ایک پل کے لئے تو کیا بلکہ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لئے بھی ایک دوسرے کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں...... وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں محبت کا امرت پیتے ایک دوسرے کے دلوں میں اتر رہے تھے اور پھر تب جیسے اچانک ملنے والی اس غیر متوقع خوشی کے لمحات پر حالات دوراں کی گزیدگی نے شب خون مارا...... انہیں جلد ہی یہ باور ہونے لگا کہ ان کے پاس یہ چند لمحے مستعار ہیں اور انہیں جلد ہی دوبارہ جدا ہو جانا ہے۔ تب بخش علی نے محبت سے لبریز ہو کر شہزادی سے کہا۔

''شہزادی......! کیا میں تیرے بغیر پاگل ہو جاؤں گا۔ کیا...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم...... ہم کہیں دور، بہت دور چلے جائیں...... دو آزاد پنچھی بن کر کہیں دور اُڑ جائیں؟''

اپنے محبوب سریجن کے تڑپا دینے والے لب و لہجے نے شہزادی کو زیروزبر کر کے رکھ دیا...... اس کے دل و دماغ بے اختیار ہونے لگے...... محبوب کے معصوم لہجے نے اسے تڑپا دیا...... فرطِ محبوبیت سے شہزادی کا تنفس زیروزبر ہونے لگا۔ پھر جب وہ بولی تو اس کے لب و لہجے میں محبتوں بھری خودسپردگی کا ایک عالم آباد تھا۔

''میرے سریجن (محبوب)......! میرے دل کی حالت بھی ایسی ہی ہے، تمہارے بغیر میری روح مُردہ اور شریر مثل زندہ لاش ہے...... مجھے تیرے سوا کچھ بھی تو سجھائی نہیں

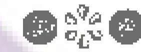
دے رہا..... تو جیسے بول، میں سر سے پاؤں تک تیار ہوں۔'' اس کی آواز جذبات کے طوفانی تلاطم سے لبریز ہوتی جا رہی تھی۔

بخش علی بھی اسی لہجے میں بولا۔ ''ہم بھاگ چلتے ہیں۔''

''ہاں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' شہزادی نے فوراً بھیدوں بھرے لہجے میں کہا۔ پھر اس نے بخش علی کو یہ بھی بتا دیا کہ اس کی عنقریب ایک قریب کے گوٹھ کے زمیندار کے بیٹے ہشام خان کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔ اس اطلاع پر بخش علی کے چہرے پر تشویش اور سرکشی کے آثار ظاہر ہونے لگے اور وہ لحظہ بھر کے لئے کسی سوچ میں مستغرق ہونے کے بعد شہزادی کے معصوم اور خوبصورت چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''بس پھر ٹھیک ہے، آج رات ہی ہم کہیں دور نکل جاتے ہیں، اللہ کی زمین بڑی ہے، وہی ہماری رکھوالی بھی کرے گا۔'' بخش علی نے جیسے حوصلہ دیا۔

اس کے بعد دونوں جدا ہو گئے۔ مگر ان کی جدائی ہمیشہ ملاپ پر منتج ہونے والی تھی..... آج کی رات.....



شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ لالقو نے آج کی رات بھٹے میں رہ کر گزارنی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا اور جب ہوتا تو لالقو پہلے ہی سے اپنی بیوی سدھوری کو بتا دیا کرتا تھا تاکہ وہ اس کا انتظار کرنے کی بجائے سرِشام ہی بچوں کے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جلد بستر پر آرام کرنے کے لئے لیٹ جائے۔ مگر اس پر سدھوری کو ذہنی کوفت سی ہوتی تھی مگر وہ شوہر کی کاروباری مجبوری کی خاطر چپ سادھ لیتی تھی۔ درحقیقت آج کل راج مستریوں کو اس کے بھٹے پر بننے والی اینٹوں کی شکایت رہنے لگی تھی کہ وہ صحیح طور پر پکی ہوئی نہیں ہوتیں، اینٹ دو ٹکڑے ہو جایا کرتی تھی۔ بلاشبہ یہ بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی کام چوری کا نتیجہ تھی۔ اینٹیں عموماً رات ہی میں ''شب دیگ'' کی طرح بھٹی میں پکتی رہتی تھیں اور اس لئے ساری رات آگ کے سامنے کھوہ کے اندر نظرداری رکھنی پڑتی تھی..... لالقو کی غیر موجودگی میں یہ کام تساہل کا شکار ہو رہا تھا اس لئے اب اکثر ایسے موقع میں خود ہی مزدوروں کے سر پر موجود رہنا چاہئے تھا۔

بہرطور سدھوری سرِشام ہی گھر کے کاموں سے فراغت پا کر اور تینوں بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد ننھے منٹھار کو لے کر اپنے کمرے میں ایک چارپائی پر دراز ہو گئی..... منٹھار کو وہ اپنے ساتھ سلاتی تھی، کونجاں اور علی محمد دوسرے کمرے میں سوتے تھے۔

رات کے کسی پہر سدھوری کی آنکھ اچانک کھلی..... اسے حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید پیاس کی شدت کی وجہ سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔

سدھوری بہ آہستگی چارپائی سے اٹھی۔ پھر ایک بلی پر جھولتی لالٹین اٹھا کر اس کی دھیمی لو ذرا تیز کر کے کوٹھڑی سے باہر آ گئی..... باہر سردی کی کاٹ موجود تھی مگر سدھوری نے ایک موٹی رلی اپنے اوپر ڈال رکھی تھی۔

ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ اسے آدھی رات کو پانی کی ضرورت پڑے۔ بہرطور تاروں کی مدھم روشنی میں صحن کے ایک کونے میں گھڑونچی پر رکھے مٹکے سے اس نے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹاغٹ پی گئی۔

پانی پی کر جب وہ پلٹی تو سامنے دوسری کوٹھڑی کے دروازے پر نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح چونکی..... یہ کونجاں اور علی محمد کا کمرہ تھا مگر وہاں سے ہلکی ہلکی روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اندر کوئی جاگ رہا ہو۔ سدھوری کا دل یکبارگی دھڑکا۔ پھر وہ آنکھیں سکیڑتی ہوئی کوٹھڑی کی طرف بڑھی۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ سدھوری نے ان دونوں کو سونے سے پہلے دروازہ اندر سے بند کرنے کی تلقین کی تھی۔ سدھوری کی پیشانی پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا..... اس نے دروازے پر دستک دینے کی بجائے دروازے کے ایک پٹ کی جھری سے اپنی آنکھیں چپکا دی..... اندر کا منظر واضح تھا اور قدرے عجیب بھی.....

اندر ایک چارپائی پر کونجاں رلی اوڑھے گہری نیند سوئی ہوئی تھی جبکہ دوسری چارپائی پر علی محمد بیٹھا تھا..... اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور اس نے اپنے ہاتھوں میں کوئی شے تھام رکھی تھی جسے وہ اپنے غم زدہ چہرے کے سامنے کئے دیکھ دیکھ کر روئے چلا جا رہا تھا..... اس کے رونے کی آواز دھیمی دھیمی سسکیوں کی صورت ابھر رہی تھی۔

سدھوری نے یہ دیکھا تو ہکا بکا رہ گئی۔

جب سے علی محمد اس سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا..... سدھوری نے اپنی توجہ سب

سے زیادہ اس پر دینی شروع کر دی تھی لہٰذا اب جو اس نے علی محمد کو رات کے اس پہر چپکے چپکے روتے اور سسکتے دیکھا تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

اس نے چند ثانئے کے لئے کچھ سوچا پھر دروازے پر ہلکی سی دستک دی...... تھوڑی دیر بعد اندر سے چارپائی چرچرائی اور علی محمد کی آواز ابھری۔ ''کون ہے؟''

''پت علی محمد! میں ہوں، تیری ماں......'' سدھوری نے حلق میں اترنے والے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تم...... تم میری ماں نہیں ہو...... جاؤ...... میں دروازہ نہیں کھولوں گا'' اندر سے علی محمد کی اندوہ گیں آواز ابھری۔

اس معصومانہ اور رقت بھرے لہجے میں ایک دُکھ بھری سی ضد تھی جس نے سدھوری کا دل چیر کر رکھ دیا۔

اس نے بڑے پیار بھرے لہجے میں دوبارہ اسے پکارا۔ ''پت علی محمد...... ! در کھول...... دیکھو میری بات مان لو، میں بھی تیری ماں جیسی ہوں۔''

پھر تھوڑی دیر بعد اندر سے چارپائی کے چرچرانے کی آواز ابھری...... سدھوری کا دل فرطِ امید سے دھڑکا اور اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا۔ سامنے وہ کھڑا تھا...... معصوم بچے کی طرح ستے ہوئے چہرے کے ساتھ......

ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی کہ وہ ایسے غم میں مبتلا ہو گیا تھا جس نے اس کی نفسیاتی اور ذہنی حالت تلپٹ کر دی تھی...... اس کی معصوم آنکھوں میں آنسو تھے...... سدھوری کا دل پسیج گیا...... اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر علی محمد کو گلے لگایا تو اچانک علی محمد کے ہاتھوں سے کوئی شے سی چھوٹ کر زمین پر گری۔

سدھوری سے علیحدہ ہو کر جب اسے اٹھانے کے لئے وہ جلدی سے جھکا تو سدھوری کی بھی نظر اس پر پڑی تھی...... وہ ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی...... کسی عورت کی، ایک سیدھی سادی عورت کا پُر نور چہرہ تھا...... وہ تصویر جس پر ممتا کی حلاوت ثبت تھی۔

سدھوری نے علی محمد کے معصوم اشک بار چہرے پر پیار بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تیری ماں کی تصویر ہے؟''

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ علی محمد نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''مجھے دکھاؤ یہ تصویر......'' سدھوری نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے رسان کے ساتھ کہا اور علی محمد نے تصویر والی ہاتھ دراز کر دیا۔ سدھوری نے تصویر لی اور ایک نظر دیکھ کر دوبارہ اسے تھماتے ہوئے خوش کن لہجے میں بولی۔

''بڑی پیاری ماں ہے تمہاری، ضرور تم سے محبت بھی کرتی ہوگی۔''

علی محمد نے ہولے سے سر جھکا دیا۔

''تم ہو جو اتنے پیارے......'' سدھوری نے ازراہ ہمدردی اور محبت اس کے بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر فرطِ محبت سے علی محمد کو اپنے سینے سے لگا لیا...... اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ پھر وہ علی محمد کا سر چومتے ہوئے محبت سے لبریز لہجے میں بولی۔

''علی محمد...... ! میں بھی تمہاری ماں جیسی ہوں، کیا میں بری ہوں، تجھے مارتی ہوں، بتا مجھے، میری اولاد ہو، میرا سب کچھ تم ہی تو ہو۔'' سدھوری کے لہجے میں ایسی اپنائیت اور انسیت گھلی تھی کہ علی محمد بے اختیار بلک بلک کر رونے لگا۔

''نہ...... نہ علی...... ! مت رو...... تیری عمر ہی کیا ہے ڑے۔ کیوں خود کو جلاتا ہے تُو۔ پتہ ہے تمہاری ماں اللہ سائیں کے پاس بہت خوش ہے اور تمہیں دیکھ رہی ہوگی، جب تم روتے ہو ناں اسے بھی بہت دُکھ ہوتا ہوگا۔ چلو آؤ کھاٹ پر۔ میں تمہارے ساتھ سوؤں گی۔'' پھر علی محمد کی ہچکیاں بندھ گئیں اور پھر سدھوری اسے بہ آہستگی تھامے چارپائی پر دراز ہو گئی...... علی محمد اس کے پہلو میں لیٹ گیا اور پھر حیرت انگیز طور پر وہ جلد ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔



شہزادی سے ڈرامائی انداز میں ملاقات کے بعد جب بخش علی تیکھی کٹار لالاں کے ساتھ پڑاؤ پر پہنچا تو عمر رسیدہ کولبی جیسے انہی کا منتظر تھا۔

وہ اپنی بیٹی لالاں کو دیکھتے ہی بولا۔ ''دھی! اب آپڑاں جیادہ دیر ہتھ رہنا چنگا نہیں، اس کنجڑے کادو نے وری دھمکی دی ہے۔''

اس خبر پر دونوں چونکے...... لالاں کے چتون مزید تیکھے پڑنے لگے...... بخش علی نے کسی خیال کے تحت کولبی سے پوچھا۔ ''تمہیں اس دھمکی کا کیسے پتہ چلا......؟''

"اس کا ماڑوں آیا تھا، یہ کہہ کر چلا گیا کہ کادو آپڑیں بالک واپس لینا چاہ رہا ہے۔ اگر سیدھی طرح نہیں دو گے تو جانی نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

یہ سیدھی سیدھی قتل کی دھمکی تھی جس سے کوبلی خاصا خوف زدہ نظر آ رہا تھا مگر لالاں کے چہرے پر غصے اور قدرے تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

"میرا خیال ہے ہمیں تیرے بابا کی بات مان لینی چاہیے لالاں......!" بخش علی نے ذرا دیر پُرسوچ خاموشی کے بعد لالاں سے کہا۔

"لیکن اس طرح آخر ہم کب تک اور کہاں تک بھاگتے رہیں گے؟" لالاں نے عجیب سے مگر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی بات معقول تھی...... تینوں کے بشروں پر خاموشی چھا گئی۔

سرمئی شام کے سائے اپنے جلو میں سردی کی کاٹ لئے دراز ہونے لگے تھے...... وہ لوگ اپنی اس گمبھیر نوعیت کی گفتگو کو ملتوی کر کے ایک دوبانسے کے اندر آ کر بیٹھ گئے۔

میرو نامی چھوکرے نے فوراً کوئلوں کی ایک انگیٹھی سلگا کر رکھ دی۔ اس میں کوئلوں کی جگہ خشک اوپلے ڈالے گئے تھے۔ عام حالات میں بخش علی یہاں ایک لمحے کے لئے بھی رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا مگر چونکہ معاملہ جذبۂ دل کا تھا اس لئے یہ صعوبتیں بھی اسے محبوب کی خاطر خندہ پیشانی کے ساتھ قبول تھیں اور اس میں وہ ایک مزہ سا محسوس کر رہا تھا۔ انگیٹھی پر شعلے پوری طرح بھڑکنے لگے تھے۔ پوری طرح سلگنے کے بعد اب وہ زیادہ دھواں نہیں پھیلا رہے تھے۔

تینوں زمین پر رلی بچھائے گھٹنے سکیڑے دم بخود سے بیٹھے تھے...... اثنائے راہ میرو سبز چائے کے تین پیالے ان کے سامنے رکھ کر خاموشی سے نکل گیا۔

"میرا خیال ہے تم لوگوں کو اپنی برادری کے کسی معتبر سردار سے بات کرنی چاہیے۔"

سردست اپنا معاملہ بھول کر بخش علی نے ان کے مسئلے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے لالاں کے کبیر سن باپ کوبلی کو تجویز دی۔ لالاں کو اس کی تجویز معقول محسوس ہوئی تھی مگر وہ خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ ادھر گرگ باراں دیدہ کوبلی، بخش علی کی طرف کچھ ایسی مستفسرانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس نے محسوس کر لیا کہ بخش علی کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔

بخش علی نے مزید کہا۔ "موجودہ حالات میں یہی ایک صورت ہے۔ کیونکہ کادو جانتا ہے کہ تم لوگ قبیلے برادری سے دھتکارے ہوئے لوگ ہو۔ اسی لئے وہ تمہاری اس مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی آخر تک کوشش کرے گا جب تک کہ اپنے "مقصد" میں کامیاب نہیں ہو جاتا۔"

بخش علی کے اس بے رحم تبصرے پر نہ صرف کوبلی بلکہ پہلی مرتبہ لالاں کے چہرے پر بھی تشویش کے سائے نمودار ہوئے...... شعلوں کی روشنی میں اس کا سانولا چہرہ کندن بنا دہک رہا تھا...... وہ اب ایسی نظروں سے بخش علی کی طرف تکنے لگی تھی جیسے اسی سے ہی اس مسئلے کا حل بھی معلوم کرنا چاہتی ہو۔

بخش علی بہرحال ان لوگوں کو اپنا محسن سمجھتا تھا اور صدقِ دل سے ان کی مدد کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ خود بھی شہزادی سے متعلق گمبھیر حالات کی زد میں مبتلا ہونے والا تھا اس لئے وہ جانتا تھا کہ آئندہ کے حالات...... اسے بھی انہی کی خاطر خانہ بدوشی میں بسر کرنا پڑ سکتے تھے۔ تاہم اس نے دھواں اڑاتے پیالے کو ہونٹوں سے لگا کر ایک طویل اور سیر بخش چسکی بھری پھر آنکھیں سکیڑ کر کوبلی سے مستفسر ہوا۔

"ویسے اگر تم لوگ مجھے کادو کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتانا پسند کرو تو میں شاید مزید اس مسئلے پر غور کر سکوں۔"

بخش علی کی بات سن کر دونوں باپ بیٹی نے ایک دوسرے کی طرف خاموش نظروں سے دیکھا پھر کوبلی بتانے لگا۔

"ہمیں برادری سے نکلوانے میں اس مردودے کا بڑا ہاتھ ہے......" کوبلی نے ابھی اتنا ہی بتایا تھا کہ لالاں یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر کسی جھونپڑی کی طرف بڑھ گئی۔

"کادو میری اس لالاں کا شوہر ہے۔ وہ اسے بری راہ پر لگانا چاہتا تھا، انکار کرنے پر اس نے انتقاماً لالاں پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگا دیا۔ میں اپنی دھی لالاں کو چنگی طرح جانتا ہوں، وہ عزت کی خاطر جان دینے والی چھوکری ہے، میں نے جب یہ سنا تو اپنے غصے پر قابو نہ پا سکا اور کادو کا سر ڈنڈے سے پھاڑ ڈالا۔ پنچائیت بیٹھی...... کادو نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے خاندان کے کچھ افراد پر بھی من گھڑت الزامات لگائے، بعد میں فیصلہ ہوا اور ہمیں اپنے قبیلے سے نکال دیا گیا۔"

وہ اتنی صراحت کر کے چپ ہو رہا...... اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سی تمازت کھنڈ آئی تھی۔ بخش علی نے لمحہ بھر توقف کے بعد پوچھا۔

"چاچا......! کیا پنچایت نے لالاں کو اپنے دونوں بچے ساتھ لے جانے کا کہا تھا؟"

"ھاؤ صاحب......!" کوبلی یک دم جوش سے بولا۔ "یہی تو ایک فیصلہ تھا جو بہت سے ہمارے ساتھ کیئے گئے ناحق فیصلوں میں ایک تھا جو خلاف توقع ہمارے حق میں ہوا تھا۔"

ماحول میں ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی...... ایک پُرسوچ اور گمبھیر خاموشی......

پھر چند ثانیے بعد بخش علی نے ہی مہر سکوت توڑی اور ہولے سے کھنکارتے ہوئے کوبلی سے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو اپنے سرپنچ کے سامنے اس کی فریاد کرنی چاہیے۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا سائیں۔" کوبلی نفی میں سر ہلاتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولا اور اضافہ کیا۔ "جنہیں ایک بار قبیلہ یا برادری سے نکال دیا جاتا ہے پھر اس کا برادری سے کوئی سمبندھ نہیں رہتا۔"

"مگر کادو کی بدمعاشی کے بارے میں تم کیا کہو گے...... اگر تم لوگوں کا کوئی تعلق واسطہ برادری سے نہیں رہا ہے تو پھر کادو کو بھی تمہیں ستانا نہیں چاہیئے۔ اگر باوجود اس کے وہ ایسا کر رہا ہے تو تم حق رکھتے ہو کہ واپس جا کر اس کی شکایت کرو۔" بخش علی نے کوبلی کی طرف دیکھ کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

اب کوبلی کو بخش علی کی بات سمجھ میں آنے لگی تھی...... وہ پُرسوچ انداز میں دھیرے دھیرے اپنے سر کو جنبش دینے لگا تھا۔

پھر ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر باہر چلا گیا...... باہر تاریکی تھی...... سامنے ایک قریبی جھونپڑی سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ کوبلی باہر نکل کر سیدھا اسی جھونپڑی میں داخل ہوا تھا...... یہ وہی جھونپڑی تھی جدھر ابھی تھوڑی دیر پہلے لالاں نے رخ کیا تھا...... کوبلی کے جھونپڑی میں داخل ہونے کے خاصی دیر بعد لالاں وہاں سے نمودار ہوئی...... ایک میلی سی موٹی چادر اوڑھے تیز تیز قدموں کے ساتھ...... بخش علی کو ممنون نگاہوں سے

دیکھتی ہوئی خوشی سے بولی۔

"را سائیں...... تُو نے بابا کو تو بڑی چنگی صلاح دی ہے۔ مجھے یقین ہے ہمرا سردار اس بار ضرور انصاپھ کرے گا۔ پھر کچہری کا کنون (قانون) بھی تو شہر کی عدالتوں کی طرح اندھا ہوتا ہے، ہمری کون بات مانے گا، کوئی گواہ بھی نہیں ہمرے پاس...... وہ مردود کادو تو دس، بیس گواہ لے آئے گا۔"

"تو کیوں گڑتی (فکر) کرتی ہے اس کی۔ میں ہوں نا...... کیا میری گواہی کافی نہیں ہوگی؟" بخش علی نے مسکراتے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا تو لالاں کے چہرے کی خوشی دیدنی ہوگئی...... وہ بچوں کی طرح آنکھیں پھیلا کر بخش علی سے بولی۔

"سچ سائیں......؟"

"ہاں......!" بخش علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر یکدم اس کے چہرے پر گہری متانت طاری ہوگئی جیسے اچانک ہی کسی بات پر اداس ہوگیا ہو اور اسے کچھ یاد آنے لگا ہو۔ گھاگ لالاں سے بخش علی کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی، یکدم بولی۔

"صائب......! کیا گالھ (بات) ہے۔ تُو نے بتایا ہی نہیں، تیری شہزادی سے کیا باتیں ہوئیں؟"

"ہم دونوں نے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" بخش علی نے عجیب سے لہجے میں بتایا تو لالاں کو ایک جھٹکا لگا پھر جیسے اس کے لبوں سے الفاظ پھسلے۔

"ی...... ی...... یہ کیا...... کیا کہہ رہے ہو صائب......؟"

"صحیح کہہ رہا ہوں میں۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں...... کچھ سن کر شہزادی نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی ہشام خان نامی شخص سے شادی طے کر دی گئی ہے۔"

لالاں کو ایک اور جھٹکا لگا مگر پھر اس نے بخش علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

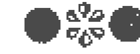
"صائب......! میرا خیال ہے شہزادی کو بھگا لے جانا چنگا نہیں ہوگا آپ دونوں کے لئے...... کیا تم کو مالوم نہیں صائب! کہ یہ لوگ عورتوں کے معاملے میں کتنے بے رحم ہوتے ہیں، تم دونوں کب تک ان سے چھپتے پھرو گے، سال...... دو سال...... پانچ سال...... دس سال......!"

"بس...... بس...... خدا کے لئے لالاں! بس کرو۔ تم تو میرا حوصلہ ہی توڑے دے

رہی ہو۔'' بخش علی نے نا امیدی اور قدرے دل مسوس کر کہا۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا صائب......!'' لالاں جلدی سے بولی۔ ''چنگا...... جو تیرا من کرے، وہ کر...... اللہ سائیں بڑا ہے...... وہ تمہاری خیر کرے گا...... رب سائیں کا جتنا نام، اتنا آسرا......'' اتنا کہہ کر وہ خاموش نظروں سے بخش علی کا چہرہ تکنے لگی۔

ایک اٹل فیصلے کی تپش سے بخش علی کا چہرہ سلگتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔



رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

وڈیرے مشوری خان کی حویلی پر گمبھیر سناٹا طاری تھا...... حویلی کے چہار اطراف گہری کہر کی چادر سی تنی ہوئی تھی...... رگوں میں خون برفاب بناتی سردی بھی عروج پر تھی۔ معاً حویلی کی عقبی سمت جدھر جابجا ڈھینگر پھیلے ہوئے تھے، ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس نے موٹی سی چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ وہ چوروں کے سے انداز میں حویلی کی عقبی اور قدرے سیلن زدہ دیوار کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔

حویلی کی عمارت کے اس حصے میں چونکہ پانی اور سیوریج وغیرہ کی پائپ لائنیں نصب تھیں اس لئے یہ حصہ خاصا سالخوردہ اور قابل مرمت ہو رہا تھا...... اس حصے کی دیوار کی بالائی سمت میں شہزادی کے کمرے کا دریچہ کھلتا تھا۔

وہ پراسرار سایہ اب ذرا قریب پہنچ کر سر اٹھائے دریچے کی طرف تکے جا رہا تھا...... یہ بخش علی تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک ڈھیلا زمین سے اٹھا کر دریچے کی طرف اچھال دیا...... دریچے کے بند چوبی کواڑ سے ڈھیلا ٹکرا کر بھربھرا گیا...... آواز اگرچہ اتنی زیادہ پیدا نہیں ہوئی تھی مگر بخش علی کو اندازہ تھا کہ اندر کمرے میں اس کی منتظر بیٹھی شہزادی کے لئے اتنی ہی آواز بہت تھی۔

اگلے ہی لمحے دریچے کے دونوں پٹ وا ہوئے، دبیز لہراتے ہوئے پردے کی جھلک کے ساتھ ہی کسی نے بے تابی سے نیچے جھانکا۔

نیچے سرد تاریکی میں کھڑے بخش علی نے اپنا ہاتھ ہلا دیا...... وہ شہزادی کو دیکھ چکا

تھا...... جواباً اس نے بھی ویسا ہی اشارہ دیا تھا اور پھر کھڑکی کے پٹ دوبارہ بند ہو گئے۔

بخش علی اب پھر واپس ڈھینگروں کی طرف کھسک گیا تھا...... اسے اپنے سینے میں دل زور زور سے دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا...... اس کی زندگی اب ایک طوفانی انقلاب سے دوچار ہونے والی تھی جس میں کٹھنائیاں بھی تھیں تو محبوب کی سنگت میں اس کی خوش آرائیاں بھی...... مصائب و آلام کی خونچکاں گردشیں بھی تھیں تو محبوب کی پیار بھری قربتیں بھی...... ظالم سماج کی چیرہ دستیوں کا خوف بھی تھا تو خوش آئند مستقبل کے حسین خواب بھی......

بخش علی کو ڈھینگروں کی آڑ لئے دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ سامنے دیوار کی آڑ سے ایک انسانی ہیولا طلوع ہوا۔

یہ شہزادی تھی...... اس نے ایک رنگین خانوں والی موٹی رلی اوڑھ رکھی تھی...... بخش علی نے اسے دیکھتے ہی فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی...... وہ دونوں اب ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے...... آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے اپنے عہد کے ایفا پر فخر کر رہے تھے...... بخش علی نے محسوس کیا شہزادی کے ملیح و صبیح چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ کے آثار نہ تھے بلکہ اس کا چہرہ...... خوشی کے مارے دمک رہا تھا۔

بخش علی نے شہزادی کا ہاتھ تھام لیا اور قدم آگے بڑھائے۔ پھر چند ہی لمحوں بعد دونوں تاریکی کا حصہ بن چکے تھے......!

سرد...... اور اندھیری رات میں وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے تیز تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہانپتے لرزتے چہروں پر جوش کی تمازت بھی تھی تو خوشی اور تمرد کی تمتماہٹ بھی...... ایک ایسا جوش...... ایک ایسا تمرد جو درانہ وار آتش نمرود میں کود پڑنے کا حوصلہ بخشتی ہے...... اور یہی حوصلہ فنا کا موجب بھی بن سکتا ہے تو دوسری طرف درماندہ حیات کو گلدستۂ بہاراں عطا کرنے کا باعث بن کر زندگی کو امر بھی بنا دیتا ہے۔ یہ سارا ''خرابہ'' آتش عشق کا ہوتا ہے۔ فنا اور بقا کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا لیکن مغلوب العشق فرزانوں کو اس کی پرواہ بھلا کب ہوتی ہے۔ اگرچہ خرد کا مسکن دماغ، ان کے دل کے کہیں عمیق گوشوں میں اس اقدام دیوانگی پر انجانے خوف اور پُرخطر حالات کا ''اشارہ'' ضرور دے رہا تھا...... لیکن بخش علی اور شہزادی بلا خوف و خطر

آگے ہی آگے کبھی دوڑتے، کبھی چلتے اور کبھی رکتے۔ بالآخر آسرین کے جنگل سے پار ہو گئے۔ اب سامنے ٹھٹھرتی ہوئی تاریکی میں لالاں کے فروکش خاندان کے عارضی ''پڑاؤ'' کی جھونپڑیوں سے دھیمی دھیمی روشنی سی نظر آنے لگی تھی۔ شہزادی نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اسے ضرورت بھی تھی جاننے کی کہ بخش علی اسے کدھر لے جا رہا تھا۔ بس آنکھیں بند کیے وہ اس کے ساتھ ہو لی تھی۔

''شہزادی......! وہ سامنے جدھر روشنی نظر آ رہی ہے وہی ہماری محفوظ پناہ گاہ ہے۔'' بخش علی نے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے شہزادی سے کہا۔

''میرے سریجن......! میری پناہ گاہ تو اب صرف تمہارے بازوؤں میں ہے۔'' جواباً شہزادی نے بڑے رسان سے کہا اور بخش علی نے شہزادی کے مرمریں ہاتھ پر گرفت مزید سخت کر دی۔

پھر ذرا ہی دیر بعد وہ ایک دوبانسے کے اندر آ گئے۔ یہاں وسط میں انگیٹھی روشن تھی جس کے گرد اب یہ دونوں بیٹھے سردی سے شل اپنے جسموں کو گرم کیے ہوئے تھے۔ لالاں بھی وہاں موجود تھی بلکہ وہ انہی کی منتظر تھی۔ اس نے میرو کے ہاتھ دودھ کے دو گرما گرم پیالے منگوا کر ان دونوں کے ہاتھوں میں تھما دیئے اور خود اب فرش پر پھسکڑا مارے بڑی دلچسپ نظروں سے شہزادی کو دیکھ رہی تھی۔

شہزادی کے معصوم حُسن نے اسے بڑا متاثر کیا تھا۔ شہزادی کی حسین کجراری آنکھوں میں حسین خوابوں کا خمار اور خوش آئند مستقبل کی خواہشات کے جگنو چمک رہے تھے۔ لالاں اسے کافی دیر تک اس طرح یک ٹک تکے جا رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو لالاں...... میری پسند...... تمہیں اچھی نہیں لگی شاید......'' دفعتہً بخش علی نے لالاں کو بدستور خاموش مگر گہری نظروں سے شہزادی کی طرف تکتے رہنے پر قدرے مسکرا کر پوچھا تو لالاں یک دم چونکی پھر بے اختیار اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ وہ ہنوز شہزادی پر نظریں جمائے ہوئے بخش علی سے مخاطب ہو کر بولی۔

''صاحب......! یہ تو واقعی شہزادی ہے...... جسے رب سائیں نے تمہارے جیسے شہزادے کے لئے ہی بنایا ہے۔ ایسا لگتا ہے، مجھ غریب کی جھونپڑی میں چاند نکل آیا

ہے۔ صاحب تم واقعی بہوت کھس گسیب (خوش نصیب) ہو۔''

لالاں کے تبصرے پر شہزادی کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا اور دلکش لبوں پر حسین مسکراہٹ عیاں ہو گئی۔ پھر ذرا دیر بعد بخش علی نے اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں لالاں کو مختصراً آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''لالاں......! ہمارا ابھی کچھ عرصہ ادھر قیام رہے گا۔ اس کے بعد میں شہزادی کو شہر لے جاؤں گا۔ وہاں عدالت میں ہم دونوں نکاح کریں گے۔ پھر میں اپنی ماں اور چھوٹی بہن سمیت بلوچستان کی طرف نکل جاؤں گا۔''

اس نے اپنی بات مکمل کی تو لالاں کے چہرے پر گہری سوچ کا جال سا بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بخش علی اور شہزادی کا یہاں رہنا مناسب نہ تھا۔ شہزادی کسی عام ہاری کی بیٹی نہیں تھی۔ وہ ایک بااثر وڈیرے کی بیٹی تھی۔ وہ آناً فاناً پورے علاقے کو کھنگال کر رکھ دے گا اور جہاں ان کا پڑاؤ تھا، وہ بھی شہزادی کے گوٹھ کی سرحد پر ہی واقع تھا۔ ایسی صورت میں ان دونوں دیوانوں فرزانوں کا ادھر ایک پل بھی رہنا خطرے سے خالی نہ تھا لیکن وہ نجانے کیوں اس بات کا اظہار بخش علی سے نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ اس کی بات کا غلط مطلب نہ لے کہ اس پر وہ دونوں بوجھ یا مصیبت بن رہے ہوں۔ بخش علی کی نظروں نے لالاں کے چہرے پر تردد کے آثار بھانپ لئے لہٰذا اسے مخاطب کر کے بولا۔

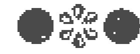
''کیا سوچ رہی ہو لالاں...... تمہارے دل میں کوئی شک و شبہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ مجھے یقین ہے تمہاری ہر بات ہمارے مفاد میں ہی ہو گی۔'' بخش علی نے جیسے لالاں کی مشکل آسان کر دی۔ اس نے بڑے رسان کے ساتھ ایک نگاہ شہزادی پر ڈالی اور بخش علی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل کی بات بتا ڈالی۔ مگر خلاف توقع اس نے دیکھا کہ اس کی بات پر بخش علی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی تھی، وہ بولا۔

''لالاں......! تمہاری بات ہمارے مفاد میں سہی لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس وقت موجودہ حالات میں تمہارا یہ مختصر ''پڑاؤ'' ہماری محفوظ ترین پناہ گاہ ہے۔'' اس نے چند ثانیے توقف کیا۔ لالاں حیرت اور الجھن کے ملے جلے آثار چہرے پر لئے اسے تکے جا رہی تھی۔ بخش علی نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ہاتھی کو اپنے قد کے برابر ہی اونچائی نظر آتی ہے۔ ان کے سان وگمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ان کی ناز و نعم میں پلی بیٹی خانہ بدوشوں کے بیچ موجود ہے۔" اس نے اپنی بات ختم کی تو لالاں خوشی سے چلا اٹھی۔

"واہ صاحب...... واہ......! کیا ترکیب لڑائی ہے۔ ویسے میرا خیال ہے ہمیں پھر بھی کم از کم اس جگہ سے کہیں اور اپنا ڈیرا ڈالنا چاہیئے۔"

بخش علی نے اثبات میں دھیرے سے اپنا سر ہلاتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کیا۔



حسنہ خاتون صبح کا ناشتہ ہمیشہ اپنی بیٹی شہزادی کے ساتھ ہی کرتی تھی۔ عموماً وہ صبح دیر سے ہی جاگتی تھی اور اکثر شہزادی کے ساتھ ہی کمرے میں سویا کرتی تھی لیکن اس رات جب شہزادی نے گھر سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا، وہ دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ جاگی تو ایک دھماکہ خیز اطلاع اس کی منتظر تھی جس نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ اس کی بیٹی شہزادی اپنے کمرے میں موجود نہ تھی...... پھر تو پوری حویلی میں کہرام مچ گیا...... ہر طرف شہزادی کی "ڈھنڈیا" پڑ گئی۔ بے چاری حسنہ خاتون نے کلیجہ تھام لیا۔ وڈیرا مشوری خان اور اس کے دونوں بیٹے رستم خان اور وزیر خان غیظ و غضب کے عالم میں لال پیلے ہو رہے تھے۔ نوکروں، چاکروں، اپنے خاص آدمیوں حتیٰ کہ خود وڈیرا مشوری خان نے اپنے دونوں بیٹوں سمیت پورے علاقے کو چھان مارا۔ مگر شہزادی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ شامت شہزادی کی ماں حسنہ کی آ گئی۔

"حسنہ......! شہزادی تو تیرے ساتھ سویا کرتی تھی بابا...... اور تجھے پتہ بھی تھا کہ اڑیں شہزادی کن حالات سے گزر رہی ہے۔ پھر تُو نے اسے اکیلا کیوں چھوڑا۔"

زیرک وڈیرا مشوری خان کو فوری اندازہ ہو گیا تھا اس حقیقت کا کہ اس کی بیٹی نے از خود گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔ اگرچہ اس معاملے میں اجنبی کی ترغیب کا بھی دخل ضرور رہا ہوگا۔ ایسے میں وڈیرے مشوری خان کو اپنی بیوی حسنہ خاتون پر شک ہوا تھا کہ ہو سکتا ہے شہزادی کا کام مزید سہل کرنے کے لئے اس کی ماں بھی پیش پیش ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وڈیرے مشوری خان نے اپنی بیوی کی طرف پُر تشکیک نظروں سے گھورتے

ہوئے اس سے پوچھا تو بے چاری حسنہ خاتون کا خون خشک ہو گیا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے گڑگڑا کر روہانسے لہجے میں بولی۔

"سی...... سائیں...... میں ہر روز شہزادی کے ساتھ ہی سویا کرتی تھی لیکن اس رات میں دوسرے کمرے میں سو گئی تھی۔"

"شہزادی...... اتنا بڑا قدم تیری مدد کے بغیر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ یہ بتا کیا وہ مردود اجنبی شخص آیا تھا یہاں اس رات......؟" وڈیرے نے دھاڑ کر پوچھا تو حسنہ خاتون کے پاؤں سے زمین سرکنے لگی۔

شوہر کے منہ سے یہ الزام سن کر اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اس وقت اس کے دونوں بیٹے رستم خان اور وزیر خان بھی وہاں موجود غصے سے ماں کی طرف گھور رہے تھے۔

آج حسنہ خاتون کو اپنا شوہر اور وہ دونوں گھبرو بیٹے بالکل اجنبی بلکہ اپنے خون کے پیاسے محسوس ہو رہے تھے تاہم اس نے ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "سس...... سائیں......! میں بے قصور ہوں...... بھلا ایک ماں...... اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کو جہنم کے گڑھے میں کیسے اتار سکتی ہے۔ کیا میں نہیں جانتی کہ شہزادی کی اس حرکت سے اسے کتنا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ مجھے...... مجھے تو اب شہزادی کی زندگی کی بھی فکر ستانے لگی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ سسک کر رو پڑی۔

وہ واقعی بے قصور تھی اور یہ حقیقت تھی کہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ شہزادی کے نادانی میں اٹھائے ہوئے اتنے بڑے قدم نے اسے اپنے باپ اور بھائیوں کی نظروں میں کتنا بڑا مجرم بنا دیا تھا جس کی سزا صرف اور صرف موت ہی ہو سکتی تھی۔ اس عبرتناک تصور سے حسنہ خاتون کا لہجہ رندھ گیا تھا۔ وڈیرے مشوری خان کو کسی حد تک اپنی بیوی کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں اس کی انا کی تسکین تھی۔ بہرطور...... پھر بھی حسنہ خاتون کو اس کا قصوروار گردانا گیا تھا کہ اس میں اس کی غلطی کا بھی دخل تھا۔ کیونکہ وہ اس کی ماں تھی اور سب سے زیادہ اس کے قریب تھی۔ اس لئے "اجنبی" والے واقعے کے بعد سے اس پر "کڑی نگاہ" رکھنا اس کا فرض تھا۔ لہٰذا حسنہ خاتون کی "سزا" کا فیصلہ سردست محفوظ رکھا گیا اور ایک بار پھر شہزادی کی

تلاش زور و شور سے ہونے لگی۔

گوٹھ میں یہ بات چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ مگر کسی فرد کو آپس میں کھلے بندوں وڈیرے کی بیٹی کے گھر سے بھاگ جانے پر تبصرہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ البتہ اس واقعے کے بعد سے حویلی کی بلند و بالا پیشانی پر بدنامی کا داغ ضرور لگ چکا تھا اور اب اس داغ کو دھونے کے لئے وڈیرے مشوری خان اور اس کے دونوں بیٹوں رستم خان اور وزیر خان نے سر جوڑ کر روایتی فیصلہ صادر کیا تھا کہ اب نہ صرف شہزادی کی واپسی کے دروازے بند ہو چکے ہیں بلکہ اب شہزادی کی حیثیت ان کے لئے بیٹی یا بہن کی سی نہیں رہی ہے بلکہ اب وہ ایک ''کاری'' لڑکی ہے جو واجب القتل ہے۔ لہٰذا اب اسے محض تلاش ہی نہیں کرنا تھا بلکہ اسے عبرتناک موت سے ہمکنار بھی کرنا تھا۔

اس واقعے کے بعد سے وڈیرا مشوری خان بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ اتنا کہ اب وہ چند ہی دنوں میں خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ تنہائی میں اپنی بیٹی کو یاد کر کے اس کی آنکھوں سے آنسو بھی نکل پڑتے تھے۔ شہزادی بہر حال اس کی لاڈلی بیٹی تھی مگر اس نے جو جرم کیا تھا، اس کے خاندان میں اس کی سزا صرف موت ہی تھی۔

وہ خود بھی مجبور تھا، اپنی برس ہا برس کی روایات سے...... ادھر اس کے دونوں ''سورما'' صفت بیٹے رستم خان اور وزیر خان بہن کو تلاش کرنے کے سلسلے میں اپنے باپ سے کچھ زیادہ ہی تیزی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اپنے باپ کے آدمیوں سے الگ ہو کر اپنے طور پر شہزادی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ لہٰذا باپ سے بات کرنے کے بعد ان دونوں نے آپس میں بھی مشورہ کیا اور بالآخر ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کے دماغ میں کوندا۔ سب سے پہلے یہ خیال چھوٹے بھائی وزیر خان کے دماغ میں آیا تھا۔ وہ جوش سے تمتماتے ہوئے بڑے بھائی سے بولا۔

''ادا سائیں...... ہو نہ ہو، شہزادی اس مردود اجنبی کے ساتھ ہی نکلی ہے اور اس میں اس کی سائیٹری (سہیلی) سدھوری کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

اس کی بات سن کر بڑے بھائی رستم خان کا ماتھا ٹھنکا اور مارے جوش کے اٹھ کھڑا ہوا اور سلگتی آنکھوں سے بولا۔

''تو نے بالکل ٹھیک کہا وزیرا! حیرت ہے میرا ابھی تک سدھوری کی طرف دھیان

کیوں نہیں گیا۔''

پھر دونوں بھائیوں نے رائفلیں، کلہاڑیاں سنبھال کر اپنے ساتھ چند مسلح حواریوں کو لیا اور لمبی سی بغیر ہڈ کی جیپ میں بیٹھ کر آندھی طوفان کی طرح لالقو کے گھر پہنچے۔ انہیں معلوم تھا کہ سدھوری اب لالقو کی بیوی بن چکی تھی۔ سدھوری اس وقت رسوئی میں مصروف تھی۔ لالقو کے آنے کا وقت ہونے والا تھا۔ سدھوری کو پتہ تھا کہ اسے کتنی بھوک لگی ہوتی ہے۔ وہ آتے ہی سب سے پہلے روٹی کا تقاضا کرتا تھا۔ لہٰذا اس کے آنے سے پہلے وہ کھانا تیار کر لینا چاہتی تھی۔ تینوں بچے ملٹھار، کونجاں اور علی محمد صحن میں کھیل رہے تھے۔

معاً سدھوری کے کانوں سے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ٹکرائی۔ وہ چونکی، پھر دوسرے ہی لمحے باہر عجیب سا شور ابھرا، اس کے بعد کسی نے دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دروازہ توڑ دینے کا ارادہ ہو...... سدھوری کا دل جانے کیوں سینے میں زور سے دھڑکا۔ وہ رسوئی سے نکلی تو اس اثناء میں علی محمد دروازہ کھول چکا تھا۔

سدھوری نے دیکھا دروازہ کھلتے ہی کسی نے علی محمد کو زور سے پرے دھکیلا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے سدھوری نے کچھ رائفل بردار افراد کو درانہ وار اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بری طرح چونکی۔ دو تین افراد کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں بھی تھیں۔ رستم خان اور وزیر خان پر نگاہ پڑتے ہی سدھوری کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا اور وہ سرتاپا لرز اٹھی۔ رستم خان نے ایک قہر آلود نظر متوحش سدھوری پر ڈالی پھر آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑ لیا اور ایک جھٹکا دیتے ہوئے غضبناک لہجے میں دھاڑا۔

''بتا شہزادی کہاں ہے اور وہ شہری اجنبی......''

جھٹکا اتنا شدید تھا کہ بے چاری سدھوری کو اپنے بال سر کی جلد سے اکھڑتے محسوس ہوئے۔ شدتِ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود رستم خان کی بات نے اسے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ ہوا کیا ہے اور اس سے پوچھا کیوں جا رہا تھا۔ ادھر تینوں بچے اس افتادِ ناگہانی پر خوفزدہ ہو کر ایک کونے میں جا دبکے تھے۔

"مس...... سائیں...... مم...... میں نہیں جانتی کچھ...... میں نے تو شہزادی سے اس دن کے بعد سے ملنا ہی چھوڑ دیا تھا۔" سدھوری نے خوفزدہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

تب وزیر خان طیش میں سدھوری کے قریب آیا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی۔

"بکواس کرتی ہے تُو...... تجھے پتہ ہے وہ کتا اجنبی شہزادی کو کدھر لے کر گیا ہو گا۔" وزیر خان شعلہ بار لہجے میں مضروب سدھوری کو گھورتے ہوئے بولا۔

مارے خوف کے سدھوری کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ علی محمد اپنے دونوں چھوٹے بہن بھائی کو اپنے حلقۂ تحفظ میں دبوچے کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے جو اپنی "ماں" کو تھپڑ کھاتے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ خوف کی جگہ اب طیش نے لے لی تھی۔ اس کے اس طیش نے اسے بہادرانہ جرأت عطا کی کہ وہ جنونی انداز میں آگے بڑھا اور وزیر خان کے پیٹ میں اپنے سر کی زوردار ٹکر ماری۔ گیارہ بارہ سالہ علی محمد چھوٹا ضرور تھا مگر وہ ایک صحت مند اور اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں دراز قد تھا۔ سر کی ٹکر لگنے پر وزیر خان تھوڑا پیچھے کو لڑکھڑایا تھا۔ نازک جگہ پر ایسی ضرب نے اسے خاصی تکلیف میں مبتلا کر دیا تھا۔ علی محمد نے اس پر ہی بس نہیں کیا تھا، اس نے رستم خان کی جانب بھی ایسی ہی جرأت انگیز پیش قدمی کی اور رستم خان کے پیٹ میں اپنی لات رسید کرنی چاہی لیکن اتنے میں وزیر خان سنبھل چکا تھا۔ اس نے لپک کر علی محمد کو جا دبوچا اور قمیض کا کالر پکڑ کر اسے زور سے اپنی جانب کھینچ کر بے دردی سے پرے دھکیل دیا۔ معصوم علی محمد لڑھکتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس معصوم کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ نے سدھوری کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بے اختیار اس کے حلق سے بھی کرب ناک چیخ خارج ہوئی اور جانے پھر کس طرح اس نے خود کو ایک جھٹکے سے رستم کی گرفت سے چھڑایا اور فرش پر بے سدھ پڑے علی محمد کی طرف بڑھی۔

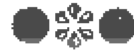
علی محمد کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس کی پیشانی سے اب خون بہنے لگا تھا اور غشی کی حالت میں اس کے حلق سے عجیب گھٹی گھٹی سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔

"علی...... پُت علی...... آنکھیں کھول......" سدھوری فرش پر بیٹھ گئی اور علی محمد کا سر گود

میں لے کر اپنے سر کی چادر سے اس کی خون آلود پیشانی پونچھنے لگی۔ پھر اس نے گڑگڑاتے ہوئے رحم طلب نظروں سے ملک الموت بنے کھڑے رستم خان اور وزیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم لوگوں کو اللہ سائیں کا واسطہ...... میں بے قصور ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتی...... ان بچوں کو کچھ نہ کہو۔"

ادھر دونوں سنگ دل اور بے حس بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا اور سدھوری کو قہر بار نظروں سے گھورتے ہوئے چلے گئے۔ سدھوری نے سکھ کا سانس لیا۔



اس رات انہوں نے اپنا ڈیرا اٹھا لیا تھا اور اس سے لگ بھگ پندرہ بیس کلومیٹر دور نیشنل ہائی وے کے نزدیک فروکش ہو گئے تھے۔ یہ مختصر سی ہجرت انہوں نے راتوں رات کی تھی۔ خانہ بدوشوں کے ساتھ کا بخش علی تقریباً عادی ہو چکا تھا مگر شہزادی کے سلسلے میں وہ فکرمند تھا۔ وہ ایک نازونعم میں پلی، شہزادی کی سی زندگی گزارنے والی لڑکی تھی۔ ایسے نامساعد حالات کا اس نے تصور بھی کبھی نہ کیا ہو گا۔ بخش علی کو خدشہ تھا کہ اس کی نازک اندام شہزادی کہیں ان حالات میں بیمار نہ پڑ جائے۔

سخت ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات میں پندرہ بیس کلومیٹر کے اس سفر نے واقعی شہزادی کو بیمار کر ڈالا تھا۔ حالانکہ سارے راستے لالاں نے شہزادی اور بخش علی کو دو الگ الگ خچروں پر سوار کرایا تھا اور انہیں مقدور بھر سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے گرم موٹی چادریں بھی اوڑھا دی تھیں۔ نیا پڑاؤ ڈالنے کے فوراً بعد سب سے پہلے ان دونوں کے لئے ایک دو بانسہ تیار کیا اور اندر گرم رلیاں، رضائیاں بچھا کر انگیٹھی سلگا دی تھی۔ ان ساری احتیاطی تدابیر کے باوجود شہزادی کو نزلہ، بخار اور کپکپی نے آن لیا تھا۔ اسے گرم گرم دودھ پلایا گیا۔ بخش علی پریشان تھا۔ وہ شہزادی کو اس قدر تکلیف میں دیکھ کر رنجور سا ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ دونوں اس چھوٹی سی جھونپڑی میں تنہا تھے۔ باہر ٹھٹھرتی رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ ابھی باہر جھونپڑیاں بنانے کا کام جاری تھا۔ لالاں بھی ان میں مصروف تھی۔

شہزادی زمین پر بچھی رلی پر دراز تھی اور بخش علی بھی زمین پر اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ وہ پُر تشویش انداز میں بار بار شہزادی کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ کر بخار کی حدت کا اندازہ کر رہا تھا۔ شہزادی کی سرمگیں آنکھیں وا تھیں اور وہ بڑی محبت سے بخش علی کے پریشان حال چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دلآویز ہونٹوں پر مخمور کر دینے والی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے اس تنہا پہر میں وہ دونوں نگاہوں ہی نگاہوں میں جیسے جامِ الفت پی رہے تھے۔ تب بخش علی نے شہزادی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے قدرے مغموم لہجے میں کہا۔

''شہزادی......! میری وجہ سے تمہیں کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑ رہی ہیں اور تم کہاں سے کہاں آ گئی ہو۔ مجھے اب یہ احساس گھائل کرنے لگا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ سب اچھا نہیں کیا۔''

اس کی بات سن کر شہزادی نے فوراً اپنی انگلی اس کے ہونٹوں پہ رکھ دی پھر نحیف مگر محبت سے لبریز لہجے میں بولی۔

''ایسا مت کہو میرے سرتاج......! میرا آرام و سکون، جینا مرنا اب صرف تمہارے ساتھ ہے۔ یہ آزار و تکلیفیں میرے لئے کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ تمہاری سنگت میں...... کانٹے بھرے راستے بھی میرے لئے پھولوں کی راہ گزر ہیں۔''

وفورِ جذبات سے بخش علی نے شہزادی کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے ہونٹوں سے چھونے لگا پھر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

شہزادی اس کے والہانہ پن پر مسکرانے لگی۔ اس کے دل کی گہرائی سے نکلے ہوئے الفاظ بخش علی کے دل پر لگے تھے...... لیکن پھر بھی جانے کیوں بخش علی کا احساسِ جرم کم نہ ہوا۔ وہ شہزادی کی مخروطی انگلیوں کو چومتے ہوئے دوبارہ رنجور لہجے میں بولا۔

''شہزادی......! یقین کرو میں نے جب پہلی بار تمہیں خواب میں دیکھا تھا تو اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ آنکھ کھلی تو اپنی اس اچانک بدلی ہوئی کیفیت پر خود بھی حیران ہوا۔ کیونکہ خوابوں میں ہی میں تمہاری محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکا تھا مگر پھر اس بات پر میرا دل رنجیدہ ہونے لگا کہ یہ سب تو خواب تھا...... یقین کرو شہزادی! میرا دل بڑا اُداس ہوا۔ اتنا کہ پھر جینے سے ہی دل اچاٹ ہونے لگا۔ پھر اچانک جب میں نے تمہیں حقیقی

دنیا میں دیکھا تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ایکا ایکی زندگی سے مجھے پیار ہونے لگا۔ تمہیں دیکھ کر میرے دل نے فوراً گواہی دی کہ تم میری ہو...... صرف میری...... تمہاری محبت میں میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی ماؤف ہونے لگی تھیں۔ بس ایک ہی دھن دماغ میں سوار تھی کہ تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے ورنہ ایسی زندگی کس کام کی...... لیکن......'' یہاں بخش علی نے قدرے توقف کیا پھر بولا۔

''شہزادی......! اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے شاید تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا...... تمہاری آرام و سکون سے بسر ہونے والی شاہانہ زندگی کو میں نے محض اپنی غرض کی خاطر تہہ و بالا کر ڈالا۔'' اتنا کہہ کر بخش علی آبدیدہ ہو گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ بخش علی کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو اس کے چہرے پر گر رہے تھے، گویا وہ محبوب کے غم میں شریک ہونے کی محاورتاً نہیں، عملی تفسیر پیش کر رہی تھی۔

شہزادی کی آنکھیں بند تھیں مگر اس کے حسین چہرے پر جذبات کے ارتعاش کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔

اور تب شہزادی کے گلاب سی پنکھڑیوں سے لبوں پر آئی سرگوشی بخش علی کے کانوں میں امرت بن کر ٹپکنے لگی۔

''میرے سرتاج......! میں اگر تمہاری غرض ہوں تو کیا تم میری غرض نہیں ہو؟ خواب میں جو تم نے کیفیت محسوس کی تھی، وہی میں نے بھی کی تھی۔ خواب میں، میں جس شہزادے کو اپنا دل دے بیٹھی تھی وہ تمہارا ہم شکل تھا۔ پھر جب میں نے حقیقت میں تمہیں دیکھا تو مجھے تمہارے سوا دنیا کی ہر شے بے حقیقت اور بے قیمت محسوس ہونے لگی۔ اسی لئے میرے محبوب...... خود کو تم یہ سوچ کر آزار مت دو کہ تمہاری وجہ سے میں دربدر ہوں، بھلا محبوب کی بانہوں سے بڑھ کر میرے لئے اور کون سی پُرسکون اور محفوظ پناہ گاہ ہو گی۔''

''تم نے شاید ٹھیک کہا شہزادی......'' بخش علی کی آواز جیسے دور سے آتی محسوس ہونے لگی۔ مگر وہ آواز شہزادی کی سماعتوں میں رس گھولنے لگی تھی۔ ''ہم دونوں جانے کب سے ایک دوسرے کے لئے بھٹک رہے ہیں۔ ہماری روحیں اتنی بے چین پہلے تو نہ تھیں۔ اور پھر...... ایک ہی وقت میں ایک جیسا خواب ہم دونوں نے دیکھا...... کیا اس سے بڑھ کر

ہماری سچی محبت کا کوئی اور ثبوت ہو سکتا ہے؟''

''ہاں میرے سریجن......! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ میں صدیوں سے اپنے سینے میں محبت کی آگ چھپائے ہوئے تھی۔'' شہزادی کی آنکھیں وفورِ جذبات سے بند تھیں۔ صرف گلابی لبوں پر لفظوں کی جنبش متحرک تھی اور چہرے پر عجیب طرح کا ارتعاش۔

''شہزادی......ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی......نہیں کر سکتی ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا......'' بخش علی نے یہ کہتے ہوئے شہزادی کو اپنے اور قریب کر لیا۔ ایک جانب انگیٹھی سلگ رہی تھی اور دوسری جانب دو پیار بھرے دلوں کے جذبات کا الاؤ دہک رہا تھا۔ اس لمحے بخش علی نے محسوس کیا کہ شہزادی کا بخار اترنے لگا تھا۔ اس کی خوبصورت اور گوری چٹی پیشانی پر پسینے کی ننھی منی بوندیں نمودار ہونے لگی تھیں۔



اگلی صبح دن چڑھے تک یہ سب لوگ سوتے رہے تھے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا اور ہر طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔ ذرا دور انڈس ہائی وے پر مسافر لاریوں اور بھاری بھرکم ہیوی ٹریلر اور ٹرکوں کی آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ سب سے پہلے لالاں ان کے جھونپڑے میں داخل ہوئی تو اس نے بخش علی اور شہزادی کو محوِ خواب پایا۔ ان کے چہروں پر پاکیزہ محبت کی روشنی ضوفشاں تھی۔ لالاں کو بے اختیار ان دونوں پہ پیار آنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ ان دونوں کی محبت جسمانی غرض و غایت سے پاک ہے۔ ان کا والہانہ پن، انسیت اور ایک دوسرے کے لئے تڑپ...... درحقیقت دو معصوم روحوں کی بے قراری ہے۔ پھر لالاں خاموشی سے باہر آ گئی۔

بخش علی کی آنکھ کھلی تو اسے باہر شور سا سنائی دیا۔ شہزادی ابھی سو رہی تھی۔ بخش علی نے اس کا بخار دیکھنے کے لئے دھیرے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اسے بخار اترا ہوا محسوس ہوا۔ بخش علی نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ باہر چمکیلی دھوپ کی تیز کرنیں جھونپڑی کے شکستہ روزنوں سے اندر آ رہی تھیں، جس سے با آسانی اندازہ ہوتا تھا کہ دن کافی چڑھ آیا ہے۔

بخش علی باہر ابھرنے والے شور پر ٹھٹھکا...... پھر دروازے کے طور پر مستعمل جھولتے ٹاٹ کے نزدیک آ کر باہر جھانکا تو چونک پڑا۔ سامنے چند بدمعاش ٹائپ خانہ بدوش

کھڑے تھے، ان میں لالاں کا سابق شوہر کادو بھی موجود تھا۔ وہ خاصا غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ بھاڑو کوبلی اور لالاں بھی اس کے سامنے موجود تھے۔ اس بار ان کے بشروں سے پہلے کی طرح خوف کے آثار کی بجائے قدرے درشتی طاری تھی۔ وہ آپس میں تیز تیز گفتگو میں مصروف تھے۔

بخش علی کچھ سوچ کر اپنی جگہ ہی جما رہا کیونکہ بار بار کادو کا سامنا اس کی شخصیت کو مشکوک بنا سکتا تھا۔ اس سے پہلے جب بخش علی نے کادو کے سامنے آ کر دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اس کے سامنے اپنا تعارف ایک پولیس افسر کی حیثیت سے کرایا تھا تو کادو خوفزدہ ہو کر واپس بھاگ گیا تھا۔ لیکن اب پھر کادو آن دھمکا تھا اور اب بھی یقیناً اس کا مطالبہ یہی رہا ہو گا کہ لالاں اس کے بچے واپس کر دے۔ لہٰذا اب وہ اپنی جگہ ہی چھپے رہنے پر مجبور تھا۔ تاہم بخش علی بہ غور اپنی نظریں کادو کے چہرے پر جمائے پُرسوچ خاموشی میں مستغرق ہو گیا تھا۔ دوسری بار کادو کا چہرہ دیکھنے پر بھی بخش علی کے دل میں پھر وہی کھٹک ہونے لگی تھی، ایسا کیوں تھا......؟ اس سے پہلے بھی اسے یاد تھا کہ جب کادو کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا تو اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے اس نے اس چہرے کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ مگر کہاں......؟ یہ اسے اپنے ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آ رہا تھا۔ اب جبکہ بخش علی نے دوسری بار کادو کو اچانک دیکھا تو پھر اسے نامعلوم سے اضطراب نے جکڑ لیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں بخش علی کو ایسا لگتا تھا جیسے یہ ''اجنبی آشنائی'' ماضی کے کسی تلخ واقعے کا ہی پرتو محسوس ہوتی تھی۔ وہ تلخ واقعہ کیا تھا......؟ اس بارے میں اس کا ذہن گہری دھند میں پھنسا ہوا تھا۔

پھر دفعتہً ہی اس نے کادو کی گرج دار آواز سنی۔ وہ خیالات سے چونکا۔ کادو لالاں سے درشت لہجے میں مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

''لالاں......! تم لوگوں کو......سردار کے پاس اب چلنا ہی ہو گا۔ یہ اس کا حکم ہے۔''

اس سے پہلے کہ اسے لالاں کوئی جواب دیتی، اس کا باپ کوبلی کرخت لہجے میں کادو سے بولا۔ ''جب ہمارا تعلق برادری سے ختم کر دیا گیا ہے تو پھر اب سردار کو بھی ہم پر حکم چلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں بلا کی تلخی عود کر آئی تھی۔

''سردار کے بارے میں زبان سنبھال کر بات کرو چاچا...... اگر اس نے اپڑیں

ماڑوں (آدمی) یہاں بھیج دیئے تو تم لوگ بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔" کادو نے غصیلے لہجے میں کہا۔ مگر کولبی بھی ایک جہاندیدہ شخص تھا۔ وہ ذرا مرعوب نہ ہوا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ تڑاخ دار لہجے میں بولا۔

"ہمارے ساتھ "پنچائیت" نے شروع ہی سے ناانصافی کی ہے۔ اب اور زیادہ ظلم برداشت نہیں کریں گے۔ ہم نے اب فیصلہ کرلیا ہے کہ جابلو (پہاڑی علاقے) جاکر اپڑیں مکھ (بڑے) سردار سے فریاد کریں گے۔" کولبی نے اپنی بات ختم کی تو بخش علی نے دیکھا کہ کادو غصے کے مارے لال سرخ ہورہا تھا۔

ادھر اچانک شہزادی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جو بخش علی کو آنکھ لگائے دیکھا تو آہستگی سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ بخش علی ذرا ٹھٹھک کر اس کی جانب متوجہ ہوا اور پھر اس کی مستفسرانہ نگاہوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اسے کادو کے بارے میں مختصراً آگاہ کردیا۔ شہزادی نے بھی باہر جھانکا اور کادو کو دیکھتے ہی اس کے حلق سے ایک اضطراری سی بھنچی بھنچی چیخ نکل گئی۔ اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا اور وہ خوف کے مارے چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بخش علی کے لئے شہزادی کی یہ حالت انتہائی تفکر آمیز اور چونکا دینے والی تھی۔

"کیا ہوا...... شہزادی......؟" جواباً شہزادی کے کپکپاتے ہونٹوں سے بہ مشکل نکلا۔

"وہ...... وہ......"

"ہاں...... ہاں...... کہو شہزادی، کیا بات ہے...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بب...... بخش علی...... ی...... یہ...... یہ شخص تو وہی ہے...... آ...... آ...... آگھ......"

شہزادی کے کپکپاتے ہوئے لبوں سے نکلا تو ایک لمحے کو بخش علی اس عجیب و غریب نام پر چونک سا گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا ابھر آیا۔ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا اور پھر اگلے ہی لمحے بخش علی کے ذہن سے دھند چھٹنے لگی۔ اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور اس کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ شہزادی نے باہر کھڑے کادو کی طرف دیکھ کر ہی اسے "آگھ" کے نام سے پکارا تھا۔ اب بخش علی کو یاد آنے لگا کہ کادو کا چہرہ اسے شناسا کیوں محسوس ہوتا تھا۔ شہزادی کے لرزیدہ ہونٹوں سے "آگھ" کا لفظ نکلتے ہی اسے اپنا وہ حسین و سنگین خواب یاد آنے لگا تھا، جس میں وہ

قرن ہا قرن کے دور کی شہزادی کی محبت میں گرفتار ہوچکا تھا اور وہ شہزادی بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ مگر اچانک ایک بدہیئت "آگھ" نامی کے ہاتھوں اپنی عزت بچانے کی خاطر جان دی تھی اور پھر بعد میں اس بدذات آگھ نے بخش علی سے لڑتے ہوئے اسے ہلاک کر ڈالا تھا۔

"تو...... تو...... کیا...... اب حقیقت میں وہ منحوس گھڑی آن پہنچی تھی؟ کیا اب ہم دونوں کے درمیان "موسم ہجراں" کی گھڑی آنے والی تھی!"

یہ متوحش اور سفاک الفاظ بیک وقت بخش علی اور شہزادی کے دل و دماغ میں گونجے تھے اور بے اختیار ہی دونوں وحشت زدہ ہوکر ایک دوسرے کے قریب ہوگئے تھے۔

"میرے سرجن......! خواب کی حسین تعبیر کے بعد...... کیا...... کیا...... ہمیں اب ہمیشہ کی جدائی جھیلنی پڑے گی؟" شہزادی کے ہونٹوں سے لرزیدہ سی آواز نکلی تو بخش علی نے اسے مزید اپنے قریب کرلیا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"نہیں شہزادی......! ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ تمہارے اور میرے بیچ میں آنے والی ہر دیوار میں گرادوں گا۔" اس کے لہجے میں حوصلوں کی گونج تھی۔

ادھر اچانک انہیں کادو کی چنگھاڑ سنائی دی۔ "بڈھے...... تُو میرے راستے سے ہٹ جا...... میں اپڑیں بالک لے کر ہی جاؤں گا۔"

اس کی للکار سے بخش علی نے اندازہ لگایا کہ کادو اب کوئی چارہ نہ پاکر جارحانہ پیش قدمی پر اتر آیا تھا۔ شہزادی بھی ہراساں ہوگئی تھی۔ بخش علی نے ٹاٹ کھسکا کر باہر جھانکا۔ کادو ایک نسبتاً بڑی جھونپڑی کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے غنڈوں نے کولبی اور چیختی چلاتی لالاں کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ لالاں غصے کے عالم میں کادو کو گالیاں بکے جارہی تھی۔ بخش علی کا اب باہر نکلنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ پھر وہ شہزادی کے منع کرنے کے باوجود جھونپڑی سے باہر نکل آیا اور بلند آواز میں کادو کو للکارا......

"کادو...... رک جاؤ...... زیادہ بدمعاشی دکھائی تو اچھا نہ ہوگا۔"

کادو کے بڑھتے ہوئے قدم یک لخت رک گئے۔ اس نے اپنی گردن موڑ کر بخش علی کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔ پھر وہ اپنی آنکھیں سکیڑ کر آہستہ آہستہ ڈرامائی انداز میں بخش علی کی طرف بڑھنے لگا اور قریب پہنچ کر اس

نے بخش علی کو گھورتے ہوئے ایک طویل معنی خیز ''ہوں'' خارج کی۔ وہ شاید بخش علی کو دوسری بار دیکھ کر سمجھ چکا تھا کہ اس اجنبی کی حقیقت کچھ اور ہے۔ اس نے پہلی دفعہ ایک ''ٹاکرے'' پر اپنے متعلق یہ بتایا تھا کہ وہ ایک پولیس افسر ہے...... لہٰذا اب کادو کے چہرے پر خبیثانہ مسکراہٹ عود کر آئی جس میں تضحیک کی بھی آمیزش تھی۔ وہ استہزائیہ لہجے میں اپنے بدہیئت اور موٹے کالے ہونٹوں پہ مکروہ مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولا۔

''رامورا...... پولیس اپھسر صاحب......! یہ تیکوں خانہ بدوش بھا گئی ہے جو ایدھر خوار ہوتا پھر رہا ہے۔ کیا اس لالاں نے تیرے اوپر جادو کر دیا ہے؟''

''بکواس بند کرو اپنی...... اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ...... سمجھے تم......'' اُس کی بے ہودہ گوئی پر بخش علی کو بھی غصہ آ گیا۔ مگر اب کادو بخش علی سے مرعوب ہونے والا کہاں تھا بلکہ اسے تو اب بخش علی پر کسی مفرور قیدی یا کسی مجرم کا شبہ ہو رہا تھا۔ اس نے بھی گھورتے ہوئے بخش علی سے درشتی سے کہا۔

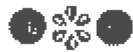
''رابابو...... ہمارے راستے سے ہٹ جا...... یہ ہمارا جاتی معاملہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جب کادو، بخش علی کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھنے لگا تو اچانک بخش علی کادو کے سامنے آ گیا۔

کادو کے مارے غصے کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ اس نے قہر بار نظروں سے ایک لمبے کو بخش علی کی طرف دیکھا، پھر اپنی شلوکے نما قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک بڑا خنجر نکال لیا۔

ادھر شہزادی خوف کے مارے ٹاٹ کے عقب سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، اس نے جیسے ہی کادو کو اپنے محبوب پر خنجر نکالتے دیکھا تو وہ لرز اٹھی۔ شہزادی اپنے خواب کے مطابق کادو کو ''اگھ'' سمجھ رہی تھی جو اس کے سپنوں کے شہزادے کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ یہ خبیث تکونی چہرہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ دیوانہ وار چیختی ہوئی جھونپڑی سے نکلی۔ سارے لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔ شہزادی بخش علی کے آگے ڈھال بن کر کھڑی اب کادو کو متوحش نظروں سے تکے جا رہی تھی۔ کادو کی آگ برساتی ہوئی نظریں جیسے شہزادی کے چہرے پر ٹک کر رہ گئی تھیں۔

''تمہیں اللہ سائیں کا واسطہ...... اسے مت مارو......'' شہزادی نے

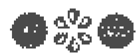
التجا کی۔ بخش علی الجھ کر رہ گیا۔ ادھر نجانے کادو کو کیا ہوا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا۔ انہوں نے دور سے شہزادی کی طرف نظریں جمائے جمائے ایک دوسرے سے کوئی خفیہ گفتگو کی۔ پھر اس کے حیرت انگیز طور پر وہ وہاں ایک پل کے لئے بھی نہ رکے اور کوئی ہنگامہ بپا کئے بغیر وہاں سے خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ لالاں اور بخش علی سمیت سب لوگ حیران و پریشان کھڑے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔



نہ صرف کادو بلکہ اس کے ساتھیوں کو بھی شہزادی کے حلیے سے اس بات کا پختہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی لڑکی شہزادی ہے جو قریب کے گوٹھ کے وڈیرے مشوری خان کی بیٹی ہے جس کی پوری علاقے میں ''ڈھنڈیا'' پڑی ہوئی تھی۔ کادو جانتا تھا کہ وڈیرے کے دو بیٹے رستم خان اور وزیر خان اپنی بہن اور اس آفیسر کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ کادو کے ذہن میں لالاں کے چنگل سے اپنے بچے حاصل کرنے کا یہ سنہری موقع اچانک ہی پیدا ہوا تھا۔ وہ اب رستم خان اور وزیر خان کو یہ خبر ذرا مرچ مصالحے کے ساتھ دینا چاہتا تھا کہ اس کی بہن اور اس اجنبی کو باغی خانہ بدوشوں نے ''پناہ'' دے رکھی ہے۔

کادو کو یقین تھا کہ رستم خان اور وزیر خان آندھی طوفان کی طرح بھاڑو کولبی کے پڑاؤ پر حملہ کریں گے اور یوں کولبی اور اس کی عیار بیٹی لالاں یقیناً اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اس کے بعد میدان صاف ہو جائے گا۔

کادو نے اس ''کام'' میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔



''اگر یہ بات جھوٹ نکلی تو تیری خیر نہیں ہو گی۔ سمجھا تُو......'' کادو اور اس کے چند ساتھیوں کی اس اطلاع پر رستم خان نے گھور کر کادو سے کہا تھا۔

''ہا سائیں......! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بلکہ چلو، میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔''

''چلو......''

پھر کولبی کے ''پڑاؤ'' پر پہنچے اور بے دریغ جھونپڑیوں کو روندنے لگے۔ ایک افراتفری مچ گئی۔ پھر ذرا ہی دیر بعد بخش علی اور شہزادی بدحواسی سے کھڑے نظر آئے۔

شہزادی تو اپنے دونوں بھائیوں کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی۔ اسے اپنا آخری وقت نظر آنے لگا تھا۔ ادھر زیرک کوہلی اور لالاں نے بھی معاملے کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا اور ان دونوں کے گرد حفاظت کی غرض سے گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔

رستم خان اور وزیر خان قہر آلود نظروں سے ان کی طرف گھور رہے تھے۔ کادو بھی ایک طرف اپنے مکروہ چہرے پر خبیثانہ مسکراہٹ طاری کئے کھڑا تھا۔

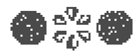
”بڈھے.....! ہمارے معاملے کے بیچ میں نہ آ...... ہٹ جا ایک طرف.....“ رستم خان نے اپنی بندوق کوہلی پر تانتے ہوئے کہا مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا تو اسی وقت غصے میں پھنکتے ہوئے وزیر خان نے بھاڑو کوہلی پر گولی چلا دی...... جو سیدھی بھاڑو کوہلی کے سینے میں جا لگی اور وہ آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

لالاں کے حلق سے ہذیانی چیخ برآمد ہوئی اور وزیر خان کی جانب زخمی شیرنی کی طرح لپکی۔ اس اثناء میں رستم خان نے لالاں کا نشانہ لیا مگر بخش علی خاموش کہاں رہنے والا تھا۔ اس نے زمین سے ایک پتھر اٹھا کر زور سے رستم خان پر کھینچ مارا۔ پتھر سیدھا رستم خان کی پیشانی پر لگا اور وہ چکرا کر زمین پر آ رہا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

ادھر وزیر خان نے اپنی جانب بڑھتی ہوئی لالاں کا نشانہ باندھا اور فائر کر دیا مگر لالاں بھی کائیاں نکلی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور سیدھی زمین پر گری اور رستم خان کی بندوق اٹھا کر وزیر خان پر فائر جھونک دیا۔

وزیر خان کے حلق سے نکلنے والی وہ چیخ بڑی کربناک تھی جو آخری ثابت ہوئی تھی...... ایسے میں اس کے دو ساتھی حرکت میں آئے مگر کوہلی کے آدمیوں نے اسے جا لیا۔ کادو وہاں سے بھاگنے کے چکر میں تھا مگر لالاں نے تاک کر اس پر بھی ایک فائر جھونک مارا۔ گولی اس کی کمر پر لگی اور کادو وہیں چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ یہ سب اتنی تیزی کے ساتھ ہوا تھا کہ سب لوگ سناٹے میں آ گئے۔ کادو اور وزیر خان کے آدمی تو بھاگ کھڑے ہوئے مگر زخمی رستم خان نے فوراً بخش علی پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا زمین پر آ رہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بخش علی نے رستم خان کے چہرے پر گھونسا جڑ دیا۔ رستم خان غصے کی شدت میں بھرا ہوا تھا اور اس جنونی کیفیت میں گھونسے کی ضرب

برداشت کر گیا اور بخش علی کے پیٹ پر لات رسید کر دی۔ بخش علی لڑکھڑا کر دور جا پڑا۔ شہزادی چیخ مارتی ہوئی بخش علی کی جانب لپکی تو رستم خان نے اپنی بہن شہزادی کو جھاپ لیا مگر لالاں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق لٹھ کی طرح گھما کر رستم خان کے سر پر دے ماری۔ رستم خان کا سر کھل گیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر آ رہا۔ یہ سارا خونی ڈرامہ پل بھر میں تمام ہوا تو لالاں اپنے باپ کے جسد خاکی پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔



ایک بیٹا وزیر خان مر چکا تھا۔ دوسرا بیٹا رستم خان زندہ لاش کی مثل اسپتال میں داخل تھا۔ اس واقعے نے وڈیرے مشوری خان کے دل و دماغ پر اس قدر اثر ڈالا کہ اسے فالج ہو گیا۔ بعد میں لالاں پر پولیس کیس ہو گیا مگر اسے زیادہ کڑی سزا نہ ملی۔ اسے تین سال کی قید ہو گئی تھی۔

بھاڑو کوہلی کے بچے کھچے خاندان نے کسی اور جگہ پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ وہ اب لالاں کی رہائی کے منتظر تھے۔ بخش علی نے انہیں تسلی دی تھی کہ وہ لالاں کا کیس لڑے گا اور اس کی سزا میں مزید تخفیف کروائے گا۔

بخش علی اور شہزادی نے اب شادی کر لی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر لاڑکانہ لے آیا تھا۔ حجلہ عروسی میں بخش علی خوشی اور مسرت انگیز جذبات کے ساتھ شہزادی کا گھونگھٹ اٹھائے، اس سے محبت پاش لہجے میں مخاطب تھا۔

”ارباطہ.....! ہم نے آخر اپنی منزل پا لی...... ہے ناں؟“ اس کے لہجے میں صدیوں کی پیاس تھی۔

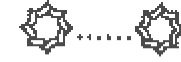
جواباً دلہن بنی بیٹھی شہزادی بھی مسرور اور دلکش مسکراہٹ اپنے صنائی لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولی۔

”ہاں...... زرمان......! ہم نے واقعی اپنی صدیوں کی تشنہ آرزوؤں کی تعبیر پا لی۔“

بخش علی اور شہزادی دونوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے جسموں میں بے قرار روحیں مچل رہی ہوں...... تب بخش علی نے شہزادی سے آخری بار بڑے نشاط آگیں لہجے میں کہا۔

"آؤ ارباطہ..... برسوں کے اس موسمِ ہجراں کو ہم آج شبِ وصال میں بدل ڈالیں۔"

تب شہزادی نے خود سپردگی کے عالم میں اپنی دلکش اور کشادہ آنکھوں کی گھنیری چلمنیں گرادی تھیں......!



سمندر

ثورگان قبیلے پر دہشت طاری تھی۔

ایک سو تیرہ سالہ بوڑھے غافر کی پیشگوئی کو آج تیسرا دن تھا اور پیشگوئی کے پہلے ہی دن سے پورے قبیلے کے لوگ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے سبھی اس پیشگوئی پر خوف میں مبتلا تھے۔

بوڑھا غافر ایک طویل عرصے سے اس قبیلے کا روحانی پیشوا چلا آ رہا تھا، وہ نہ صرف ایک ماہر منجم اور ستارہ شناس تھا بلکہ وید بھی تھا، یہی سبب تھا کہ اس کی بات کو رد کرنے کا تصور کوئی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس سے قبل بھی اس کی پیشگوئیاں درست ثابت ہوئی تھیں۔ البتہ اس بار کی پیشگوئی میں الجھن اور خوف کے ساتھ ایک پریشانی بھی تھی، اس بار اپنی پیشگوئی کرتے ہوئے بوڑھا غافر خود بھی ایک عجیب سی الجھن کا شکار تھا۔ کیونکہ یہ پیشگوئی مبہم اور ادھوری تھی، پھر بھی بوڑھے غافر نے قبیلے کے سردار جاذوب کو بھی آگاہ کر دیا تھا تاکہ وہ قبیلے کو ایک بڑی خطرناک مگر نامعلوم تباہی سے بچانے کی خاطر خواہ اور قبل از وقت کوئی تدبیر کر لے۔

جب بوڑھے غافر نے جزیرے کے شمال میں ایک اونچی چٹان پر کھڑے ہو کر یہ پیشگوئی کرتے ہوئے کہا تھا۔ "خداوند عظیم، ثورگان قبیلے پر رحم فرمائے اور مجھے نسل در نسل اس قبیلے کی خدمات کے لئے علم بخشتا رہے، مگر لگتا ہے مجھ سے ہی کوئی کوتاہی ہوئی ہے، اس بار میری پیشگوئی ادھوری ہے، باوجود کوشش اور ریاضت کے میں یہ نہیں جان سکا کہ ہمارے قبیلے پر ٹوٹنے والی آفت کس صورت میں ظاہر ہو گی۔ یہ نامعلوم آفت یا تباہی ایک اَن دیکھے عفریت کی طرح ہمیں نگلنے کے لئے دبے پاؤں بڑھ رہی ہے۔"

بوڑھا غافر اتنا کہہ کر رکا تھا، وہ ایک دراز قامت مگر کمر خمیدہ بوڑھا تھا، وہ اس قدر جھکا ہوا تھا کہ اس کی کمر میں کُب کا احساس ہوتا تھا مگر باوصف اس کے وہ طویل قامت

ہی دکھائی دیتا تھا، اس کی رنگت عام لوگوں کی طرح تانبے جیسی کندنی سرخ تھی۔ اس کے جسم پر ایک بھاری بھرکم جانور کی کھال کا لمبا سا جبہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے لمبے اور سفید بال داڑھی، مونچھوں اور بھنوؤں میں گڈمڈ ہو کر کسی قدیم جٹا دار بوڑھے درخت کا تاثر پیش کر رہے تھے۔

"اے ہمارے مربی...... ہمارے روحانی پیشوا......! خداوند عظیم تمہاری عمر دراز کرے، اگر تم ہمیں اپنے لامحدود علم کے زور پر یہ بھی بتا دیتے کہ وہ آفت کس شکل میں اور کب ہم پر نازل ہونے والی ہے تو ہم اس کا مقابلہ کرتے ہوئے کسی انجانے خوف میں نہ مبتلا ہوتے اور یہ بات ہمارے باہمت، بہادر نوجوانوں کو بے ہمت کرنے کا باعث نہ بنتی۔" سرکنڈوں کی جھونپڑی نما ایک خاصی بڑی سی پالکی میں ایک پورے خاندان کے ساتھ براجمان ثورگانی سردار جاذوب نے گرجدار مگر مؤدبانہ آواز میں بوڑھے غافر سے پوچھا۔ اس دیوہیکل پالکی کو موٹے موٹے بانسوں کی مدد سے تقریباً بیس کے قریب تنومند خدام نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا، ان سب کے ہٹے کٹے اور تانبے کی طرح دہکتے جسموں پر گھنے بالوں والے جانوروں کی کھالیں تھیں۔

جوان عورتوں اور لڑکیوں کے سیمیں بدن پگھلے ہوئے تانبے کی طرح سرخی مائل ہو رہے تھے۔ وہ سب کے سب ثورگانی سردار کی پالکی کے گرد انبوہِ کثیر کی صورت میں کھڑے تھے۔

ثورگانی سردار کی بات سن کر بوڑھا غافر لرزیدہ مگر گونجیلی آواز میں بولا۔ "ہم نے کڑی ریاضت کی تھی، یہ پتہ چلانے کے لئے کہ وہ آفت کس صورت میں ہم پر ٹوٹنے والی ہے مگر افسوس ہمیں ناکامی ہوئی۔ لیکن وقت بہت کم ہے، ہمیں ہمیشہ کے لئے اس جزیرے کو چھوڑنا پڑے گا۔" بوڑھے غافر نے حتمی لہجے میں کہا۔ وہ ایک اونچی ڈھلانی چٹان پر کھڑا مجمع سے مخاطب تھا۔ بوڑھے غافر کی آواز رقت آمیز ہو گئی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے اس بات کا قلق ہے کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو ادھوری پیشگوئی سنا رہا تھا، ایسا اس کی سو سالہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ ادھوری پیشگوئی قبیلے کے لوگوں میں کس قدر خوف و ہراس کا باعث بنے گی مگر وہ کیا کرتا، وہ مجبور تھا۔ وہ غمزدہ سے انداز میں پلٹا اور اپنے چٹانی غار کے اندر چلا گیا۔ باہر لوگوں کی باتوں کی

بھنبھناہٹ گونج رہی تھی۔ بوڑھے غافر کا دل اپنے لوگوں کو پریشانی میں مبتلا دیکھ کر ٹوٹا جا رہا تھا۔ وہ اپنے غار کے اندر آ کر ایک کرسی اور میز کی شکل کے تراشے ہوئے دیوار گیر پتھر پر بیٹھ کر سامنے بنی آڑی ترچھی لکیروں کو گھورنے لگا۔ اس کے جھریوں بھرے سرخی مائل چہرے پر اس سے زیادہ لکیروں کا جال پھیلا ہوا تھا اور اس کے وجود میں ہلکی ہلکی لرزش کسی طور بڑھاپے کی رہینِ منت نہ تھی۔



آج سے کئی سال قبل ثورگان قبیلہ ایک چٹانی جزیرے پر آباد تھا۔ یہ چٹانی جزیرہ درحقیقت ایک آتش فشانی جزیرہ تھا مگر اس کے آتش فشاں پہاڑ، سب کے سب خوابیدہ تھے۔ جب یہ پہاڑ ایک خاموش اور سرد رات کو اعصاب شکن اور کان پھاڑ دھماکوں کے ساتھ پتھروں کی بارش برسانے لگے تو آدھے سے زیادہ ثورگان قبیلے کے لوگ جل کر خاکستر ہو گئے اور باقی ڈونگوں اور بجروں پر سوار ہو کر جان بچانے میں بمشکل کامیاب ہو پائے۔ پھر یہ لٹا پٹا غرقاب قبیلہ ایک دوسرے جزیرے پر فروکش ہوا مگر وہاں بھی اسے امان نہ ملی، وجہ اس جزیرے کی پراسرار فضا تھی جس میں ہر وقت بخارات تیرتے رہتے تھے جو انسان کے لئے تو خطرناک نہ تھے مگر یہ پراسرار بخارات حیوانی اور نباتاتی اجسام کے لئے زہر قاتل تھے۔ مجبوراً یہاں بھی یہ لٹا پٹا قبیلہ کوچ کرنے پر مجبور ہوا۔ بالآخر اسے موجودہ جزیرے پر پناہ مل سکی اور انہوں نے ایک بار پھر مربوط طریقے سے زندگی گزارنا شروع کر دی۔ یہ وہ واحد جزیرہ تھا جو دیگر جزیروں سے نسبتاً زیادہ بڑا اور خوبصورت تھا اور بہت سرسبز بھی۔ بلند و بالا ہرے بھرے چھتنار درخت، نوع بہ نوع جنگلی پھولوں اور پودوں سے مزین پیالہ نما ڈھلوانی وادیاں، سرسبز مرغزاروں سے بھری پہاڑی چوٹیاں بڑا بھلا منظر پیش کرتیں۔ تب جزیرے میں ہر وقت لمبی لمبی رنگ دار کلغیوں والے طوطے اور بھانت بھانت کے خوش رنگ پرندوں کی چہکتی چہچہاتی خوش الحانی گونجتی رہتی تھی۔ غرض زندگی کے تمام رنگ اپنی تمام تر فطرت کے ساتھ یہاں کھلکھلاتے رہتے تھے۔ گہرے نیلے اور بیکراں سمندر نے اس خوش رنگ جزیرے کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ ان مناظر کے علاوہ اس جزیرے کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں چاروں موسموں کی فضائیں کروٹیں بدلتی رہتی تھیں لیکن۔ اب بوڑھے

جادوگر غافر کی منحوس اور اندیشوں بھری پیشگوئی نے یہ سارے رنگ ماند کر ڈالے تھے۔ زندگی اس سے پہلے جتنی حسین تھی، اب جان لیوا وسوسوں سے اتنی ہی بدصورت ہو چکی تھی۔



ثورگانی سردار جاذوب نے فوراً اپنے چند مقربین خاص کی ایک مجلس مشاورت بلائی، یہ سب لوگ پھونس اور سرکنڈوں کے ایک مستطیل نما ڈھلوانی چھت والی جھونپڑی میں کھجوروں کی چٹائیوں پر سر جوڑے بیٹھے تھے، باقی خدام قدیم طرز کے چوڑے پھل والے بھالے سنبھالے مستعدی کے ساتھ پہرے پر موجود تھے، ان کے شانوں سے ''بومرنگ'' بھی بندھا نظر آ رہا تھا۔ (بومرنگ ایک ترچھا اور تیز دھار چپٹا شکاری ہتھیار ہوتا ہے جسے مخصوص انداز میں شکار پر پھینکتے ہیں جو شکار کو ''جان لیوا'' چرکا لگا کر دوبارہ شکاری کے ہاتھ میں آ جاتا ہے)

''ہمارے مربی غافر کی آج تک کوئی بھی پیشگوئی غلط ثابت نہیں ہوئی ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ان کا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ عنقریب ہم کسی بڑی آفت سے دوچار ہونے والے ہیں۔ مزید یہ کہ ہمیں اب اس جزیرے سے فوراً کوچ کر جانا چاہئے۔'' ایک پختہ العمر شخص جس کا نام ضرغل تھا، نے قدرے بھاری آواز میں کہا۔ یہ قبیلے کی مجلسِ مشاورت کا ایک اہم اور معزز رکن تھا اور کبھی قبیلے کا سردار بھی رہ چکا تھا۔

''معزز ضرغل کا کہنا بالکل درست ہے کہ ہمیں اب فوراً اس جزیرے کو چھوڑ دینا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے اور آفت ہمارے معصوم لوگوں کو ایک بھیانک عفریت کی طرح چاٹ لے۔'' یہ عاقر تھا جس نے ضرغل کی تائید کی تھی۔ اس طرح وہاں موجود تقریباً سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس جزیرے سے فوراً کوچ کر جانے میں ہی سب کی عافیت ہے۔

''خاصل......! میں کافی دیر سے تمہاری رائے کا منتظر ہوں، کیا تمہاری خاموشی کو میں متفقہ مشاورت سے رضامندی پر تعبیر کروں؟'' اچانک سردار جاذوب نے ایک گنجے سر اور گدھ کی طرح چونچ والے شخص کو مخاطب کر کے گونجیلی آواز میں کہا۔ یہ خاصل تھا اور ایک عرصے سے ثورگان قبیلے کی سرداری کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ قبیلے میں یہ کوئی

معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی مگر اس کے لئے خود کو اہل ثابت کرنا پڑتا تھا اور یہ اہلیت قبیلے کی قدیم روایت کے تحت ''مبازر'' سے ثابت کرنی پڑتی تھی مگر اس ''جنگ'' میں ذاتی عناد اور دشمنی کا ذرہ بھر بھی دخل نہیں ہوتا تھا۔ ''مبازر'' کے بعد فاتح و مفتوح بڑے کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے گلے مل کر مبارکباد دیتے اور شانے تھپک کر حوصلہ افزائی کرتے لیکن ان میں خاصل ایک انتہائی کینہ پرور اور سازشی انسان تھا اور مسندِ سرداری پر براجمان ہونے کے لئے ہر اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کا عادی تھا۔ اور دل میں بڑا بغض رکھتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس وقت بھی بڑی خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر کھچڑی پکانے میں مگن تھا۔ پھر جیسے ہی سردار نے اسے مخاطب کیا تو وہ فوراً منافقانہ عاجزی سے بولا۔

''خداوندِ عظیم ہماری سرزمین پر رحم فرمائے، کاش میری حقیر زندگی قبیلے کے معصوم لوگوں کے کام آ سکتی۔ مگر میری رائے ذرا مختلف ہے اور میری نظریں کچھ اور دیکھ رہی ہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموشی کے ساتھ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے کسی غیر مرئی نقطے کو یوں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جیسے واقعی کوئی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کر رہا ہو۔

سردار جاذوب نے خاصل کی بات پر قدرے چونک کر بھاری لہجے میں پوچھا۔

''خاصل! اپنی بات کھل کر کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''سردار......! کیا یہ بہتر نہیں ہوتا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ آفت کس شکل میں ٹوٹنے والی ہے تاکہ ہم پہلے سے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے کیونکہ میں سمجھتا ہوں اس جزیرے سے زیادہ اچھی جگہ ہمیں کہیں نہیں مل سکتی۔''

''میں خاصل کی بات کی تائید کرتا ہوں مگر چونکہ ہماری اس تائید میں کم لوگ شامل ہیں اس لئے شاید ہماری بات کو اہمیت نہ دی جائے۔'' یہ جالوت تھا، مکار خاصل کا دست راست۔

سردار جاذوب نے قدرے بیزاری سے ان کی بات سنی اور پھر اسی لہجے میں ان سے بولا۔ ''کیا تم دونوں نے غافر کا خطاب نہیں سنا تھا، اس نے اپنی سی پوری کوشش کر کے دیکھ لی مگر وہ یہ پتہ چلانے میں ناکام رہا ہے کہ ہم پر کس قسم کی آفت ٹوٹنے والی ہے۔ ویسے غافر کا اتنا کہنا کیا کافی نہیں ہے کہ ہم بہت جلد کسی بڑی تباہی کی زد میں

آنے والے ہیں۔‘‘

’’مگر یہ بات بھی تو سوچنے والی ہے کہ آخر غافر جیسے بڑے ساحر کو بھلا آدھی پیشگوئی کرنے کی کیا ضرورت ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ غافر جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے۔ وہ سب جانتا ہے یا پھر کچھ نہیں جانتا اور اس میں کوئی گہرا راز چھپا ہے۔‘‘ خاصل نے آخر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ اس کی گفتگو سن کر وہاں موجود دیگر لوگوں کے چہروں پر حیرت اور قدرے ناگواری کھنڈ آئی تھی۔ سردار جاذوب نے بھی قدرے ناگوار نظروں سے خاصل کی طرف دیکھ کر تلخی سے کہا۔

’’تمہارا اعتراض بالکل غلط اور فضول ہے۔ بھلا وہ ہمیں ہلاکت میں کیوں ڈالنا چاہے گا اور کیا خود اس کی زندگی کو خطرہ نہ ہوگا؟ اس میں کوئی راز نہیں ہے اس کا۔‘‘

سردار جاذوب کی بات سن کر مکار خاصل نے اپنے ہم خیال جالوت کے ساتھ بیٹھے ہاتر آختون کی طرف دیکھا اور دھیرے سے سر ہلا کر اسے مخصوص اشارہ کیا۔

’’معزز سردار......! غافر ایک جادوگر ہے اور اپنی عمر طویل کرنے کی خاطر وہ مختلف گندے اور شیطانی علوم میں مصروف رہتا ہے۔‘‘ ہاتر آختون نے یہ کہتے ہوئے قبیلے کے سابق سردار ضرغل کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ ’’ضرغل کو اچھی طرح یاد ہوگا جب وہ عظیم ثورگان قبیلے کا سردار تھا اور تمہارا قبیلہ ایک چٹانی جزیرے میں زندگی گزار رہا تھا تو بوڑھے غافر کے غار سے......‘‘

’’یہ فضول اور پرانی باتیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔‘‘ سردار نے ہاتر آختون کی بات کاٹتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ اس پر ضرغل نے فوراً کہا۔

’’لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے دانستہ اس راز پر پردہ پڑے رہنے دیا تھا جس کا مجھے آج تک دکھ ہے حالانکہ اس وقت میں قبیلے کا سردار تھا اور مجھے پتہ چلانا چاہئے تھا کہ آخر غافر کے غار میں وہ کھوپڑیاں کس کی تھیں جن کی آنکھوں میں اس نے چراغ رکھے ہوئے تھے، نجانے وہ کن معصوم لوگوں کی کھوپڑیاں تھیں جنہیں بوڑھے جادوگر غافر نے ہلاک کر دیا تھا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے ہاتر آختون مگرمچھ کے آنسو بہانے لگا۔ اس پر اس کا ہمنوا ضرغل اس کی دل جمعی کے لئے بولا۔

’’ہاتر آختون......! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، اس وقت میری طرح......تمہاری

سرداری کا سورج دشمنوں کی سازشوں اور چیرہ دستیوں کی وجہ سے ابھرنے ہی نہیں دیا گیا تھا۔‘‘

سردار جاذوب نے بڑی غصیلی نظروں سے ضرغل کی طرف دیکھا تھا، اس کے کھولتے ہوئے چہرے سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مصلحتاً ضبط سے کام لے رہا تھا کیونکہ وہ ضرغل کی بات کا اصل مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے جن ’’دشمنوں‘‘ کا ذکر کیا تھا، وہ لوگ اس کے ہی لوگ تھے۔

’’یہ وقت ایسی گئی گزری پرانی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ اس وقت ہماری توجہ صرف موجودہ مسئلے کے حل پر ہونی چاہئے۔‘‘ سردار جاذوب کے ایک خاص رکن نے کہا اور ساتھ ہی آخر میں سازشی خاصل اور اس کے تینوں ہمنوا ضرغل، ہاتر آختون اور جالوت کو بھی آئینہ دکھا دیا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر استہزائیہ تلخی سے بولا۔

’’تم لوگوں کو اگر پرانی باتیں کرنے کا اتنا ہی شوق ہے اور جیسا کہ تم چاروں غافر پر شک کر رہے ہو تو اس کے جواب میں ’’مباہلہ‘‘ کی دعوت دیتا ہوں۔ بلاوجہ قبیلے میں انتشار اور نفرت پھیلانے کی کوشش مت کرو، پہلے ہی ہمارے قبیلے کے معصوم لوگوں پر خوف اور پریشانی طاری ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ شخص سردار جاذوب کی طرف متوجہ ہوا اور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

’’معزز سردار......! مجلس مشاورت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے کہ ہماری عافیت اسی میں ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس جزیرے کو چھوڑ دیا جائے۔‘‘ یہ سردار جاذوب اور اس کے دیگر حامیوں کی طرح قبیلے کا خیر خواہ تھا، اس کا نام غرقش تھا۔ مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن کے علاوہ یہ سردار جاذوب کا مقربِ خاص بھی تھا اور خاصل سمیت اس کے تینوں ہمنوا غرقش سے حسد کرتے اور اس کے لئے دل میں بڑا کینہ رکھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ قبیلے کی ’’سرداری‘‘ کے خواب کی تعبیر میں دو بڑی رکاوٹوں میں ایک تو غرقش تھا اور دوسرا بوڑھا جادوگر غافر تھا۔ بہرطور سردار جاذوب نے مجلس مشاورت کی معدودے چند افراد کے سوائے متفقہ رائے کے مطابق اس جزیرے کو چھوڑ دینے کا حکم جاری کر دیا۔ اس خوبصورت اور قدرتی مناظر اور چاروں موسموں کے حامل جزیرے کو چھوڑنے پر دل مائل نہیں ہو رہا تھا۔ بوڑھے غافر کی پیشگوئی بے شک ادھوری سہی لیکن

اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے اگرچہ قبیلے پر عنقریب ٹوٹنے والی آفت کی نوعیت اور وقت کے بارے میں بتانے سے معذوری کا اظہار کیا تھا مگر قبیلے کے لوگوں کے لئے کیا اتنا کافی نہیں تھا کہ یہ پیشگوئی کرنے والا کوئی اور نہیں، بوڑھا غافر تھا جو وید، منجم اور پراسرار علوم کا مالک تھا اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آج تک بوڑھے غافر کی کوئی پیشگوئی غلط ثابت نہیں ہوئی تھی۔

سردار جاذوب نے اسی وقت جزیرے سے کوچ کرنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ نیز ایک اونچے "پگوڈا" نما منبر پر نقارچی کو کھڑا کر کے پورے قبیلے کے لوگوں میں یہ اعلان بھی کروا ڈالا تھا کہ جتنی جلد ہو سکے، کوچ کی تیاری کر لی جائے اور ضرورت کے مطابق ڈونگے اور بجرے بھی بنا لئے جائیں۔ اس اعلان کی دیر تھی کہ سارے قبیلے کے لوگ کیا چھوٹے، کیا بڑے...... غرض مرد و عورت سبھی کوچ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اس قبیلے کی عورتیں بھی جفاکشی میں مردوں سے کم نہ تھیں۔

ساحل پر بجروں اور ڈونگوں کی مرمت جاری تھی۔ ثورگانی سردار جاذوب کے خاندان کے لئے شاہی بجرے کو بھی باقاعدہ نئے سرے سے بنایا جا رہا تھا اور نئے بادبانوں کی ازسرِنو تعمیر جاری تھی۔



اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور گہری سیاہ تھیں، ریشمی سیاہ بال اس کی سبک کمر تک سانپ کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ خاصی تنومند اور پُرقامت حسینہ تھی۔ تانبے جیسی رنگت میں غروبِ آفتاب کی سی دمک تھی۔ اس کا سیمابی جسم کمان کی طرح کھنچا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کاندھوں سے لے کر گھٹنوں تک سمور زیب تن کر رکھی تھی۔ وہ بڑی دلکش اور حسین لڑکی تھی جو اس وقت اپنی چند دیگر ساتھی لڑکیوں کے ساتھ جزیرے کی شمالی طرف ایک برساتی جوہڑ میں اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ یہ حسینہ ضرقشاں تھی، ثورگانی سردار جاذوب کی لاڈلی بیٹی...... ضرقشاں فطرتاً ایک لاابالی اور پُرشوخ دوشیزہ تھی۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، پریشانی یا سوگواری کا شائبہ تک اس کے چہرے پر نہیں ہوتا تھا اور وہ خود بھی اسی فطرت و عادات کی سہیلیاں بنانے کی قائل تھی۔ ویسے بھی اس کی سہیلیاں قبیلے کی سربرآوردہ شخصیتوں کی بیٹیاں تھیں، ان کے غسل کے لئے پہاڑی آبشار کے کنارے

چٹانی گھر کے نیچے بنے برساتی تالاب کی جگہ مخصوص تھی، البتہ قبیلے کی کوئی عام عورت یا لڑکی ادھر نکل آتی تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

یہ سب حسینائیں تالاب میں آبشار کے ٹھنڈے پانی میں نہانے کے بعد کنارے پر آ کر لباس پہن چکی تھیں اور ایک دوسرے کو چھیڑ بھی رہی تھیں، بار بار پانی میں دھکا بھی دے رہی تھیں اور کھلکھلا کر ہنستی بھی جا رہی تھیں۔ ان شرارتوں میں ضرقشاں سرفہرست تھی، بلندی سے شفاف تالاب میں گرنے والے آبشار کے جلترنگ میں ان طرح دار حسیناؤں کی کھنکتی ہوئی ہنسنے کی آوازیں باہم مدغم ہو کر دُھلی نکھری فضا میں عجیب سی نغمگی بکھیر رہی تھیں۔ پاس ہی قدرتی جھرنے بھی اس نغمگی میں حصہ لے رہے تھے۔ ان جواں سال شوخ و شنگ حسیناؤں کے کھلتے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ لوگ عنقریب کسی آفت یا تباہی کا شکار ہونے والے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان جواں سال دوشیزاؤں کا تعلق قبیلے کی عام لڑکیوں سے نہ تھا۔ نہانے اور آپس میں ڈھیر ساری شرارتیں کرنے کے بعد جب ان لوگوں نے آگے قدم بڑھایا تو اچانک ضرقشاں کی نظر سامنے پڑی اور اس کے قدم اپنی جگہ جامد ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے بھرے بھرے عنابی ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں میں نشہ سا اُترنے لگا۔ ادھر اس کی سہیلیاں اسے چھیڑتی اور معنی خیز انداز میں چٹکیاں بھرتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی اسے اکیلی چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں۔

سردار زادی ضرقشاں کی محبت بھری نگاہیں ہنوز اس سمن بر نوجوان کے پُروجیہہ اور سرخ و سفید چہرے پر ثبت تھیں۔ خوب کسرتی جسم اور لمبے چوڑے قد و قامت کے اس نوجوان کا کشادہ سینہ برہنہ تھا، اس کے بازوؤں کی مچھلیاں زندگی کی جواں خیز حرارت سے بھری نظر آ رہی تھیں۔ تانبے کی طرح چمک دار بدن سے طاقت اور قوت کی بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ پیٹ سے نیچے گھٹنوں تک سنجاب کی کھال کا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ سردار زادی ضرقشاں کے سامنے تھوڑے فاصلے پر ایک قدرے اونچی اور سبزے سے ڈھکی چٹان پر کسی چٹان کی طرح تنا کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سنان (بھالا) نظر آ رہا تھا اور گلے میں سیاہ ڈوری سے بندھا ہوا عجیب وضع کا پتھر جھول رہا تھا جبکہ بغل میں ایک ڈوری کے سہارے نرسنگا بھی نظر آ رہا تھا۔

"کیسے ہو زرغون؟" ضرقشاں نے اس کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کھنکتے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہوں...... کیا تم نے غسل کر لیا؟" زرغون نامی نوجوان نے شرارت بھرے لہجے میں کہا اور اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتا ہوا چٹان سے جست بھر کر اس کے قریب آ گیا اور پھر وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جنگل سے ساحل تک گھومتے رہے۔ زرغون ضرقشاں کے باپ سردار جاذوب کے مقربِ خاص غرقش کا بیٹا تھا۔ یوں ضرقشاں سردار زادی کہلاتی تھی جبکہ زرغون وزیر زادہ...... ان دونوں کی دوستی مثالی تھی اور مشہور بھی...... اگر بوڑھے عافر نے قبیلے میں کسی بھی وقت نازل ہونے والی نادیدہ آفت کے بارے میں پیشگوئی نہ کی ہوتی تو چند دنوں کے بعد زرغون اور ضرقشاں کی شادی متوقع تھی۔

یہ دونوں ایک دوسرے کے سنگ پورے جزیرے کی سیر کرتے رہے، انہیں اپنے سوائے پورا قبیلہ آج بہت سوگوار اور خاموش سا محسوس ہوا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر عجیب طرح کے خوف نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، وہ لوگ سب اپنے گرد و پیش حتیٰ کہ کھانے پینے سے بھی بے خبر کوچ کی تیاری میں مصروفِ عمل تھے۔ ضرقشاں کو قبیلے کی اس کیفیت پر دکھ اور قدرے بیزاری سی محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ آج ان دونوں کی کسی نے تعریف نہیں کی تھی، ان بیچاروں کو اپنا ہی غم کھائے جا رہا تھا۔ ضرقشاں کو زرغون کی دوستی پر فخر تھا اور اسے اپنے ساتھ لے کر جنگل، ساحل حتیٰ کہ پورے قبیلے کی سیر کرتی تھی۔ زرغون تھا بھی تو مردانہ وجاہت کا شاہکار...... بہرطور دونوں کو زندگی سے معمور اور ایک دوسرے کی محبت سے سرشار دلوں کو قبیلے کے لوگوں کی یہ سوگوار خاموشی اور ان کے ڈرے سہمے چہرے ایک آنکھ نہیں بھائے اور پھر دونوں آبادی سے دور جزیرے کے ایک ایسے نسبتاً ویران گوشے میں آ گئے جدھر سبزے سے ڈھکی ڈھلانوں والی پہاڑیوں اور بڑے بڑے چوڑے تنوں والے درختوں کی بہتات تھی۔

پہاڑیوں کے پار ساحل سمندر سے ابھرنے والی سرکش موجوں کی شراٹے دار آوازیں سنائی دے رہی تھیں، نیلا آسمان صاف اور روشن تھا، فضا میں جنگلی پھولوں اور پودوں کی مہک رچی ہوئی تھی، ہوا کے خوشگوار اور عطر بیز جھونکے جوان دلوں میں جینے کی

امنگ کو مہمیز کر رہے تھے۔ دونوں کو اب شدید بھوک کا احساس ہونے لگا۔ پھل وغیرہ تو انہوں نے بے حساب کھائے تھے مگر گوشت کی خواہش نے انہیں پژمردہ اور تھکا سا دیا تھا۔ وہ ناطاقتی محسوس کر رہے تھے۔ لہٰذا اب وہ دونوں کسی جانور کا شکار کرنے کی غرض سے ہی جزیرے کے اس حصے میں آئے تھے۔ ضرقشاں بھی شکار کرنا چاہتی تھی۔ دونوں اب مستعد ہو کر دائیں بائیں شکار کی تلاش میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

وہ ابھی جنگل کے آخری حصے میں تھے جہاں سے ذرا فاصلے پر دور بلند و بالا گھنے درختوں کے جھنڈ کے چھدرے چھدرے روزنوں سے پہاڑی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں، زرغون نے تو اپنا بھالا سنبھال لیا تھا جبکہ ضرقشاں نے لمبے پھل والا ایک شکاری چاقو اپنے لباس سے نکال لیا جسے اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ ابھی یہ دونوں چوکس ہو کر شکارانہ نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ اچانک "بب...... بب...... بب......" کی آواز ابھری۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ زرغون کے بازوؤں کی مچھلیاں تن کر پھڑکنے لگیں۔ ضرقشاں کی گرفت بھی خنجر کے دستے پر مضبوط ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے "بھد...... بھد......" کی آواز کے ساتھ ایک بھاری بھرکم مینڈھا بڑی شان سے اکڑتا پھدکتا ہری ہری تازہ گھاس چرتا ہوا نمودار ہوا۔

زرغون نے ضرقشاں کے کان میں سرگوشی کی، اس کے بعد دونوں محتاط روی کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ دونوں اب مختلف سمتوں میں اس مینڈھے کو گھیرنے کے سے انداز میں دبے پاؤں اس کی طرف بڑھنے لگے۔ مینڈھا خاصا قد آور تھا، جسم اس کا گینڈے کی طرح چمکدار اور مضبوط نظر آ رہا تھا۔ شیر ببر کی طرح صرف اس کی گردن تک گھنے بالوں کا گچھا سا تھا، دو موٹی موٹی ابھری آنکھوں میں پُرشوخ وحشت سی ہویدا تھی جسے دیکھ کر اچھے بھلے شکاری کا اعتماد متزلزل ہونے لگے۔ اس کے بڑے اور خم کھائے ہوئے سینگ بڑے خوفناک محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا منہ غیر معمولی طور پر چوڑا تھا، دو بڑے بڑے غار ایسے نتھنوں سے کف سی بہتی محسوس ہو رہی تھی البتہ اس کی ٹانگیں پتلی اور کھر چوڑے تھے۔

ادھر زرغون جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا جنگلی مینڈھے کے ذرا قریب آیا، اس کا فاصلہ

مینڈھے سے چند ہی قدموں کا تھا، قدرے قریب پہنچ کر زرغون رکا اور بھالے والا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ مینڈھا بڑی رغبت اور توجہ کے ساتھ گھاس چرنے میں مگن تھا۔ اگلے ہی لمحے زرغون نے مینڈھے کی گردن کا نشانہ لے کر بھالا فضا میں تولا اور پوری طاقت سے اچھال دیا۔ بھالا فضا میں اُڑتا ہوا اس کی گردن میں پیوست نہ ہو سکا البتہ اس کے پہلو میں کھب گیا۔ بھالا لگتے ہی مینڈھا گرجدار آواز کے ساتھ زور سے ڈکرایا اور ساتھ ہی اچھلا اور بری طرح بدک کر ایک سمت کو بھاگا۔ بھالا اس کے جسم میں پیوست تھا۔ زرغون اس کے پیچھے دوڑا۔

ادھر زرقشاں نے ایک وحشیانہ چیخ بلند کی اور اپنے دائیں ہاتھ میں خنجر تولے بھاگتے ہوئے مینڈھے کے آگے آگئی۔ مینڈھا رکا اور پھر دائیں جانب گھوما۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ضرقشاں نے ایک دوسری چیخ بلند کی اور مینڈھے پر ایک جست بھری۔ وہ فضا میں اُڑتی ہوئی سیدھی اس کے اوپر جا پڑی۔ اس دوران اس کے خنجر والا ہاتھ بھی حرکت میں آیا۔ خنجر کے مہیب پھل کی تیز نوک مینڈھے کا پیٹ چیرتی چلی گئی۔ مینڈھے کے بدہیئت تھوتھنے سے جگر خراش ڈکراہٹ ابھری اور اس کی آنتیں باہر اُبل پڑیں۔ مینڈھا چت ہو چکا تھا۔ ضرقشاں نے فاتحانہ چیخ ماری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اچانک اسے ایک دوسرے جانور کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی زرغون کی تیز پکار اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ضرقشاں...... ہوشیار......!''

ضرقشاں یکدم پلٹی اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے سے ایک دوسرا نسبتاً زیادہ بھاری بھرکم اور جھبرا سا مینڈھا غیظ وغضب کے عالم میں دونوں سینگ تانے ضرقشاں کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ ضرقشاں کو ایک لمحے کے لئے مینڈھے کی وحشت انگیزی نے بوکھلا کر رکھ دیا۔

ذرا فاصلے پر کھڑا زرغون مینڈھے کی تیز رفتاری کے باعث اس کا راستہ بھی نہیں روک پایا تھا، دوسرے ہی لمحے ضرقشاں نے ایک جست بھری اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ لیکن مینڈھا بھی بڑا مکار اور کائیاں ثابت ہوا۔ وہ شاید اپنے ساتھی کی موت پر وحشت انگیزی پر اتر آیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی ضرقشاں نے مینڈھے کی خوفناک ٹکر سے خود کو

بچانے کے لئے جست بھری، بھاری بھرکم ہونے کے باوجود مینڈھے نے بھی دوڑتے ہوئے اپنا رخ ذرا بدلا اور اپنے خوفناک اور خم دار سینگوں کی ٹکر ضرقشاں کے پہلو پر ماری۔ قبیلے کی یوں تو تمام عورتیں مضبوط جسم اور جنگجو تھیں...... لیکن پھر بھی اگر یہ وحشت انگیز ٹکر کسی دوسری عورت کے پڑتی تو وہ ادھر ہی ڈھیر ہو جاتی مگر ضرقشاں کے لئے ایسے مشاغل تو روز کا معمول تھے۔ وہ سیدھے سادھے اور بے ضرر جانوروں کو دانستہ اس قدر مشتعل کر دیتی تھی کہ وہ خونخواری پر اتر آتے تھے اور تب ضرقشاں کو ان سے بھڑنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن یہ مینڈھا اپنے ساتھی کی موت پر اس قدر مشتعل ہو گیا تھا کہ اس نے ضرقشاں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیا تھا اور ایک زوردار ٹکر رسید کر دی تھی۔ ضرقشاں کے حلق سے کراہ آمیز چیخ نکل گئی۔ ٹکر کھا کر وہ ذرا دور جا گری۔ مینڈھا چند ثانیے رُکا، اپنی غیر معمولی موٹی موٹی آنکھوں سے ضرقشاں کو گھورتے ہوئے اپنے غاروں ایسے نتھنوں سے ''عف...... عف...... عف'' کی آوازیں نکالتا رہا اور پھر اگلے ہی لمحے ایک بار پھر طوفانی رفتار سے ضرقشاں کی طرف لپکا۔

اب زرغون بھی ضرقشاں کی مدد کو آ چکا تھا۔ ایک عجیب بات تھی، زرغون اور ضرقشاں کے بشروں پر ذرا بھی تشویش کے آثار نہ تھے بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں لطف آ رہا ہو۔ ضرقشاں پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹانگیں و بازو پھیلا کر چوکنا کھڑی ہوگئی۔ ایسے میں جنگلی مینڈھے کو جانے کیا سوجھی کہ وہ ضرقشاں کے قریب پہنچ کر رکا اور پھر دوسرے ہی لمحے اسے اپنے عقب میں زرغون کے دوڑتے ہوئے آنے کی آواز محسوس ہوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے ذرا گردن موڑی اور پھر یکلخت راستہ بدل کر جنگل کی طرف دوڑ گیا۔

زرغون فوراً ضرقشاں کے پاس آیا۔ دونوں ہنسنے لگے۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر مردہ مینڈھے کی کھال اتاری اور چھری کی مدد سے اس کا پیٹ چیرنے کے بعد تمام آلائش وغیرہ نکال دی اور پھر بڑے بڑے پارچے کاٹ کر الاؤ روشن کر کے ان پارچوں کو آگ پر رکھ دیا۔ خاصی دیر بعد جب گوشت پک کر سرخ ہو گیا تو دونوں مزے لے لے کر کھانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً نصف سے زائد مینڈھا چٹ کر گئے۔ اب ان کے گرد چھوٹے موٹے جانور منڈلانے لگے تھے۔ گوشت نے ان کی بھوک بڑھا دی

تھی۔ ضرقشاں اور زرغون اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھتے تالاب کے کنارے آ گئے۔ یہ اب پہاڑی سلسلے اور جنگل کے درمیانی علاقے میں تھے۔ پانی پی چکنے کے بعد دونوں وہیں کنارے پر بیٹھ گئے۔

''زرغون......! کیا تمہیں بوڑھے غافر کی پیشگوئی پر یقین ہے؟'' معاً ضرقشاں نے زرغون سے پوچھا تو وہ پورے یقین سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... مجھے پورا یقین ہے غافر کی پیشگوئی پر۔ کیا تمہیں کسی قسم کا شک ہو رہا ہے؟'' ضرغون نے ضرقشاں کے حسین و دلکش چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ضرقشاں نے سنجیدہ لہجے میں فوراً کہا۔

''ہاں......!''

''مگر کیوں......؟ کیا اس سے پہلے کبھی بوڑھے غافر کی پیشگوئی غلط نکلی ہے؟'' زرغون نے اسے یاد دلایا۔

''غلط تو نہیں نکلی مگر اس بار لگتا ہے بوڑھے غافر کو خود اپنی بات پر بھروسہ کم ہے ورنہ وہ ادھوری پیشگوئی کیوں کرتا؟'' ضرقشاں نے پُر خیال لہجے میں کہا۔

''تم نے یہ کس طرح اندازہ لگا لیا، کیا تم بھی ستاروں کی چال کا علم رکھتی ہو؟'' زرغون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ستاروں کی چال کا علم تو نہیں رکھتی ہوں مگر دماغ رکھتی ہوں۔'' ضرقشاں نے پُرغرور لہجے میں کہا۔ ''بوڑھے غافر کی ادھوری پیشگوئی اور اس کا پریشان پریشان سا گم صم لہجہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے اب اپنے علوم پر پہلے جیسی دسترس نہیں رہی ہے۔''

''ضرقشاں......! اب تو تمہارے باپ نے بھی آخری فیصلہ دے دیا ہے کہ ہمیں ہر حالت میں اس جزیرے کو چھوڑنا ہے۔ ویسے ضرقشاں! میرا دل نہیں چاہتا اتنے خوبصورت جزیرے کو چھوڑنے کو۔'' زرغون نے کہا۔

''دل تو میرا بھی نہیں چاہتا۔'' ضرقشاں نے بھی قدرے حسرت سے کہا، پھر اچانک بولی۔ ''زرغون......! میرا خیال ہے ہم بوڑھے غافر کے پاس چلتے ہیں۔''

''اس کے پاس جا کر کیا کریں گے...... کیا تم اسے اپنی ادھوری پیشگوئی واپس لینے کا کہو گی؟''

''شاید ایسا بھی کہنا پڑے۔'' ضرقشاں نے پراسرار لہجے میں کہا تو زرغون چونک کر اس کا کھویا کھویا چہرہ تکتے ہوئے حیرت سے بولا۔

''کیا مطلب......؟''

''چھوڑو...... آؤ چلتے ہیں اس کی رہائش گاہ کی طرف...... بوڑھے غافر سے کچھ نہ کچھ پوچھنا ضروری ہے۔'' ضرقشاں نے زرغون کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا تو زرغون اپنا بھالا سنبھالے اس کے ساتھ چل دیا۔

گھنے جنگل میں چھدری چھدری شام کی سیاہی اترنے لگی تھی...... ہر سُو عجیب سا سکوت طاری ہونے لگا تھا۔ دم بخود سے ماحول میں عجیب سی غیر محسوس گونج محسوس ہو رہی تھی جیسے سارا جنگل سائیں سائیں کر رہا ہو۔ دور پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے سے بیکراں سمندر کی شوریدہ سر لہروں کا شور بھی بتدریج بڑھنے لگا تھا۔ بوڑھے غافر کا غار آبادی سے ذرا دور اور گھنے جنگل کے سرے پر واقع تھا۔

زرغون اور ضرقشاں خودرو جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈ سے گزرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ دفعتہً خاموش فضا میں تیز سنسناتی ہوئی پھنکار سنائی دی۔ دونوں بری طرح ٹھٹک گئے...... لیکن ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک ضرقشاں کی لچکیلی کمر کے گرد ایک موٹی رسی نما کوئی شے تیزی کے ساتھ لپٹتی چلی گئی اور ضرقشاں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ دوسرے ہی لمحے اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور وہ فضا میں اٹھتی چلی گئی...... ایک لمحے کو تو زرغون کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ ہوا کیا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ضرقشاں کی چیخ نے اسے چونکا دیا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو بری طرح ٹھٹک گیا...... ایک بلند و بالا اور چوڑے تنے والے درخت پر اسے ایک خوفناک اور دھاری دار اژدھا لپٹا ہوا نظر آیا جس نے ضرقشاں کو دبوچ رکھا تھا اور اب بڑا سا منہ کھولے اسے نگلنے کے لئے پَر تول رہا تھا۔ اژدھے نے ضرقشاں کے جسم کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا اور ضرقشاں کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بالکل بے بس ہو چکی تھی۔ تب زرغون نے اپنا بھالا ہاتھ میں تولا اور نیچے سے ہی اژدھے کے پھن کا نشانہ لے کر پوری قوت سے پھینکا۔ بھالا زرغون کے ہاتھ سے تیر کی طرح نکلا اور فضا میں اُڑتا ہوا اژدھے کے پھن میں پیوست ہو گیا۔

اژدھے نے پھنکار آمیز چنگھاڑ سی ماری اور ضرقشاں کے گرد بل کھول دیئے۔ نتیجتاً ضرقشاں چیختی ہوئی نیچے آ رہی مگر نیچے موجود زرغون نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ضرقشاں کو سنبھال لیا۔ ضرقشاں نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنا لمبے پھل والا خنجر نکال لیا۔ اژدھا درخت کے موٹے تنے سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ اب نیچے کی طرف اترنے لگا۔ اس نے اپنے چوڑے پھن کو دو تین بار جھٹکے دیئے تو زرغون کا پیوست زدہ بھالا پھسل کر نیچے آ رہا جسے زرغون نے فوراً پکڑ لیا۔ مگر ابھی یہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ اژدھا دھب سے ان کے اوپر آن گرا...... اژدھے کے پھن سے خون کی لکیر سی بہہ رہی تھی۔ اژدھے نے گرتے ہی زرغون کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ زرغون کو یوں لگا جیسے اس کی ہڈیاں چٹخنے لگی ہوں...... حتیٰ کہ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں۔

ضرقشاں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر تولا اور جنونیوں کے سے انداز میں اژدھے کے بل دار اور موٹے رسہ نما وجود میں گھونپنے لگی۔ اژدھے نے پھر زوردار پھنکار ماری اور چوڑے پھن والا منہ کھولے ضرقشاں کے چہرے کے بالکل قریب آ گیا...... ضرقشاں کی آنکھوں کے سامنے اژدھے کا غار نما کھلا منہ بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کے بالائی جبڑے میں دائیں طرف دو خم دار زہر میں بجھے ہوئے دانتوں نے ضرقشاں کے حواس مختل کر دیئے مگر زرغون کی ہنوز گھٹی گھٹی چیخوں نے ضرقشاں کے اندر ایک بار پھر ہسٹریائی انداز کا جوش بھر دیا اور اس نے نتیجے کی پرواہ کئے بغیر بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کا ایک بھرپور وار اژدھے کے غار جیسے منہ پر کیا اور اس کا جبڑا چیر کر رکھ دیا۔ اژدھے کا خوفناک اور چھوٹی چھوٹی طلسماتی آنکھوں والا منہ ضرقشاں سے تھوڑا ہی تو دور تھا لہٰذا ضرقشاں نے بس ایک ہی وار پر بس نہ کیا، وہ بہادرانہ جرأت اور جوشِ جنون میں پے در پے خنجر سے اس کے پھن پر وار کرتی رہی۔ ادھر اژدھے کی پوری کوشش تھی کہ وہ ضرقشاں کی صراحی دار گردن پر اپنے زہریلے خم دار نوکیلے دانت پیوست کر ڈالے مگر اس کی خواہش ضرقشاں کی بہادری کے آگے دم توڑنے لگی۔

اب زرغون بھی اژدھے کی بل دار گرفت سے آزاد ہو کر اپنا بھالا سنبھالے ضرقشاں کی مدد کو آ گیا تھا۔ اژدھا غیر معمولی طور پر خاصا طویل اور طاقتور تھا۔ زرغون نے فوراً

اندازہ لگا لیا کہ اژدھے کے آگے خنجر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں اژدھا کسی بھی لمحے ضرقشاں کی کلائی میں دانت پیوست کر سکتا تھا۔ یہ تو ضرقشاں کا جوش و جذبہ تھا کہ وہ اس جان لیوا خطرے کو فراموش کئے ہوئے تھی۔ لہٰذا زرغون نے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھالا سنبھالا اور آگے بڑھ کر اژدھے پر وار کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے اژدھا زمین پر گرا اور لہراتا، بل کھاتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ کافی دیر جنگل میں آس پاس اس کی زخمی پھنکاریں گونجتی رہیں۔ ضرقشاں اور زرغون نے وہاں زیادہ کھڑے ہونا مناسب نہ سمجھا اور آگے بڑھ گئے۔

وہ دونوں بوڑھے غافر کے غار کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ ان کے عقب میں گھنا تاریک جنگل تھا اور سامنے پہاڑیاں تھیں۔ دائیں طرف آبادی تھی۔ اور ڈھلوان چھتوں والی جھونپڑیوں سے روشنیاں جگنو کی طرح ٹمٹماتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کے سامنے ذرا ہی فاصلے پر بلند و بالا پہاڑی تھی۔ زمین سے قدرے اونچائی اور بلندی پر دائیں بائیں دو چھوٹی چھوٹی روشن دان نما کھڑکیاں تھیں۔ ایک کھڑکی کو شاید اندر سے پتھر کی کسی چھوٹی سل سے بند کر دیا گیا تھا جبکہ دوسری کھڑکی سے زرد روشنی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ زرغون اور ضرقشاں نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا پھر دونوں غار کی طرف بڑھ گئے۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے داخلی راستے پر پہنچے تو نجانے کیوں ان کا دل ناقابل بیان انداز میں یکبارگی زور سے دھڑکا مگر پھر دوسرے ہی لمحے یہ دونوں دروازے پر پڑے کھال کے پردے کو ایک طرف کر کے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے تنگ سی پتھریلی سیڑھیاں تھیں، اندر مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ روشنی پتھریلی دیوار میں سے جگہ جگہ بنے سنگی طاقچوں میں رکھے چراغوں سے ہو رہی تھی۔

یہاں غیر معمولی سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔ انہیں پورا یقین تھا کہ بوڑھا غافر اندر موجود ہو گا۔ یہ دونوں اکثر اس کے پاس آتے رہتے تھے۔ وہ ان سے مل کر بڑا خوش ہوتا تھا اور ان سے شفقت سے پیش آتا تھا۔ مگر جانے کیا بات تھی آج زرغون اور ضرقشاں کو یہاں غیر معمولی سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ تاہم وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے سنگی زینہ طے کرنے لگے۔ ابھی ان دونوں نے چند ہی زینے طے کئے ہوں گے کہ اچانک انہیں یوں لگا جیسے بلندی سے کوئی

شے لڑھکتی ہوئی نیچے چلی آ رہی ہو۔ وہ دونوں ٹھٹک کر رک گئے اور سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ سنگی زینے سے ایک انسانی کھوپڑی لڑھکتی چلی آ رہی تھی اور پھر عین ان کے قدموں پر آ کر ٹِک گئی۔ زرغون اور ضرقشاں مارے دہشت کے نیچے اتر کر کٹی ہوئی کھوپڑی کا چہرہ تکنے لگے...... وہ کھوپڑی بوڑھے غافر کی تھی جس کے کٹے ہوئے حصے سے تازہ رستا ہوا خون بھی نظر آ رہا تھا۔ بوڑھے غافر کی آنکھیں واتھیں جو ان دونوں کو سوگوار نظروں سے تکے جا رہی تھیں۔ تب کھوپڑی کے لب ہلے تو زرغون اور ضرقشاں نے بوڑھے غافر کو کہتے سنا۔

"خداوند......! ثورگان قبیلے پر رحم کر۔" یہ کہہ کر کھوپڑی کی دونوں آنکھیں بند ہو گئیں۔ زرغون اور ضرقشاں جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔



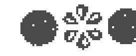
تاریک رات پورے جزیرے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔ آخیر راتوں کے چاند کی مدھم پراسراری روشنی میں جابجا پھیلے ٹنڈ منڈ درختوں کے ساتھ لاتعداد ٹوٹی پھوٹی اور بوسیدہ سی قبریں پھیلی ہوئی تھیں جن پر عجیب و غریب ساخت کے کتبے بھی ایستادہ نظر آ رہے تھے۔ یہ جزیرے کا بعید ترین گوشہ تھا جو ساحل سمندر کے قریب تھا۔ یہاں جابجا پھیلے درختوں کے تنے غیر معمولی طور پر موٹے اور آبنوسی رنگت کے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی ٹہنیاں اور بڑے بڑے جنگلی پتوں سے لدی ہوئی شاخیں بھی بعض اس قدر موٹی تھیں کہ جنہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے درخت کے اوپر درخت لگا ہوا ہو۔ پورے ماحول میں غضب کا سناٹا طاری تھا، ایسے ہی ایک قدرے چوڑے اور موٹے تنے والے آبنوسی درخت کی جڑ سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ یہ روشنی درحقیقت ایک گپھاہ نما راستے سے آ رہی تھی جو اس تناور درخت کی جڑ میں بنایا گیا تھا۔ یہ عجیب و غریب راستہ ایک بڑی سی درہ نما کوٹھڑی میں بدل گیا تھا۔ یہاں وسط میں ایک الاؤ روشن تھا۔ چھت زیادہ اونچی نہ تھی۔ چھت سے جڑ نما جٹائیں سی جھول رہی تھیں جن میں اکثر جٹاؤں کے سرے پر استخوانی انسانی کھوپڑیاں بندھی تھیں۔ دیواروں پر عجیب و غریب جانوروں کی چیختی چنگھاڑتی ہوئی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ دو ایک دیواروں پر عجیب وضع قطع کی شکلوں والے انسانوں کی بھی تصویریں کندہ تھیں۔ ایک طرف کونے میں میز نما مستطیل چبوترا

سا تھا جس پر درختوں کی چھال سے بنی صراحیاں دھری تھیں۔ اس میز نما چبوترے پر نصف دائرے کی صورت تین افراد مؤدبانہ انداز میں بیٹھے تھے۔ ان تینوں کے سامنے ایک جھکی جھکی کمر والا عمر رسیدہ شخص بھی آلتی پالتی مارے براجمان تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور ناک مڑی ہوئی تھی، سر کے بال اور بھنوئیں غائب تھیں، اس کا رنگ خاکستری تھا۔ اس نے سیاہ لمبا چغہ سا پہن رکھا تھا، گلے میں چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں کی مالا جھول رہی تھی۔ آنکھوں میں اس کی عجیب سی طلسماتی چمک تھی۔ چہرے پر بے شمار جھریوں کے جال نے اس کی شکل خاصی حد تک بدہیئت بنا رکھی تھی۔

یہ باگوپ تھا، ثورگان قبیلے کا پرانا اور معزول وید اور جادوگر...... یہ پراسرار علوم میں بوڑھے غافر سے کم نہ تھا لیکن اس نے ایک بہت ہی بھیانک جرم کیا تھا جس کی پاداش میں ثورگانی سردار جاذوب نے اسے سارے قبیلے کے سامنے جزیرے سے بے دخل کر دینے کا حکم جاری کیا تھا اور اسے ایک ڈونگے میں سوار کروا کے تین دنوں کے زادِ راہ کے ساتھ حوالۂ سمندر کر دیا تھا۔ یہ ان دنوں کا ذکر تھا جب سردار جاذوب نے نیا نیا قبیلے کا اقتدار سنبھالا تھا اور باگوپ نے پورے ثورگان قبیلے میں یہ بات پھیلانا شروع کر دی تھی کہ سردار جاذوب کی سرداری ثورگان قبیلے کے لئے نحس ثابت ہو سکتی ہے اور اس وقت قبیلے تک والوں پر آفات ٹوٹتی رہیں گی جب تک سردار جاذوب مسند نشین رہے گا۔

لوگوں نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرے لیکن پھر کچھ ہی روز بعد یوں ہونے لگا کہ قبیلے کے افراد پراسرار وبا کے زیر اثر مرنے لگے۔ سردار جاذوب اور اس کے زیرک لوگوں نے بوڑھے غافر کی مدد سے جب اس موذی، جان لیوا اور لاعلاج مرض کا پتہ چلایا تو یہ کارستانی باگوپ کی ثابت ہوئی۔ اس نے ہی سردار جاذوب کو معزول کرنے کے لئے ایک جڑی بوٹی اپنے حواریوں کے ذریعے قبیلے کے لوگوں کے کھانے پینے کی اشیاء میں گھول دی تھی۔ بس پھر کیا تھا، باگوپ کو اس جرم کی پاداش میں سمندر برد کرنے کی سزا سنائی گئی مگر ضرغل، ہاتر آختون اور جالوت وغیرہ کی حمایت کرنے پر باگوپ کو محض قبیلے سے بدر کرنے کی سزا عمل میں لائی گئی۔ باگوپ کی سازش بے نقاب ہوتے ہی قبیلے کے لوگ بھی اس سے شدید نفرت کرنے لگے تھے۔ اب دوبارہ باگوپ اس جزیرے کی سرزمین میں خفیہ طور پر فروکش تھا اور نئی سازش کے تانے بانے بُننے میں

مشغول تھا۔



زرغون اور ضرقشاں جانے کتنی ہی دیر دم بخود سے کھڑے بدنصیب بوڑھے غافر کی کٹی ہوئی کھوپڑی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہے تھے۔ پھر اگلے لمحے زرغون کے ساکت وجود میں اضطراری جنبش ابھری اور اس نے لرزتی ہوئی ضرقشاں کو سنبھالا پھر اس سے بولا۔

''ضرقشاں......! تم ادھر ہی رکو، میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے۔''

''نن...... نہیں...... میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی اوپر......'' ضرقشاں نے مضطربانہ انداز میں زرغون کا بازو پکڑتے ہوئے ہراساں لہجے میں کہا۔ تب زرغون نے خاموشی سے سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں اور ضرقشاں بھی اس کے عقب میں ہو لی۔

جب وہ دونوں اوپر پہنچے تو سامنے ایک بھیانک ولرزہ خیز منظر دیکھ کر بے اختیار ضرقشاں کے حلق سے چیخ نکل گئی...... زرغون بھی سامنے کا منظر دیکھ کر بری طرح ٹھٹھکا......

سامنے فرش پر بوڑھے غافر کا سربریدہ دھڑ بے سُدھ پڑا تھا...... خون کا ایک تالاب تھا جو بوڑھے کی سرکٹی لاش سے مسلسل بہہ رہا تھا۔ ابھی وہ دونوں سکتے کی حالت میں ہی کھڑے تھے، دفعتہً ایک کریہہ حیوانی چیخ ابھری اور اگلے ہی لمحے ان کی نظر چھت کے کونے میں پڑی۔ وہاں ایک گِدھ جتنی جسامت کی خوفناک چمگادڑ اُلٹی چپکی ہوئی دکھائی دی جو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے انہیں گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یکبارگی زرغون کا دل کسی خیال کے تحت زور سے دھڑکا اور اس نے سرگوشیانہ انداز میں ضرقشاں سے کہا۔

''ہوشیار ضرقشاں......!'' یہ کہہ کر اس نے فوراً اپنا بھالا دونوں ہاتھوں میں لے لی...... ضرقشاں بھی اب سنبھالا لے چکی تھی...... زرغون کی برماتی ہوئی سرگوشی پر اس نے بھی اپنے سمور کے لباس سے اپنا خنجر نکال کر دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

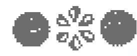
دوسرے ہی لمحے اس گِدھ ایسی جسامت والی چمگادڑ نے ایک اور کریہہ چیخ ماری اور پھڑپھڑاتی ہوئی کھلے محرابی دریچے سے باہر پرواز کر گئی...... زرغون دوڑتا ہوا محرابی دریچے کے قریب آیا تو اسے وہ چمگادڑ تاریکی میں پراسرار ہیولے کی طرح دور گھنے جنگل

کی طرف جاتی دکھائی دی۔

''یہ قتل ہے...... بوڑھے غافر کو کسی نے مار ڈالا ہے زرغون......!'' اچانک زرغون کو عقب میں ضرقشاں کی لرزاں آواز سنائی دی۔ وہ پلٹا...... ضرقشاں، بوڑھے غافر کی سربریدہ نعش کے پاس کھڑی تھی...... وہاں عجیب سی بُو پھیلی ہوئی تھی اور ایک سوگوار خاموشی طاری تھی...... مخروطی چھت سے ایک چراغ نما فانوس جھول رہا تھا...... کمرے میں اور بھی نجانے کیا کیا الا بلا بکھرا ہوا تھا۔

''مجھے لگتا ہے بوڑھے غافر کے قتل سے اس چمگادڑ کا کوئی تعلق تھا۔'' زرغون نے بوڑھے غافر کی لاش کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو زرغون...... بستی والوں کو اطلاع کرتے ہیں...... پتہ نہیں اب ہم پر اور کون سی آفت ٹوٹنے والی ہے۔'' ضرقشاں نے پریشان ہو کر کہا۔ پھر وہ دونوں سنگی زینے کی طرف بڑھ گئے۔



''عظیم لوبولیلا تم چاروں سے بہت خوش ہے...... لیکن ابھی تم نے اس کے مفادات کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔'' ایک طویل خاموشی کے بعد بوڑھے ساحر باگوپ نے اپنے سامنے براجمان ضرغل، ہاتر آختون اور جالوت کی طرف دیکھ کر بھاری لہجے میں کہا۔ یہ تینوں جانتے تھے۔ ان ''چاروں'' سے مراد چوتھا شیمرون تھا جو اس وقت ایک اہم مقصد کے لئے یہاں سے باہر تھا اور یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے...... آج انہوں نے بعض اہم معاملات پر گفتگو کرنی تھی اور شیمرون کی آمد تک یہ لوگ خاموش بیٹھے تھے۔ مگر وقفے وقفے سے بوڑھا ساحر باگوپ ان چاروں کی کارکردگی پر ان کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

دفعتہً ایک بڑی سی چمگادڑ اندر آ کر چکرانے لگی۔ اس کے بعد دیوار کے کونے سے چپک کر اُلٹی لٹک گئی۔ یہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ وہی چمگادڑ تھی جو بوڑھے غافر کے غار سے نکل بھاگی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وہ چمگادڑ ایک ملگجے سے دھوئیں میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد وہی ملگجا دھواں دھیرے دھیرے زمین پر آ گیا اور انسانی شکل اختیار کرتے ہوئے اب

باقاعدہ ایک جیتے جاگتے انسان کی طرح نظر آنے لگا۔ یہی شیمرون تھا جس کا یہ لوگ انتظار کر رہے تھے۔ وہ اب مودبانہ انداز میں چلتا ہوا باگوپ کے سامنے ضرغل، باتر آختون اور جالوت کے ساتھ آ بیٹھا۔

’’کیا دم پرواز ہو گیا اس بوڑھے کا......؟‘‘ باگوپ نے شیمرون کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’ہاں...... میں نے اپنا کام کر دیا تھا مگر......‘‘ شیمرون بتاتے بتاتے رکا۔ اس کے چہرے پر گہرے تفکرات کے آثار نمایاں تھے۔

’’کیا بات ہے شیمرون...... تمہیں اس کام سے دکھ پہنچا...... کیا تم بوڑھے غافر کو قتل کرنا نہیں چاہتے تھے؟‘‘ باگوپ نے مکارانہ نظروں سے شیمرون کے چہرے کی طرف بغور گھورتے ہوئے پوچھا۔

’’نہیں...... یہ بات نہیں...... جب میں نے انسانی روپ میں آ کر بوڑھے غافر کو قتل کر کے اس کا سر تن سے جدا کر دیا تو اسی وقت اچانک نجانے کی طرح زرغون اور ضرقشاں وہاں آ گئے۔‘‘ شیمرون بتانے لگا۔ ’’میں ان کے قدموں کی آہٹ سن کر یکدم چمگادڑ کے روپ میں دیوار سے جا چپکا اور وہاں سے جب نکل بھاگا تو وہ دونوں مجھے دیکھ چکے تھے۔‘‘

’’کیا ان دونوں نے تمہیں انسانی روپ میں تو نہیں دیکھا تھا......؟‘‘ اچانک باگوپ نے پوچھا۔

’’نہیں......! میں اس وقت تک چمگادڑ کا روپ دھار چکا تھا۔

لمحہ بھر کو خاموشی چھا گئی...... شیمرون کی باتیں سن کر ضرغل، باتر آختون اور جالوت کے چہروں پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زرغون اور ضرقشاں کون تھے...... ضرغل نے باگوپ سے کہا۔

’’یہ برا ہوا...... زرغون اور ضرقشاں بڑے ہوشیار نوجوان ہیں۔‘‘

’’ختم کرو اس بات کو...... جب تک میں ہوں، تم لوگوں کو ڈرنے کی ضرورت نہیں...... اب جو میں کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنو۔‘‘ باگوپ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر گونجدار آواز میں کہا۔ ’’سردار جاذوب کا سورج غروب ہونے والا ہے...... اس نے عظیم

لوبولیلا کے پیروکار باگوپ کے ساتھ بہت زیادتیاں کیں حتیٰ کہ جزیرہ بدر کیا گیا مگر تم نے دیکھا میں اب تم لوگوں کے سامنے ہوں...... میں چاہتا تو خون خرابہ ہو سکتا تھا لیکن مجھے اپنے قبیلے کے معصوم لوگوں کا خیال آ گیا...... اب گمنامی کی زندگی گزار رہا ہوں۔‘‘

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ضرغل، باتر آختون، جالوت اور شیمرون کے چہروں پر قدرے بیزاری اترنے لگی کیونکہ وہ باگوپ کے منہ سے اس جملے کو بار بار سن چکے تھے...... ان چاروں کو تو بس اپنے مطلب کی گفتگو سے غرض تھی اور وہ اس بات کے منتظر تھے کہ کب باگوپ ان کے مطلب کی بات کرتا ہے اور سردار جاذوب کو غافر کی طرح راستے سے ہٹانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتا ہے؟

درحقیقت ضرغل، تورگان قبیلے کا سردار بننے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے باتر آختون کو اپنا مشیر خاص جبکہ جالوت اور شیمرون کو مجلسِ مشاورت میں شامل کرنے کا لالچ دے رکھا تھا لیکن ان چاروں کے دلوں میں کیا تھا؟ وہ ان کے اپنے اپنے دلوں تک ہی محدود تھا حتیٰ کہ یہ چاروں جو باگوپ کا دم بھرتے تھے، نہیں جانتے تھے کہ یہ مکار بوڑھا ساحر باگوپ اپنے دل میں کیا منصوبہ رکھتا تھا۔ باگوپ جب لمحہ بھر کو رکا تو ضرغل اپنے بیزار کن لہجے کو دباتے ہوئے اس سے بولا۔

’’عظیم لوبولیلا کے عظیم پیروکار! بوڑھا غافر تو چل بسا...... میرا خیال ہے اب تم کو اپنی گمنامی چھوڑ کر بوڑھے غافر کی جگہ سنبھال لینی چاہئے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے باگوپ کے لمبوترے چہرے کی طرف دیکھا جو کسی سوچ میں مستغرق تھا۔ جب یہ خاموشی طول پکڑنے لگی تو باتر آختون جو اس اطلاع کے بعد کہ ان کا ایک چوتھا ساتھی شیمرون بوڑھے غافر کو بیدردی سے قتل کر آیا تھا تو وہ ایک بے نام سی بے چینی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ لہٰذا جب باگوپ کو اس نے بدستور خاموش پایا تو اپنی اس بے چینی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بولا۔ ’’عظیم پیروکار...... اب اس بوڑھے غافر کی ادھوری پیشگوئی کا کیا ہو گا...... اس نے جس بے نام آفت کی ادھوری پیشگوئی کی تھی...... ہمیں اس سے بھی تو نمٹنا ہو گا۔‘‘

’’ہاں اے عظیم پیروکار......! باتر درست کہتا ہے...... پورا قبیلہ اس وقت جزیرے سے کوچ کی تیاری کر رہا ہے اور لازماً ہمیں بھی یہاں سے جانا پڑے گا۔‘‘ جالوت نے

باتر آختون کی تائید میں کہا تو بوڑھا ساحر باگوپ یکدم اپنی طویل پراسرار خاموشی کو توڑتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کر کے بولا۔

"تم لوگ شاید عظیم لوبولیلا کے عظیم پیروکار باگوپ کو معمولی انسان سمجھتے ہو...... تم لوگوں نے ابھی تک کیا مجھے ایک کمزور اور دھتکارے ہوئے قیدی کی طرح سمجھ رکھا ہے...... کم عقلو! آج کے اور پہلے کے باگوپ میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے اور تم لوگ کیا جانو کہ عظیم لوبولیلا نے مجھے کیسی کیسی طاقتوں سے نواز دیا ہے اور نواز رہا ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر رکا۔ اس کے چہرے پر ہنوز پراسرار مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

"تم نے کبھی یہ سوچا کہ ایک طویل عرصے سے بوڑھا غافر درست پیشگوئی کرتا چلا آ رہا تھا۔ پھر اس بار کیوں اس نے ادھوری پیشگوئی کر کے پورے قبیلے کو خوف میں مبتلا کر دیا...... تم جانتے ہو کہ اس طرح کی ادھوری پیشگوئی کس قدر تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکا پھر اپنے سینے کو ایک ہاتھ سے پیٹتے ہوئے بولا۔ "میں...... یہ میں تھا جس نے یہاں بیٹھے بیٹھے بوڑھے غافر کی مستقبل بینی کی صلاحیت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ ارے نادانو! یہی تو بہترین وقت ہے کہ ہمیں قبیلے کی باگ سنبھال لینی چاہیے۔"

"یہی تو ہم پوچھنا چاہ رہے ہیں عظیم پیروکار کہ یہ سب کچھ آخر کیسے ہو گا؟" ضرغل نے بے چینی سے کہا۔ باگوپ کی گفتگو نے اب ان سب کو دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ثورگان قبیلے پر کوئی آفت نہیں آ رہی۔ یہ صرف میرا کھیل تھا تا کہ بوڑھے غافر کو لوگوں کے سامنے نا اہل ثابت کر کے دکھا دوں۔" باگوپ نے گونج دار لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میں نے ہی ادھر بیٹھے بیٹھے اپنے جادو کے ذریعے بوڑھے غافر کے زائچے میں ایسا ہیر پھیر ڈالا کہ اسے ثورگان قبیلے پر تباہی کے آثار نظر آنے لگے۔ بوڑھے غافر نے بہت کوشش کی کہ قبیلے کو ادھوری پیشگوئی کی بجائے مکمل پیشگوئی سنائے مگر آفت کی کوئی حقیقت ہوتی تو وجہ اس کی سمجھ میں آتی...... ہم خود ہی سراپا آفت تھے۔ لہٰذا تم لوگ بے فکر ہو جاؤ...... تم پر یا قبیلے پر کوئی تباہی نہیں نازل ہونے والی...... بھلا ہم سے بڑھ کر آفت یا تباہی اور کیا ہو سکتی ہے؟" بوڑھے ساحر باگوپ نے معنی خیز پراسراریت

سے کہا تو جانے کیوں اس کے ان آخری الفاظ پر سامنے دو زانو بیٹھے ضرغل، باتر آختن، جالوت اور شیمرون اپنی جگہ جیسے لرز سے گئے۔ تاہم انہیں یہ سن کر قدرتی دلی طمانیت ہوئی تھی کہ قبیلے پر کوئی آفت نہیں آنے والی تھی...... یہ سب جھوٹ تھا اور یہ ایک ایسا خوشگوار راز تھا جسے اگر یہ لوگ ثورگان قبیلے کو آگاہ کر دیتے تو ان کی نظروں کے سامنے خوشی کی یہ نوید سنانے والے کی قدر و قیمت عقیدت کا درجہ اختیار کر جاتی...... وہ چاروں اب بوڑھے ساحر باگوپ سے متاثر نظر آنے لگے تھے۔

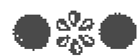
ضرغل نے خوشی سے لرزتے لہجے میں کہا۔ "اے عظیم لوبولیلا کے عظیم پیروکار......! تو یہ راز بلکہ یہ خوشخبری اسی وقت ثورگان قبیلے کو سنا دے تا کہ وہ لوگ تجھے فوراً بوڑھے غافر کی جگہ جانشین بنا دیں۔"

"ہاں...... میں نے اسی لئے غافر کو قتل کروایا ہے۔ کیونکہ اس کے زندہ رہنے اور اس کی موجودگی سے میری بات کا کون یقین کرتا۔ لیکن اب بھی ایک مشکل ہے۔"

"کون سی مشکل عظیم پیروکار!" چاروں یک زبان ہو کر مستفسر ہوئے۔

"میں نے اگر خود کو ظاہر کر دیا تو یقیناً سردار جاذوب اور اس کے ساتھی مجھے پکڑ کر قید خانے میں ڈال دیں گے۔ وہ میرا بگاڑ تو کچھ نہیں سکتے لیکن اگر میں طیش میں آ گیا تو سب کو جلا کر خاک کر دوں گا۔" یکایک باگوپ کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوتا چلا گیا اور بڑا بھیانک منظر پیش کرنے لگا۔ اس کے سامنے بیٹھے ضرغل وغیرہ بھی ایک لمحے کو اس کے سرخ پڑتے چہرے اور اس کی قہر و غضب میں ڈوبی کیفیت کو دیکھ کر لرز گئے۔

"لیکن عظیم پیروکار......! اب تمہارے باہر آنے کا وقت آ گیا ہے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں گے۔ سردار جاذوب کے اقتدار کا سورج ڈوب کر رہے گا...... ہم چاروں پہلے تمہارے سامنے آنے کی راہ ہموار کریں گے۔ پھر تم سامنے آ کر پورے قبیلے کو خوشخبری سنا دینا۔" ضرغل نے کہا اور باگوپ نے آنکھیں موند لیں۔ پھر وہ چاروں دیوہیکل درخت کی جڑ سے باہر نکل آئے۔



قبیلے میں کہرام مچ گیا تھا...... بوڑھے غافر کے لرزہ خیز قتل نے پورے قبیلے پر

سراسیمگی طاری کر دی تھی...... سب سے پہلے زرغون نے اپنے باپ غرقش اور ضرقشاں نے اپنے سردار باپ جاذوب کو بوڑھے غافر کے بہیمانہ قتل کے بارے میں مطلع کیا۔ سردار خانے میں اس وقت مشیر خاص غرقش اور سردار جاذوب دونوں ہی موجود تھے۔ وہ دونوں اس وقت ضرغل، ہاتر آختون اور جالوت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ انہیں ان تینوں کی پراسرار سرگرمیوں کے بارے میں شک تھا۔ جب انہیں بوڑھے غافر کی موت اور وہ بھی لرزہ خیز قتل کی اطلاع ملی تو دونوں کی پریشانی سوا ہوگئی۔ سردار نے فوراً اپنے آدمی غار کی طرف دوڑا دیئے اور خود بھی اس جگہ پہنچنے کے لئے پالکی تیار کرنے کا حکم جاری کیا۔ اس بار پالکی میں اس کے بیوی بچوں کی بجائے صرف اس کا مشیر خاص غرقش اور اس کی بیٹی ضرقشاں تھی۔

سازش کرنے والے اپنا کام کر چکے تھے مگر بوڑھے غافر کے لرزہ خیز قتل سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا، یہ سردست کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سب کے ذہن میں یہی سوال بار بار گردش کر رہا تھا کہ بھلا بوڑھے غافر سے کسی کو کیا دشمنی ہوسکتی تھی۔ بہرحال بوڑھا غافر قتل ہو چکا تھا۔ اس کی آخری رسوم ثورگان قبیلے کی روایات کے مطابق انجام دے دی گئیں اور اسے جزیرے کے بعید ترین گوشے میں جدھر ٹنڈ منڈ جڑواں تنوں والے آبنوسی پیڑوں کی بہتات تھی، وہاں دفنا دیا گیا۔ یہ ثورگان قبیلے کا قبرستان تھا۔ سارے قبیلے کے لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں، بوڑھا غافر ان کے لئے نہ صرف ایک مربی کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ وہ بڑا قابل اور لائق وید، علم نجوم کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس نے غیر معمولی طور پر بڑی طویل عمر پائی تھی اور اتنا عرصہ تک لوگوں کے دل اور ذہنوں میں چھایا رہا تھا۔ یوں تو ماضی میں ثورگان قبیلے کے سردار بدلتے آئے تھے مگر بوڑھا غافر لوگوں کے دلوں میں حکومت کرتا تھا۔

بوڑھے غافر کی آخری رسومات اشکبار آنکھوں کے ساتھ اختتام پر پہنچنے کے بعد سردار جاذوب نے وہیں قبرستان میں پورے قبیلے سے خطاب بھی کیا تھا۔

"ثورگان کے معصوم باسیو! تم پر خداوند عظیم کی مہربانی ہو...... ہماری قوم کا پرانا مربی غافر آج ہم سے جدا ہوا مگر وہ ہمارے دلوں سے، ہمارے دماغوں سے، ہمارے پردۂ تصور سے اور ہمارے محسوسات سے جدا نہیں ہوا۔ اس کی جدائی کا دکھ بلاشبہ بہت گہرا

اور ہماری آئندہ نسلوں تک یہ غم محسوس کیا جاتا رہے گا۔ آج ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ ہمارے سروں سے محبت کرنے والا، ہمارا تحفظ کرنے والا سایہ اٹھ گیا۔ آؤ، آہ و زاریاں کرتے ہیں...... روتے ہیں تاکہ ہمارے دلوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ ورنہ ہمارے دل دکھ اور غم سے پھٹ جائیں گے۔"

اتنا کہہ کر سردار جاذوب چپ ہوا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رو پڑا۔ پھر تو جیسے آنسوؤں، اشکوں اور آہ و زاریوں کا طوفان امڈ پڑا۔

آبنوسی پیڑوں والے اس قبرستان میں آہوں اور سسکیوں کا سیلاب رواں ہو گیا تھا...... قبیلے کے سارے ہی لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور پچھاڑیں مار کر اپنے بال نوچ رہے تھے۔ ادھر یہ آہ و بکا جاری تھی...... ادھر قبرستان کے شمالی گوشے میں ایک موٹے تنے والے آبنوسی پیڑ کی جڑ کے اندر گپھا نما پناہ گاہ میں بوڑھا ساحر باگوپ زمین سے پیوست مستطیل نما چبوترے پر پالتی مارے بیٹھا تھا...... اس کے سیاہ بدہیئت ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی...... آہ و زاری اور لوگوں کے بین کرنے کی آوازیں اس کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں حتیٰ کہ سردار جاذوب کے خطاب کرنے اور بعد اس کے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں بھی صاف اسے سنائی دے رہی تھیں۔ سردار جاذوب کی آہ و فغاں اس کے منتقم دل کو کافی سکون پہنچا رہی تھی کیونکہ ساحر باگوپ کے دل میں سردار جاذوب کے لئے ایک بہت پرانا بغض پل رہا تھا۔ سردار جاذوب نے اسے قبیلے میں غلط افواہیں پھیلانے کے جرم میں جزیرے سے نکال دینے کا حکم دیا تھا اور اس کے اس حکم پر عمل بھی ہوا تھا۔ لیکن باگوپ اپنے ایک شیطانی چیلے شیمرون کی مدد سے سیاہ رات کی خاموشی میں دوبارہ جزیرے پر آ کر روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی راہ کا پتھر غافر ہے، جب تک وہ زندہ ہے، اسے ثورگان قبیلے کے منجم کی حیثیت نہیں مل سکتی۔

"ہا...... ہا...... ہا...... اب میں سارے ثورگان قبیلے کو اپنا غلام بنا لوں گا...... اور پھر سردار جاذوب کو اس کے خاندان سمیت جزیرے سے نکال باہر کروں گا۔ تب میرا انتقام پورا ہو جائے گا... ہا... ہا... ہا..." باگوپ کے بدمست اور شیطانی قہقہے گونج رہے تھے۔

اپنے شیطانی پیروکار باگوپ سے ملاقات اور ہدایات پانے کے بعد یہ تینوں اب سر جوڑ کر بیٹھے تھے...... یہ پھونس کی ایک مستطیل جھونپڑی تھی جس میں ان تینوں کے سوا کوئی نہ تھا...... ان کا چوتھا ساتھی شیمرون مستقل طور پر اب باگوپ کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ باگوپ نے طویل ریاضت اور کالے منتروں کی مدد سے اسے چمگادڑ میں تبدیل ہونے کی پراسرار قوت سے نواز دیا تھا۔

یہ تینوں ضرغل، ہاتر آختون اور جالوت اب اس بات پر سوچ و بچار کر رہے تھے کہ باگوپ نے جو انہیں نئی ذمہ داری سونپی ہے، وہ کس طرح انجام تک پہنچائی جائے۔

”ابھی بوڑھے غافر کی موت کا غم تازہ ہے۔ اگر ہم نے قبیلے میں ایسی ویسی بات پھیلانے کی کوشش کی تو یہ مناسب نہ ہوگا۔“ جالوت نے چند ثانئے کی گہری خاموشی کے بعد رائے دی۔

”یہ کام تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد ہی ہمیں انجام دینا چاہئے۔“ ہاتر آختون نے بھی جالوت کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”مگر ہم نے بوڑھے غافر کی موت کے بعد بہت سے کام انجام دینے ہیں اور جس قدر جلدی یہ کام ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ اب تو ہمیں اس بات پر بھی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم پر کوئی آفت آنے والی ہے۔“ ضرغل نے کہا۔ وہ درحقیقت ثورگان قبیلے کا سردار بننے کے لئے بے قرار تھا۔ ”میں جتنی جلدی ثورگان قبیلے کی سرداری سنبھال لوں، اتنی ہی جلدی تمہیں بھی معتبر حیثیتیں مل جائیں گی۔ میرا خیال ہے ہمیں کم از کم یہ خوشخبری قبیلے کے لوگوں کو سنا ڈالنی چاہئے کہ ان پر کوئی آفت نہیں آ رہی ہے۔“

”مگر ہم کس حیثیت سے یہ بات کہیں گے اور ہماری کون مانے گا؟ یہاں تو سب لوگ جزیرے سے کوچ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔“ ہاتر آختون نے کہا۔

”ٹھیک ہے...... پھر ہمیں آج ہی سے اپنے ہم خیال چیلوں کے ذریعے باگوپ کے خیالات کا پرچار شروع کر دینا چاہئے۔“ ضرغل نے آخر میں حتمی لہجے میں کہا اور پھر ہاتر اور جالوت دھیرے دھیرے پُر خیال انداز میں اپنا سر اثبات میں ہلانے لگے۔



یہ کام بڑی تیزی کے ساتھ انجام پایا تھا اور جتنی تیزی کے ساتھ ہوا تھا اتنی ہی تیزی کے ساتھ اس کا قبیلے کے اکثر لوگوں پر اثر بھی ہوا تھا اور لوگوں میں پہلے تو آپس میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ کیا واقعی باگوپ کو سردار جاذوب نے بے گناہ جزیرے سے نکالنے کی سزا دی تھی۔ کیا اس میں کسی ذاتی دشمنی کا دخل تھا؟ بہرحال قبیلے میں نفاق کا بیج بڑی تیزی کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔ ضرغل وغیرہ کے چیلے قبیلے کے اندر لوگوں میں دبے دبے الفاظ میں یہ بات بھی مشہور کرنے لگے تھے کہ ان پر جو آفت ٹوٹنے والی تھی، وہ غلط تھی۔ بوڑھا غافر طویل العمری کے باعث اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس کے سارے علوم کمزور پڑنے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب اپنے بڑھاپے کے باعث ادھوری پیشگوئیاں کر کے بلاوجہ قبیلے کے لوگوں کو پریشان کرنے لگا تھا۔ قبیلے پر کوئی آفت نہیں آنے والی اور مزید یہ کہ اگر قبیلے کے سارے لوگ باگوپ کو اپنا نجات دہندہ مان لیں تو یہ پورے قبیلے کے لوگوں کے اپنے مفاد میں بہتر ہوگا۔

یہ گل کھلانے کی دیر تھی کہ قبیلے کے اکثر لوگوں نے باگوپ کو بوڑھے غافر کی جگہ اپنا نجات دہندہ بنانے کے لئے شور مچانا شروع کر دیا۔ لوگوں کے باگوپ کے لئے شور مچانے کی دیر تھی کہ ضرغل، ہاتر آختون اور جالوت نے فوراً باگوپ کے منظر عام پر آنے کا اشارہ دے دیا۔ بس پھر کیا تھا، چالاک ساحر باگوپ اسی وقت کا تو منتظر بیٹھا تھا، فوراً اپنی روپوشی ترک کر کے منظر عام پر آ گیا۔ اس کے حامیوں نے اسے فوراً ہاتھوں ہاتھ لیا اور مارے عقیدت کے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ پھر قبائلی انداز میں ناچتے گاتے اور ”گانگ“ بجاتے ہوئے اسے بوڑھے غافر کے غار کے باہر چبوترے پر کھڑا کر دیا۔

”مجھے اس بات کی خوشی ہوئی ہے کہ تم لوگوں نے حق کو پہچانا...... اگر آج مجھے تمہارا سردار جاذوب مار بھی ڈالے تو مجھے کوئی غم نہ ہوگا۔ مگر میں تمہارے دلوں میں خوف یا بے چینی پیدا کرنا نہیں چاہتا ہوں اور تم لوگوں کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ تم پر کوئی آفت نہیں آنے والی۔“ باگوپ نے غار کے باہر چبوترے پر کھڑے ہو کر خطاب کرنا شروع کیا۔ ”مجھے غافر کی موت کا بے حد دکھ ہے لیکن مجھے تم لوگوں کو یہ حقیقت بتاتے ہوئے ذہنی اذیت ہو رہی ہے کہ غافر نے میری مخالفت کی۔ حالانکہ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ جس طرح پورے ثورگان قبیلے والوں کے لئے محترم ہے اسی طرح میری

نظروں میں بھی اس کا احترام ہے لیکن اسے نجانے مجھ سے کس بات کا خطرہ تھا کہ اس نے تمہارے سردار جاذوب کو بھی میرے خلاف بھڑکایا اور یوں مجھ پر الٹے سیدھے الزامات لگا کر جزیرے سے نکال دیا گیا۔ لیکن میرے دل میں اپنی پوری ثورگانی قوم کا درد تھا...... میں واپس آنا چاہتا تھا مگر قبیلے میں خون ریزی کے خوف سے میں دوبارہ یہاں نہیں آیا اور میں ہزاروں میل کی مسافت پر ایک ویران چھوٹے سے جزیرے میں رہنے لگا۔ مگر میں اپنی قوم کو کبھی نہیں بھولا۔ پھر مجھے اپنے لامحدود علم کے زور سے معلوم ہوا کہ بوڑھے غافر نے اپنے کمزور پڑتے ادھورے علم سے تم لوگوں کو خوف اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے...... تم لوگوں کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے کہ جب غافر نے ادھوری پیشگوئی کی تھی تو میں نے ایک رات تنہائی میں ایک نیک روح کی حیثیت سے اس سے ملاقات کر کے عاجزانہ گزارش کی وہ ایسی غلط پیشگوئی کر کے قبیلے کے معصوم لوگوں کو پریشان نہ کرے مگر غافر نے میری ایک نہ سنی...... میں نے اسے عظیم دیوتا کے قہر سے بھی ڈرایا لیکن وہ نہ مانا اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچا۔"

اتنا کہہ کر مکار باگوپ نے اپنا خطاب بند کیا تو سارے قبائلی خوشی سے چلا چلا کر اس کے حق میں گانگ اور نرسنگا بجانے لگے۔

ایسے میں اچانک سردار جاذوب کے آدمیوں نے باگوپ کو اپنی گرفت میں لے لیا تو وہاں موجود سارے لوگ بلکہ پورا ہجوم مشتعل ہو گیا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ سردار جاذوب کے آدمیوں کی تکا بوٹی کر ڈالتے مکار باگوپ نے مزید لوگوں کے دلوں میں اپنا اثر جمانے کے لئے انہیں اس خونریزی سے روک دیا۔

"ی ہیں...... میں تم لوگوں کو اس خونریزی کی اجازت نہیں دوں گا...... یہ بھی اپنے ہی قبیلے اور قوم کے لوگ ہیں مگر نادان ہیں...... انہیں وہ کچھ کر لینے دو جن کا انہیں سردار جاذوب نے حکم دیا ہے۔ تم لوگوں نے مجھے اتنا کمزور کیوں سمجھ لیا ہے، میں خود سردار جاذوب سے بات کروں گا...... تم لوگ مجھے تنہا تو نہیں چھوڑو گے؟"

"اس بار سارے مجمع میں شور بلند ہو گیا...... اب جو اکا دکا لوگ باگوپ سے انحراف کر رہے تھے وہ بھی اس کی چرب زبانی سے اس کے حامی ہو گئے۔ لہٰذا جب سردار جاذوب کے آدمی باگوپ کو پکڑ کر سردار کے پاس لے جانے لگے تو قبیلے کے سارے ہی

لوگ غیظ جوش میں اس کے ساتھ ہو لئے۔ وہ لوگ اب سردار جاذوب کے خلاف گانگ اور نرسنگا بجا رہے تھے۔

جب باگوپ کو سردار جاذوب کے سامنے پیش کیا گیا تو اس وقت سردار جاذوب غصے سے زیادہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت اس کے بڑے سے مستطیل جھونپڑے میں اس کے مشیرِ خاص غرتش سمیت مجلسِ مشاورت کے دیگر آٹھ افراد کے علاوہ ضرغل، باتر آختون اور جالوت بھی موجود تھے۔ یہ تینوں بظاہر اپنے چہروں پر فکرمندی کے تاثرات لئے بیٹھے تھے مگر درحقیقت اپنی سازش اور باگوپ کی کامیابی پر دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کیونکہ باگوپ کی کامیابی ان کی کامیابی تھی اور ضرغل کو تو اپنے سردار بننے کا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

باگوپ کو رسیوں سے جکڑ کر سردار جاذوب کے سامنے لایا جا چکا تھا۔ پھر بھی سردار کے چہرے پر پریشانی تھی اور باگوپ کے لمبوترے خاکستری چہرے پر بڑی مکارانہ اور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جھونپڑی کے باہر قبیلے کے تمام لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور سردار کے خلاف گانگ بجا رہے تھے جبکہ باگوپ کی حمایت میں نرسنگے۔

"جاذوب......! اب میں پہلے والا ایک کمزور بوڑھا نہیں رہا جسے تُو آسانی سے اپنے راستے سے ہٹا کر جزیرے سے نکال دے...... تیری اور تیرے خاندان والوں کی بہتری اسی میں ہے کہ تُو نہ صرف مجھے راستے سے ہٹانے کا خواب چھوڑ دے بلکہ سرداری سے بھی منہ موڑ لے...... اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ ثورگان قبیلے کے مفاد میں نیا سردار مقرر کروں۔"

"خاموش ہو جا...... ورنہ تجھے ایسی عبرتناک موت ماروں گا کہ تُو...... تُو...... ساری عمر یاد رکھے گا......" باگوپ کے گستاخانہ روّیے پر سردار جاذوب غیظ و غضب سے کانپ اٹھا تھا مگر اس کی لرزیدہ سی آواز میں پہلے جیسا رعب و دبدبہ نہ رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت باہر قبائلیوں کا شور بتدریج بلند ہوتا چلا جا رہا تھا اور وہ فوری طور پر باگوپ کو آزاد کرنے کا پُرزور مطالبہ کر رہے تھے اور زور زور سے نرسنگا بجا رہے تھے...... ایسے میں اچانک چند محافظ بدحواسی میں اندر آئے اور سردار جاذوب سے بولے۔

"سردار......! باہر بہت خطرناک حالات پیدا ہو گئے ہیں، وہ لوگ باگوپ کو اپنی

آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں ورنہ...... ورنہ...... وہ چڑھائی کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔"

ان کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ سردار جاذوب کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

ایسے میں باگوپ نے ضرغل کو مخصوص اشارہ کیا تو ضرغل ایک دم بدلے ہوئے لہجے اور خاصے تنبیہی انداز میں سردار جاذوب سے مخاطب ہوا۔ "سردار...... قبیلے کی بہتری اور بقاء کے لئے ہم پر اب یہ لازم ہے کہ باگوپ کو فوراً چھوڑنے کا حکم جاری کریں ورنہ سب قبیلے کے لوگ آپس میں کٹ مریں گے اور تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

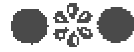
"ہرگز نہیں......" سردار جاذوب چراغ پا ہو کر زور سے دھاڑا۔ "میں اس شیطان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ نجانے کب سے یہاں چھپا میرے خلاف سازش کے تانے بانے بُن رہا تھا۔

ضرغل نے سردار کی بات سن کر ایک نظر اپنے ہم خیال ہاتر آختون اور جالوت کی طرف دیکھا پھر دیگر مجلس مشاورت کے آٹھ افراد کے چہرے تکنے لگا۔ انہوں نے بھی ضرغل کی نظروں کا مطلب بھانپتے ہوئے بیک وقت اپنے سروں کو تفہیمی جنبش دی۔ بس پھر کیا تھا، اگلے ہی لمحے ضرغل نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے وہاں موجود محافظوں کو حکم دیا۔

"تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجلس مشاورت ایک سردار سے زیادہ قوت رکھتی ہے اور اس کے اختیار کے مطابق سردار کو کسی بھی وقت معزول کیا جا سکتا ہے۔ ہم اب تم لوگوں کو حکم دیتے ہیں کہ باگوپ کو فوراً آزاد کر کے باہر قبیلے والوں کے سامنے پیش کر دو۔ پھر جو وہ فیصلہ کریں بعد میں باگوپ کی مرضی سے ثورگان قبیلے کا نیا سردار چن لیا جائے گا۔" ضرغل نے کہا تو محافظوں نے فوراً سردار جاذوب کے حکم کو رد کرتے ہوئے باگوپ کو آزاد کر دیا اور نہایت احترام کے ساتھ اسے جھونپڑی سے باہر لے گئے۔

سردار جاذوب بھی یکدم سناٹے میں آ گیا اور بڑی قہر بار نظروں سے ضرغل کا چہرہ گھورنے لگا مگر ضرغل بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ اس کی طرف سے منہ پھیر کر دیگر لوگوں سے احتراماً بولا۔

"آؤ ہم سب بھی باہر چلتے ہیں، قبیلے کے لوگ یقیناً بے چینی سے ہمارے منتظر ہیں۔" یہ کہہ کر وہ بھی باہر نکل گیا اس کے عقب میں سارے مشیر بھی سردار جاذوب کو نظر انداز کرتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکل گئے اور سردار جاذوب اندر تنہا کھڑا رہ گیا تھا...... اسے جانے کیوں اپنی ٹانگوں پر بھی کھڑا ہونا دوبھر محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی یک ٹک نظریں کسی غیر مرئی منظر میں ٹکی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس منظر میں اسے اپنی اور اپنے خاندان کی تباہی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔



پھر بعد کے حالات تیزی سے بدلے تھے...... ثورگان قبیلے والوں نے حتمی اور متفقہ طور پر بوڑھے ساحر باگوپ کو غافر کی جگہ جانشین بنانے کا فیصلہ دیا تھا جس پر مجلس مشاورت نے فوری عمل کیا تھا۔ باگوپ کے جانشین بننے کی دیر تھی کہ باگوپ کو ثورگانی قبیلے کا نیا سردار مقرر کرنے کا اختیار مل گیا۔ سردار جاذوب اور اس کے مٹھی بھر حامیوں کو بھلا یہ کب گوارا ہوتا۔ مگر یہ ہو چکا تھا کہ ضرغل کو ثورگان قبیلے کا نیا سردار مقرر کیا جا چکا تھا۔ جن لوگوں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی، انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا......

سردار جاذوب سے تو باگوپ پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھا تھا، اس نے تو اسے سب سے پہلے قید خانے میں ڈال دیا تھا بلکہ اس کے خاندان کو بھی پیوند زنداں کر ڈالا تھا جبکہ معزول اور قیدی سردار جاذوب کا مشیر خاص اور مقرب خاص غرقش معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے خاموش رہا تھا مگر اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ شکست قبول کر کے بیٹھ گیا تھا یا اسے جاذوب اور اس کے قیدی خاندان کی فکر نہ تھی۔ غرقش مصلحتاً خاموش تھا۔ وہ اندر ہی اندر پریشان بھی بہت تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ پریشان اس کا بیٹا زرغون تھا۔

"ہمیں جاذوب اور اس کے خاندان کی مدد کرنی چاہئے۔ اس کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔" زرغون نے باپ کی طویل خاموشی پر تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

غرقش اس کی طرف دیکھ کر پریشان کن لہجے میں بولا۔ "زرغون...... مجھے بھی اس بات کی بہت فکر ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ سردار جاذوب کے خلاف بڑی گہری اور گھناؤنی چال چلی گئی ہے۔ لیکن تم خود سوچو، ہم کیا کر سکتے ہیں ان کے لئے...... اگر ہم نے ذرا بھی ان کے حق میں کوئی بات کی تو ہم بھی مصیبت میں گرفتار ہو

جائیں گے۔"

باپ کی بات سن کر زرغون مزید تشویش آمیز تفکر میں مبتلا ہو گیا...... اسے سردار جاذوب کے زوال اور اس کے خاندان پر ٹوٹنے والی مصیبت کا بڑا دکھ تھا مگر اس سے کہیں زیادہ ضرقشاں کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ اس کی محبوبہ تھی...... جانے ان بیچاروں پر کیا بیت رہی ہو گی۔ وہ کڑے دل کے ساتھ سوچنے لگا...... وہ جانتا تھا کہ یہ ساری کارستانی اس بوڑھے ساحر باگوپ کی تھی...... وہ اپنے باپ غرقش سے برملا اظہار کرتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔

"یہ سب اس چالاک بوڑھے باگوپ کی کارستانی ہے۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ اس بدبخت نے ہمارے نجات دہندہ غافر کا قتل کیا ہے۔"

"آہستہ بول زرغون......! اگر کسی نے سن لیا تو ہم پر بھی ایک بڑی مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔" اس کا باپ غرقش بیٹے کو متنبہ کرتے ہوئے بولا۔

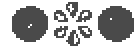
"لیکن ہمیں سردار جاذوب اور اس کے خاندان والوں سے ملنے تو دیا جائے...... پتہ تو چلے آخر ان بے چاروں پر کیا بیت رہی ہے۔"

"خبردار......! اس بات کا ذکر کبھی زبان پر مت لانا۔" غرقش نے بیٹے کو تنبیہ کی۔

"ہمیں کم از کم نئے ثورگانی سردار ضرغل سے ہی مل لینا چاہئے...... وہ شاید......!"

"ہرگز نہیں بیٹے......!" غرقش نفی میں سر ہلاتے ہوئے اور پھر قدرے سرگوشی میں بولا۔ "ضرغل بھی ان لوگوں کا درپردہ دشمن تھا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں...... سردار جاذوب کے حامیوں کو بھی اب قبیلے میں نہیں بخشا جا رہا...... اب صرف خداوند سے دعا ہی کرتے رہو اور اپنی زبان بند رکھو۔" زرغون باپ کی بات پر اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن اس نے اپنے دل میں پکا تہیہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ اپنی محبوبِ دلنواز سے مل کر ہی رہے گا مگر اس کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی کیونکہ اگلے ہی دن سابق ثورگانی سردار جاذوب کو اس کے خاندان سمیت پراسرار طور پر غائب کر دیا گیا۔ قبیلے میں کسی کو بھی اس بات کی جرأت نہ ہو سکی کہ وہ اس بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا۔ زرغون تو اس صورتحال کو دیکھ کر پاگل سا ہو گیا مگر باپ کی تنبیہ بھی آڑے آ رہی تھی کہ وہ اس بارے میں کسی سے کچھ استفسار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے بھی ہمت نہیں

ہاری تھی اور اس نے اپنے طور پر خفیہ طریقے سے معزول سردار جاذوب اور اس کے خاندان کا کھوج لگانے کا دل میں پکا تہیہ کر لیا تھا۔



باگوپ اب پورے ثورگانی قبیلے کا نجات دہندہ بن گیا تھا...... اس کے قریبی ہم خیال ساتھی جن میں ثورگانی قبیلے کا نیا سردار ضرغل اور اس کے قریبی مشیر ہاتر آختون اور جالوت اب تک یہی سمجھتے تھے کہ باگوپ کا اصل مقصد ثورگانی قبیلے پر روحانی حکومت کرنا اور معزول سردار جاذوب کو اس کے خاندان سمیت ملیامیٹ کرنا تھا جو اب پورا ہو چکا تھا۔ یہ چند لوگ اب بھی باگوپ کے اصل مقصد سے بے خبر تھے اور باگوپ کا دراصل اصل مقصد تھا پورے ثورگانی قبیلے کو خداوند کی طرف سے منحرف کر کے اپنے عظیم دیوتا لوبولیلا کی پیروکاری میں لانا جس کا وہ خود بھی پیروکار تھا جس کے بارے میں باگوپ کا خیال تھا کہ اس جزیرے پر رہتے ہوئے وہ اپنے اس عظیم مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا چنانچہ وہ ثورگانی قبیلے کو ہر ممکن طریقے سے یہاں سے جنوب کی سمت واقع سمندر میں گھرے ایک دوسرے جزیرے کی طرف کوچ کرنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا......

وہ جزیرہ درحقیقت ایک آتش فشانی جزیرہ تھا اور اس جزیرے کے عین وسط میں ایک بلند ترین آتش فشاں پہاڑ تھا جسے باگوپ نے اپنا دیوتا مان رکھا تھا، اس عظیم آتش فشانی پہاڑ کو باگوپ نے "لوبولیلا" نامی دیوتا کا نام دے رکھا تھا۔

اپنے اس گہرے مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک رات اپنے ہم خیال اور قبیلے کے نئے سردار ضرغل اور اس کے قریبی مشیروں ہاتر آختون اور جالوت کو بھی اپنے معبد خانے میں بلایا تھا۔

"ضرغل! ہمیں یہ حکمرانی عظیم لوبولیلا کی بدولت ملی ہے...... اب مجھ سمیت تم تینوں پر بھی یہ فرض بنتا ہے کہ عظیم دیوتا لوبولیلا کا حکم بجا لائیں۔"

"ہم تیار ہیں اے عظیم لوبولیلا کے عظیم پیروکار......! ہم ہر حکم کے منتظر ہیں۔" سردار ضرغل نے خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے باگوپ سے کہا۔

"تو سنو پھر......" باگوپ بولا۔ "میں چند دنوں بعد ایک پیشگوئی کرنے والا ہوں جس کے تحت پورے ثورگانی قبیلے کو یہ جزیرہ چھوڑ کر عظیم لوبولیلا کے جزیرے کی طرف

کوچ کرنا ہوگا جو ہم سب کی خیر خواہی کا منتظر ہے۔"

"ہم تیار ہیں۔ بس تمہارے خطاب کی دیر ہے۔ پھر میں سارے قبیلے کو اس جزیرے سے فوری کوچ کے لئے راضی کرلوں گا۔" سردار ضرغل نے مؤدبانہ کہا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے...... میں آج سے چوتھے دن پورے ثورگان قبیلے کو خطاب کروں گا اور انہیں یہ عندیہ دوں گا...... ضرغل! تم میرے خطاب کا کل ہی نقارا بجا دینا۔" ضرغل سردار نے سینے پر ہاتھ رکھ کر خاموشی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"اور ہاں...... تم نے میری پہلی ہدایات کا کیا، کیا......؟" باگوپ نے اچانک اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اس پر کب کا عمل ہو چکا ہے عظیم باگوپ......!" سردار ضرغل نے مؤدبانہ جواب دیا۔ پھر باگوپ کی گھورتی ہوئی صراحت طلب نظروں کی چبھن کو محسوس کر کے مزید تفصیلاً بولا۔ "تمہارے حکم کے مطابق اسی رات ایک بحری بجرے میں معزول سردار جاذوب اور اس کے خاندان کو کھلے سمندر کے حوالے کر دیا گیا تھا۔"

"بجرے (چھوٹی کشتی) میں کسی قسم کا کوئی زادِ راہ تو نہیں رکھا تھا؟" باگوپ نے سفاک لہجے میں ضرغل سے پوچھا۔

"نہیں عظیم باگوپ...... انہیں بھوکا پیاسا اور نہایت خاموشی سے روانہ کر دیا گیا تھا۔"

"معزول سردار جاذوب کی خاندان سمیت پراسرار گمشدگی پر قبیلے میں کوئی شور تو نہیں اٹھا؟"

"ہرگز نہیں...... مگر......" سردار ضرغل مختصراً اتنا بتاتے ہوئے اچانک کچھ سوچنے کے سے انداز میں رکا تو پھر جیسے اس کے قریب ہی بیٹھے باتر آختون نے سردار ضرغل کا ادھورا جملہ اُچک لیا اور باگوپ سے بولا۔

"مگر یہ کہ معزول سردار جاذوب کا ایک قریبی مشیر اور وفادار ساتھی غرقش اس سلسلے میں کچھ بے چین دکھائی دیتا ہے۔"

"اسے ختم کر دو یا پھر اس کی بے چینی کو۔" دوسرے ہی لمحے باگوپ اچانک سفاکی سے بولا تو باتر آختون کی طرح جالوت بھی پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے باگوپ سے

مؤدبانہ بولا۔

"نہ صرف...... غرقش کو ختم کرنا ہوگا بلکہ اس کے بیٹے زرغون کو بھی...... کیونکہ زرغون اور معزول سردار جاذوب کی جوان اور حسین بیٹی ضرقشان ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔"

"یہ تو واقعی خطرناک بات ہوگی۔" باگوپ یک دم تن کر بولا۔ "قبیلے کے کسی بھی شخص پر اگر ذرا بھی شبہ ہوا کہ وہ معزول سردار جاذوب کا حامی ہے تو اسے عبرتناک موت سے دوچار کر دوں گا۔ میں اپنے سوا کسی دوسرے کا نام زبان پر برداشت نہیں کروں گا۔ کل مجھے غرقش اور اس کے بیٹے زرغون کا سر چاہئے۔" باگوپ غیظ وغضب سے کانپنے لگا۔ اس کے قریب اس کا خاص چیلا شیمرون بھی بیٹھا تھا۔ جلدی سے باگوپ کے ہاتھ میں ایک صراحی نما برتن میں شراب بھر کر اسے تھماتے ہوئے ان تینوں یعنی سردار ضرغل، باتر آختون اور جالوت کو وہاں سے جانے کا اشارہ کرنے لگا۔ پھر وہ تینوں وہاں سے چلے گئے۔



زرغون کی بے چینی اور پریشانی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ اس کے باپ غرقش نے بیٹے کی بے چینی اور پریشانی سے مجبور ہو کر دبے دبے انداز میں معزول سردار جاذوب اور اس کے بدنصیب خاندان کی پراسرار گمشدگی کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو پایا تھا بلکہ اسے اس سفاک حقیقت کا علم بھی نہ ہو سکا تھا کہ اس کی اس "کوشش" اور کھوج کے نتیجے میں وہ عنقریب ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ مگر زرغون اپنے ارادے سے باز نہیں آیا تھا۔ اس نے معزول سردار جاذوب اور اس کے بدنصیب خاندان کی پراسرار گمشدگی کا کھوج لگانے کی ٹھانی تھی۔ نیز ان عوامل کا بھی پتہ چلانے کا تہیہ کیا جس کے تحت سردار جاذوب کو یہ کڑے دن دیکھنے پڑے تھے۔ اس نے اپنے اس خفیہ کام کا آغاز سب سے پہلے باگوپ اور ضرغل کی باتیں سننے سے کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک شام اچانک ہی وہ باگوپ کے معبد خانے میں چوری چھپے داخل ہوا۔ اس وقت معبد خانے میں باگوپ ایک مینڈھے کی کھال میں مختلف النوع کے زائچے کھینچنے میں مشغول تھا اور اس کا چیلا شیمرون بھی اس کے ساتھ موجود تھا۔ معبد

خانے میں چوروں کی طرح داخل ہونے پر زرغون کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا مگر اس کے عزمِ صمیم کے آگے یہ ڈر اور خوف بھی زیادہ دیر نہ ٹِک سکا اور وہ سنگی زینہ طے کرنے لگا۔ اوپر معبد خانے میں پہنچ کر اس نے باگوپ کو ایک سیاہ چغہ پہنے کسی کام میں مصروف دیکھا۔ ایسے میں اچانک اس کی نظر باگوپ کے مقرب خاص چیلے شیمرون پر پڑی مگر زرغون چونکا اس وقت جب اس نے شیمرون کو اچانک ہی ایک بدہیئت اور غیر معمولی طور پر بڑی چمگادڑ میں تبدیل ہوتے دیکھا جو دریچے کے کھلے کواڑ سے باہر پرواز کر گئی۔ زرغون نے شیمرون کو اچانک ایک غیر معمولی طور پر بڑی چمگادڑ کے روپ میں بدلتے ہوئے دیکھا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ وہ اس چمگادڑ سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ یہ وہی چمگادڑ تو تھی جسے اس نے کئی روز پہلے بوڑھے غافر کے غار میں اس وقت دیکھا تھا جب بوڑھا غافر داخل ہوا تھا۔ لہٰذا پتہ نہیں کیوں اس دن سے زرغون کو بے چینی لگ گئی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ بوڑھے غافر کے پراسرار قتل کا تعلق اس منحوس چمگادڑ سے ضرور ہے۔

زرغون کئی لمحے سکتے کی کیفیت میں کھڑا رہا۔

جب وہ سکتے کی کیفیت سے نکلا تو پُر غیظ جوش میں مبتلا ہو گیا۔ بوڑھے غافر کا سفاکانہ قتل اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ وہ دلدوز منظر نہیں بھولا تھا، اس کے ساتھ ہی اسے پھڑپھڑاتی ہوئی چمگادڑ بھی اچھی طرح یاد تھی جو بوڑھے غافر کے قتل کے وقت غار میں چکر کاٹ رہی تھی۔ یہ چمگادڑ اسے اس لئے یاد رہ گئی تھی کہ اس کی جسامت غیر معمولی طور پر بڑی تھی۔ زرغون کے لئے اس سے بھی بڑھ کر چونکنے کی وجہ شیمرون کا ایک انسانی وجود سے چمگادڑ میں ڈھلنا تھا...... شیمرون، باگوپ کا ایک خاص آدمی تھا۔ اب زرغون کا یہ شک یقین میں بدلنے لگا تھا کہ بوڑھے غافر کے قتل کے پیچھے ان دونوں یعنی باگوپ اور شیمرون کا ہی ہاتھ تھا۔

زرغون وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے سردست خاموش رہا اور پھر جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی کے ساتھ غار سے نکل گیا۔ اس نے اس کا ذکر اپنے باپ غرقش سے بھی کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ اب اپنے طور پر باگوپ کے چیلوں کی بیخ کنی کرنے پر کمربستہ ہو گیا تھا لیکن ابھی اس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ضرقشاں کی بازیابی یا

اس کا کھوج لگانا تھا جس کے لئے اس نے اب تک جزیرے کا کونہ کونہ چھان مارا تھا حتیٰ کہ اسے جن خفیہ تہہ خانوں کا علم تھا، وہ بھی اس نے سب کے سب کھنگال ڈالے تھے۔ اب اسے اس بات کا پختہ یقین ہو چلا تھا کہ ضرقشاں اور اس کے ماں باپ کو اس جزیرے سے ہی نکال دیا گیا ہے اور کسی کو اس سلسلے میں کانوں کان خبر نہیں ہونے دی گئی۔

زرغون نے باگوپ سمیت اس کے قریبی چیلوں سردار ضرغل، ہاتر آختون اور جالوت کی ٹوہ لینا شروع کر دی تھی۔ بالآخر اسے ان افراد کی سن گن لینے سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ معزول سردار اور اس کے خاندان والوں کو خفیہ طریقے سے رات کو زبردستی جزیرے سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ تکلیف دہ اور جانکاہ حقیقت جان لینے کے بعد زرغون کی حالت غیر ہونے لگی۔ اسے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ ان کو بھوکا، پیاسا سمندر کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اب جانے اس بیچاروں کا کیا حال ہوا ہوگا، ایک چھوٹا سا بجرا بھلا کب تک بیکراں سمندر اور طوفانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ باگوپ اور اس کے حواریوں نے ان پر ظلم کی انتہا کر دی تھی، یہ لحظہ بہ لحظہ ان لوگوں کو اذیت ناک موت کی طرف دھکیلنے کے برابر تھا۔

زرغون کو کسی طور چین نہیں آ رہا تھا، وہ دیوانوں کی طرح دور ساحل کی طرف نکل جاتا اور حدِ نگاہ تک پھیلے نیلگوں گہرے سمندر کو گھورتا رہتا۔ ایسے میں شوریدہ سر موجوں کو دیکھ کر اس میں آشفتہ سری پیدا ہونے لگتی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سمندر میں کود پڑے اور اپنی محبوبہ دلنواز کو ڈھونڈ نکالے۔ وہ کتنی ہی دیر بھیگی ریت پر کھڑا بے چین نظروں سے ہیبت ناک سمندر کو گھورتا رہا، حتیٰ کہ شام نے سمندر پر تاریکی کے ڈیرے ڈال دیئے۔

وہ واپس پلٹا، سامنے ناریل اور بڑے بڑے پتوں والے درختوں کے گھنے جنگل میں بھی تاریکی اتر آئی تھی۔ زرغون غائب دماغی کے عالم میں جا رہا تھا، اچانک اسے سامنے تاریکی میں ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا مگر وہ رُکے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ اچانک وہ سایہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا زرغون سے لپٹ گیا...... زرغون اس اچانک اور عجیب افتاد پر بری طرح چونک گیا، کوئی نسوانی آواز میں سسک پڑا تھا...... زرغون کو یہ سسکی شناسا سی محسوس

ہوئی۔ وہ یکدم وحشت ناک انداز میں اس نسوانی لرزاں وجود کو خود سے الگ کر کے بغور اس کا چہرہ تکنے لگا۔ پھر تو جیسے ایک لمحے کو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی محبوبہ دلربا کا ملیح چہرہ تھا جو اس وقت کملایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''ضرقشاں، زرغون کے غم انگیز اور ٹوٹے ہوئے لہجے پر بے اختیار رو پڑی اور پھر مجبور ہو کر بولی۔ ''زرغون......! یہ تُو نے اپنی کیا حالت بنالی ہے؟''

''تُو کیسی ہے ضرقشاں! تیرے گھر والے، سردار جاذوب......؟'' زرغون نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''یہ بہت لمبی کہانی ہے زرغون...... پہلے آؤ آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ زرغون! مجھے اگر کسی نے دیکھ لیا تو......'' ضرقشاں کے لہجے سے اچانک خوف مترشح ہو گیا۔

''تُو فکر نہ کر ضرقشاں...... میں ہوں ناں، نمٹ لوں گا سب سے۔'' زرغون یکدم جوش میں آ کر بولا۔

''نہیں زرغون......! حالات ٹھیک نہیں ہیں، میں خود اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک پہنچی ہوں، پتہ نہیں میرے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کا کیا بنا ہوگا، وہ بے چارے زندہ بھی ہوں گے کہ......؟'' ضرقشاں اتنا کہہ کر رو پڑی۔ زرغون اس کے ساتھ وہیں ریت پر بیٹھ گیا۔ سمندر سے آنے والی ست خرام ہواؤں کے جھونکوں سے ضرقشاں کے ریشمی بال اٹکھیلیاں کر رہے تھے مگر اس کا حسین و دلکش چہرہ کسی اُداس چاند کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

''ضرقشاں...... کچھ تو بتاؤ، تم لوگوں کے ساتھ آخر ہوا کیا تھا؟'' زرغون نے پُرزور لہجے میں پوچھا تو ضرقشاں نے اپنے آنسو پونچھے اور پھر بتانے لگی۔

''ہمیں سردار ضرغل نے باگوپ کے حکم پر پہلے ایک قید خانے میں ڈال دیا تھا پھر کچھ دنوں بعد ہمیں رات کی خاموشی میں ایک ڈونگے میں سوار کر کے زبردستی سمندر کے حوالے کر دیا۔ ہمیں زادِ راہ بھی نہ دیا گیا تھا۔ چھوٹی سی کشتی میں اتنے سارے افراد تھے کہ ہمیں بیٹھنے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ وزن کی وجہ سے معمولی لہروں پر بھی کشتی بری طرح ڈول رہی تھی۔ اور پھر جیسے جیسے کشتی گہرے پانیوں کی طرف بڑھنے لگی، کشتی نے

بری طرح ڈولنا شروع کر دیا۔ اسی طرح بھوکے پیاسے، خوف و دہشت کے درمیان سفر کرتے ہوئے ہمیں دو دن بیت گئے۔ ہم سب بالکل جاں بہ لب ہو گئے تھے۔ پھر ایک صبح جب ہم بھوک پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے تو اچانک ہمیں ایک ٹاپو کے آثار نظر آئے۔ ہم سب خوش ہو گئے۔ لیکن اگلے ہی لمحے خوف کے مارے ہماری چیخیں نکل گئیں...... وہ کوئی ٹاپو نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑی دیوہیکل مچھلی تھی۔ اس نے ہمیں کشتی سمیت نگل لیا...... دوبارہ ہوش آیا تو ہم سب کسی ساحل پر بے سدھ پڑے تھے، کشتی بھی ایک طرف ٹوٹی پھوٹی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس مچھلی نے ہمیں ہڑپ کرنے کی بجائے اُگل دیا تھا۔ یہ جزیرہ چٹانی تھا، وہاں رہ رہ کر کان پھاڑ دھماکے ہو رہے تھے۔ اندر جانے کا تصور بھی ہمارے لئے محال ہو رہا تھا۔ مگر ہمارے لئے یہی غنیمت تھا کہ اب ہم بیکراں اور بے رحم سمندر کے رحم و کرم پر نہیں تھے۔ ہم نے وہیں ساحل پر ڈیرے جما لئے مگر ہم جزیروں میں لاوا اُگلتے پھٹتے آتش فشاں پہاڑوں سے بھی خوفزدہ تھے اور اسی خوف سے ساحل تک ہی محدود رہنے پر مجبور تھے۔ لیکن کب تک...... پیٹ کی آگ اور حلق کی پیاس تو بجھانی تھی، ورنہ ہم سب وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ڈونگا کشتی کی مرمت کرنا شروع کر دی اور کسی نہ کسی طریقے سے اسے قابلِ استعمال بنا ڈالا، میرا منصوبہ تھا کہ کسی قریبی جزیرے کو تلاش کروں کیونکہ کشتی میں اب زیادہ بوجھ سہارنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ لہٰذا میں خود اکیلی ہی نکل کھڑی ہوئی۔ مگر بدقسمتی سے مجھے راہ میں طوفان نے آ لیا اور میں جانے کس طرح اس جزیرے کے ساحل سے آن لگی۔ شاید میری خوش قسمتی یا بدقسمتی......!'' ضرقشاں اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو زرغون بے اختیار ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ ہم دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ تُو اس جزیرے پر دوبارہ آ گئی، جدھر سے تجھے نکالا گیا تھا مگر اب تُو دُکھ نہ کر، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے باپ سردار جاذب کے خلاف سازش اور غافر کو قتل کرنے کے ذمہ دار باگوپ اور ضرغل ہیں۔''

''مگر زرغون......! اب کیا ہو سکتا ہے، ہم تو دربدر ہو ہی گئے، بھلا ہم اب کیا ان لوگوں کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں؟'' ضرقشاں نے مایوس کن لہجے میں کہا تو زرغون اسے تسلی دیتے ہوئے پُرجوش لہجے میں بولا۔

''ضرقشاں...... یہ تُو کیسی باتیں کر رہی ہے۔ تُو تو بڑی بہادر تھی۔ پھر یہ مایوسی کی باتیں؟''

''ہاں...... زرغون! یہ حقیقت ہے کہ مجھ سے اپنے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی۔ میرا باپ کیا سے کیا بنا دیا گیا، وہ اسی غم میں نڈھال رہتا ہے کہ ایک سردار سے وہ خاک نشیں ہو گیا۔''

''نہیں ضرقشاں! حوصلہ مت ہار، ہم دونوں کے ہوتے ہوئے ان کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ چل اب یہ آنسو پونچھ تاکہ آگے کی سوچ سکیں۔''

زرغون کی باتوں نے ضرقشاں کو قدرے حوصلہ بخشا۔ ویسے بھی وہ زرغون کی موجودگی میں خود کو طاقتور محسوس کرنے لگی تھی۔ پھر دونوں کافی دیر تک وہیں بیٹھے آئندہ کے بارے میں سوچتے رہے۔ بالآخر طے یہ پایا کہ سب سے پہلے اس جزیرے سے ایک ڈونگا کشتی کے ذریعے بہت سا کھانے پینے کا سامان لاد کر اس چٹانی جزیرے کی طرف نکلا جائے تاکہ سردار جاذوب اور اس کے خاندان کے افراد اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکیں، اس کے بعد پھر باگوپ اور ضرغل کے خلاف کوئی منصوبہ بندی کی جائے۔ لہٰذا یہ طے پاتے ہی سب سے پہلے راتوں رات ایک ڈونگا کشتی کا بندوبست کیا جو زرغون کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس نے ضرقشاں کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ آبادی کی طرف ہرگز نہ نکلے اور اپنے گرد و پیش سے بھی محتاط رہے تاکہ کسی کی نظر اس پر نہ پڑ سکے کیونکہ ضرقشاں کو اگر قبیلے کے کسی بھی فرد نے دیکھ لیا تو ضرقشاں کے لئے یہ بڑی خطرناک صورتحال ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اگر ایک بار کسی کو جزیرے سے نکال دیا جاتا اور پھر جب وہ جزیرہ بدر شخص دوبارہ جزیرے میں دیکھ لیا جاتا تو یہ ٹورگانی قبیلے میں بہت بڑا جرم گردانا جاتا تھا جس کی بہت عبرت ناک سزا دی جاتی تھی۔

زرغون سارا کام رات کی تنہائی میں ہی نمٹا دینا چاہتا تھا۔ اس نے ضرقشاں کے بدنصیب خاندان کے لئے بہت سے کیلے، ناریل اور دیگر پھل وغیرہ توڑے تھے۔ دن میں اپنے ہاتھوں سے شکار کیا ہوا ایک مینڈھے کا گوشت اور دیگر چھوٹی موٹی ضروریاتِ زندگی کا سامان جلدی جلدی کشتی میں ڈالا۔ ضرقشاں بھی اس کے ساتھ تھی۔ پھر وہ دونوں ڈونگا کشتی میں سوار ہو کر جزیرے سے دور ہونے لگے۔

ضرقشاں اور زرغون کا سمندر کا آس پاس کا علاقہ خاصی دور تک دیکھا بھالا تھا، وہ کئی بار ویران جزیروں کی سیر پر جاتے رہے تھے بلکہ بعض مرتبہ تو کئی کئی دن یہ دونوں اسی طرح کی ایک چھوٹی ڈونگا کشتی میں دوسرے چھوٹے بڑے جزیروں کی سیر کرتے رہتے تھے۔ بہرحال انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ ان کا مطلوبہ آتش فشانی جزیرہ کس سمت میں ہے۔

تقریباً ایک دن اور دو راتوں کے سفر کے بعد ان کی کشتی آتش فشانی جزیرے کے ساحل سے جا لگی۔ وہاں پہنچ کر ان دونوں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا، سردار جاذوب اور اس کی بیوی اور ضرقشاں کے دو چھوٹے بہن بھائی ذرا فاصلے پر بے سدھ ریت پر پڑے ہوئے تھے۔

ضرقشاں چیختی ہوئی ان کی طرف دوڑی۔ وہ پاگلوں کی طرح کبھی اپنے ماں باپ تو کبھی اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو جھنجھوڑنے لگتی۔

زرغون نے البتہ اپنے حواس پر قابو رکھتے اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے باری باری سب کا جائزہ لیا تو اس نے نڈھال پڑی ضرقشاں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ضرقشاں...... حوصلہ کرو، کچھ نہیں ہوا، یہ سب زندہ ہیں۔ صرف بھوک پیاس کی وجہ سے بے ہوش ہیں۔''

یہ سن کر ضرقشاں کی جان میں جان آئی اور پھر دونوں نے ناریل توڑے اور باری باری بے ہوش پڑے سب کے حلق میں پانی ٹپکایا تو انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور ذرا ہی دیر کی کوشش کے بعد ان سب لوگوں کے مُردہ وجود میں جیسے جان پڑ گئی۔

ضرقشاں اپنے خاندان کے لوگوں کو ہوش میں آتا دیکھ کر جی اٹھی۔ پھر سب لوگ ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر شکم سیری میں مصروف ہو گئے۔ یہ لوگ کھا پی کر جب توانا ہو گئے تو سردار جاذوب نے بے اختیار زرغون کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اپنے قبیلے کے لوگوں کی خیر و عافیت پوچھی تو زرغون نے تلخ لہجے میں کہا۔

''سردار! اب ان بے حس قبیلے والوں کی کیوں فکر کرتے ہو، انہوں نے کیا دیا تمہیں؟''

''نہیں زرغون......! وہ نادان ہیں، ان کا کوئی قصور نہیں، انہیں بہکایا گیا ہے۔''

سردار جاذوب نے وسیع القلبی کے ساتھ کہا۔ ''خداوند عظیم میرے قبیلے کے معصوم لوگوں پر رحم کرے اور انہیں ناگہانی آفتوں سے محفوظ رکھے۔

سردار جاذوب کے دل میں ابھی تک اپنے قبیلے والوں کا درد موجود تھا اور اپنے زوال اور دربدری کے باوجود وہ ان کا خیر خواہ تھا۔ زرغون خاموش رہا۔ پھر وہ سب سر جوڑے باگوپ اور سردار ضرغل کی بیخ کنی کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔ تاہم زرغون نے سردار جاذوب سے اس بات کا بھی تفصیلاً ذکر کیا کہ وہ نہ صرف بوڑھے غافر کے قاتل کا پتہ چلا چکا ہے بلکہ باگوپ اور سردار ضرغل کے آپس کے گٹھ جوڑ کا بھی سراغ لگا چکا ہے۔

سردار جاذوب نے زرغون کی کارگزاری پر اس کے شانے پر تھپکی دی اور متفکر لہجے میں بولا۔ ''زرغون...... بے شک تم نے غافر کے قاتل کا پتہ چلا لیا ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ تمہاری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا کیونکہ تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اس طرح دشمنوں کا تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا البتہ دشمن تمہیں ضرور نقصان پہنچا دے گا۔''

''مگر معزز سردار...... جو بات سچ ہے اسے ہمیں قبیلے والوں پر ظاہر تو کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔'' زرغون نے کہا۔

''ہاں......! لیکن بہت محتاط ہو کر۔ کیونکہ دشمن خطرناک حد تک مکار اور چالاک ہے۔'' سردار جاذوب نے کہا۔ اس کی بیٹی ضرقشاں بھی اپنے باپ کے خیال سے متفق تھی۔ اسے بھی زرغون کی اس سازش کو بے نقاب کرنے کے عزم پر تشویش تھی کہ کہیں دشمن اس کے محبوب کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔

پھر جب دو روز بعد زرغون وہاں سے جانے لگا تو ضرقشاں نے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔

''زرغون......! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی، میں یہ خطرناک کام تمہیں اکیلے نہیں کرنے دوں گی۔''

''مگر ضرقشاں......! یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ تم میرے ساتھ رہو؟'' زرغون نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم یہ بات کیوں بھول رہی ہو کہ تمہیں اس جزیرے سے نکال دیا گیا ہے۔ وہاں اگر کسی کی نظر تم پر پڑ گئی تو تمہارے ساتھ ہو سکتا ہے میں بھی مصیبت میں پڑ جاؤں اور میرا منصوبہ بھی ناکام ہو جائے۔''

اس کی بات سن کر ضرقشاں نے سوگواری سے اپنا چہرہ جھکا دیا۔

''ضرقشاں...... تم ادھر آرام سے بیٹھ کر میری کامیابی کے لئے خداوند سے دعائیں مانگتی رہو۔ ویسے بھی میں ادھر آتا جاتا رہوں گا۔ ہم کوئی دور تو نہیں ہیں۔'' اس کے بعد زرغون اپنی ڈونگا کشتی میں واپس آ گیا۔

ضرقشاں سے ملنے اور اس کے خاندان والوں کو صحیح سلامت دیکھنے کے بعد زرغون کے وجود میں ایک نئی توانائی دوڑ گئی تھی ورنہ تو جب تک اس نے ضرقشاں کو نہیں دیکھا تھا، اس کے غم میں بالکل ادھ موا ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ اپنے اندر اپنے دشمنوں کے خلاف کمربستہ ہونے کا ایک نیا جوش اور نیا ولولہ محسوس کرنے لگا تھا، وہ اب ضرقشاں اور اس کے خاندان کو اچھا خاصا کھانے، پینے کا سامان مہیا کر آیا تھا۔

اپنے جزیرے پر پہنچ کر اس نے سوچا کہ کیا یہ خوشخبری اپنے باپ غرقش کو سنائے یا ابھی صرف اپنے تک ہی محدود رکھے۔

کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ حقیقت جتنی پردے میں رہے، اتنا ہی ضرقشاں اور اس کے باپ جاذب وغیرہ کے مفاد میں بہتر ہو گا۔ ویسے زرغون کو اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ اگر اس بات کی ذرا بھی بھنک دشمن کے کانوں تک پہنچی تو ضرقشاں وغیرہ کی جانوں کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا کیونکہ کسی بھی بڑے جرم کی پاداش میں اگر کسی کو جزیرے سے نکل جانے کا حکم دیا جاتا تو محض وہ حکم یہاں تک ہی محدود نہ رہتا بلکہ اگر اس مجرم شخص (جزیرہ بدر) کو دوبارہ دیکھ لیا جاتا تو پھر اس کی سزا موت تھی۔

زرغون چند روز تک گہری فکر و سوچ میں مبتلا رہا تھا اور دشمنوں کا شیرازہ بکھیرنے کے بارے میں غور و فکر کرتا رہا۔ اس دوران ایک بار پھر بڑی رازداری کے ساتھ اپنی چھوٹی سی ڈونگا کشتی میں ضرقشاں اور سردار جاذوب کے لئے پھل اور گوشت وغیرہ پہنچا آیا تھا۔ دن رات سوچ و بچار کے بعد زرغون کے ذہن پر مایوسی اور متوقع ناکامی کے

بادل منڈلانے لگے۔ وہ جس کام کو آسان سمجھے ہوئے تھا،اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ مشکل بھی ہے اور ناممکن بھی..... اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس جزیرے میں اکیلا تھا اور کوئی اس کی بات پر کان دھرنے یا اعتبار کرنے والا نہیں تھا۔ دشمن پورے ثورگانی قبیلے پر حکومت کر رہا تھا بلکہ ان کے دلوں اور دماغوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ باگوپ یا سردار ضرغل کے خلاف ذرا بھی کوئی بولتا تو اسے نہ صرف پیوندِ زنداں ہونا پڑتا تھا بلکہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ اس کے چند ایک اندوہناک مظاہرے خود زرغون نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ بے شک ثورگانی قبیلے پر دشمنوں کی حکومت اور بالادستی قائم تھی، ان میں معزول سردار جاذوب کے حامی بھی تھے، بے شک مٹھی بھر سہی، اگر ان چند بدنصیبوں کی زبان سے ذرا بھی معزول اور جزیرہ بدر سردار جاذوب کے بارے میں ان کی حمایت میں کوئی جملہ نکل جاتا یا محض تذکرہ ہی زبان پر آجاتا تو وہ فوراً سردار ضرغل کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ بعد میں ساحل پر اس بدنصیب کی پھولی ہوئی لاش ملتی تھی۔ یہی وہ خطرناک حد تک جان لیوا عوامل تھے جن کے پیشِ نظر زرغون کے دل میں یہ مایوسی گھر کرنے لگی تھی کہ آخر وہ کس طرح اپنے طاقتور اور مکار دشمن پر جال ڈال کر زیرِ دام لائے۔



''شیمر ون! تو نے ایک اور کام کرنا ہے۔'' بوڑھے ساحر باگوپ نے اپنے سامنے دست بستہ کھڑے چیلے سے کہا تو وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ انداز میں خفیف سا جھکا اور خاموشی پر اکتفا کیا تو باگوپ اس کی مؤدبانہ اثباتی خاموشی پر شیمر ون سے بولا۔

''تُو نے اب غرقش کا قتل کرنا ہے..... جانتا ہے ناں غرقش کون ہے؟''

''ہاں عظیم پیروکار! یہ وہی ہے ناں، سردار جاذوب کا مشیرِ خاص اور زرغون کا باپ!'' شیمر ون نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''ہاں، وہی غرقش.....!'' باگوپ پراسرار لہجے میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کی زندگی ہماری موت ہے کیونکہ یہ شخص معزول سردار جاذوب کا دوسرا روپ ہے۔'' قدرے توقف کے بعد وہ اپنی بھنویں سکیڑ کر بولا۔ ''شیمر ون.....! تبو نے ابھی ابھی غرقش کے بیٹے زرغون کا نام لیا تھا، اس پر بھی تجھے کڑی نگرانی رکھنی ہے بلکہ ان

دونوں باپ بیٹوں کا ایک ساتھ ہی پتہ صاف کر دے۔'' اس کے لہجے میں یکایک سفاکی عود کر آئی اور شیمر ون ہولے ہولے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ وہی زرغون ہے جسے اس نے بوڑھے غافر کو قتل کرتے دیکھا تھا۔



روشن چاند..... جزیرے کے اوپر چمک رہا تھا..... پورے جزیرے پر پراسرار سناٹا طاری تھا۔ رات بھی کافی گزر چکی تھی۔ زرغون کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ مگر مسلسل بے چینی سے کروٹیں بدل بدل کر بالآخر اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ اپنے سمور کے بستر پر دراز تھا۔ اس کی مخروطی چھت والی جھونپڑی کے اوپر ایک سیاہ اور بدہیئت چمگادڑ کافی دیر سے چکرا رہی تھی۔

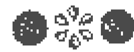
یہ شیمر ون تھا..... جو کبھی انسانی شکل میں آ کر جھونپڑی کے اندر گھسنے کی کوشش کرتا، جب دیکھتا کہ زرغون ابھی جاگ رہا ہے تو وہ پھر انسان سے چمگادڑ بن کر پرواز کر جاتا یا پھر کسی شاخ سے الٹا لٹک جاتا۔ بوڑھے ساحر باگوپ کے حکم کے مطابق وہ ان دونوں باپ بیٹے کو قتل کرنے آیا تھا۔ اس بار جب اس نے دیکھا کہ اب زرغون بھی گہری نیند سو گیا ہے تو وہ سب سے پہلے جھونپڑی کے عقبی گوشے کی چھت کے ایک روزن سے اندر داخل ہوا اور چھت کے کونے میں جھول کر وہ ایک نظر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ جھونپڑی کے اس گوشے میں سمور کے ایک بستر پر غرقش محوِ خواب تھا، قریب ہی اس کی بیوی بھی سو رہی تھی۔ جبکہ زرغون دوسرے گوشے میں سو رہا تھا۔

چمگادڑ کے روپ میں خاصی دیر تک شیمرن جھونپڑی کی چھت سے جھولتا رہا، پھر اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد وہ نیچے اترا اور انسانی روپ میں آ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک چوڑے پھل والا بغدا نظر آ رہا تھا جو مدھم روشنی میں سفاکانہ چمک دیتا محسوس ہو رہا تھا۔ ماحول میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، شیمر ون آہستہ آہستہ موت کے فرشتے کی مانند گہری نیند میں مستغرق غرقش کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شیمر ون کی آنکھوں اور بغدے کے چوڑے پھل کی چمک بڑی سفاک تھی۔ پھر وہ اس کے عین سر پر پہنچ گیا۔ غرقش اپنے سمور کے بستر پر سیدھا سر رکھے کمر کے بل دراز تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے

پر تھے، شیمرون کا بغدے والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور دوسرا ہاتھ شیمرون نے غرقش کے منہ پر رکھ کر پوری قوت سے بغدے سے غرقش کی گردن پر وار کیا..... خون کا ایک فوارہ اُبلا اور غرقش کا سرتن سے جدا ہو گیا...... غرقش کے کٹے ہوئے سر کی آنکھیں وا ہو گئی تھیں۔ چند لمحے غرقش کی سربریدہ لاش تڑپتی رہی پھر ٹھنڈی پڑ گئی۔ کام نمٹا کر شیمرون پلٹا تو اچانک غرقش کی عمر رسیدہ بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی متوحش نظروں سے پہلے اپنے شوہر کی سربریدہ لاش کی طرف دیکھا پھر اس کی نظر شیمرون پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود بغدا دیکھ کر اس نے بڑی دلخراش چیخ مارنے کی کوشش کی لیکن شیمرون نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ غش کھا کر بے ہوش ہو گئی۔ شیمرون اسے چھوڑ کر دوسرے گوشے کی طرف لپکا جدھر زرغون سویا ہوا تھا مگر وہ جیسے ہی وہاں پہنچا، بری طرح ٹھٹک کر رک گیا۔

زرغون جاگ چکا تھا اور وہ شاید کسی ''کھڑبڑ'' کو محسوس کر کے جاگا تھا۔ اب جو اس نے ایک شخص کو خون آلود بغدے کے ساتھ دیکھا تو ایک لمحے کو سناٹے میں آ گیا..... مگر شیمرون نے فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی اور خون آلود بغدے والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے زرغون کی طرف لپکا..... مگر زرغون اب کہاں اسے چھوڑتا۔ وہ پہلے ہی شیمرون کے ہاتھ میں پکڑے خون آلود بغدے کو دیکھ کر ایک لرزہ خیز خیال سے کانپ اٹھا تھا اور اب شیمرون کو کسی بھی صورت چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ لہٰذا جیسے ہی اس نے خون آشام شیمرون کو بغدا تولے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس نے لپک کر اپنی قرولی نکال لی۔ شیمرون جیسے ہی اس کے سر پر پہنچا، زرغون نے ایک زوردار لات اس کے پیٹ پر رسید کر دی۔ شیمرون لڑکھڑا کر پرے جا گرا۔ زرغون نے اس اثناء میں اپنی قرولی سنبھال لی اور شیمرون کی طرف بڑھا۔ ادھر شیمرون ذرا سنبھل کر پھر زرغون پر حملہ آور ہوا۔ زرغون نے اس کے بغدے والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی اور اسے جھٹکا دیا۔ پھر اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی قرولی شیمرون کے دائیں پہلو میں گھونپ دی۔ شیمرون کے حلق سے ابلنے والی چیخ بڑی کربناک تھی۔ مدھم روشنی کی وجہ سے زرغون ابھی تک اس بات سے لاعلم تھا کہ حملہ آور کون تھا..... تاہم اب اسے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ جو کوئی بھی تھا، شناسا ہی لگ رہا تھا۔

ادھر زرغون نے جب شیمرون کے پہلو سے قرولی کھینچی تو خون کا ایک فوارہ سا اُبل پڑا۔ بغدا شیمرون کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر چکا تھا مگر وہ پھر بھی سخت جان تھا..... اس نے اپنے مہلک زخم کی پروا نہ کی اور غراتے ہوئے زرغون کے چہرے پر گھونسہ رسید کر دیا اور اس نے اس پر بس نہ کیا بلکہ زرغون کے پیٹ پر ایک اور گھونسہ جڑ دیا اور پھر باہر کی طرف لپکا۔ زرغون بھی اس کے تعاقب میں بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں جھونپڑی سے باہر تھے۔ زرغون اچانک کیا دیکھتا ہے کہ زخمی حملہ آور اب زمین پر گر چکا تھا..... مگر پھر اگلے ہی لمحے زرغون نے اسے وہاں سے غائب ہوتے دیکھا۔ تاہم ذرا قریب سے بغور دیکھنے پر زرغون نے ایک چونکا دینے والا منظر دیکھا، شیمرون اب چمگادڑ کی جون اختیار کر چکا تھا اور پھر جب تک زرغون چونکنے کے عمل سے نکلتا، اس نے اس چمگادڑ کو پھڑپھڑاتے ہوئے زمین سے اچانک فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ زرد اور سوگوار چاند کے روشن ہالے میں پرواز کرتی چمگادڑ کے پہلو سے خون کے قطرے ٹپکتے صاف نظر آ رہے تھے۔ زرغون یہ منظر دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ اب جان چکا تھا کہ یہ حملہ آور درحقیقت شیمرون ہی تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے زرغون کو ایک بھیانک خیال آیا اور وہ جلدی سے دیوانہ وار اپنی جھونپڑی کی طرف دوڑا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ اپنے ماں باپ والے گوشے کی طرف لپکا تو سامنے اپنے باپ غرقش کی سربریدہ نعش دیکھ کر اس کی روح لرز اٹھی۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور باپ کی نعش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔



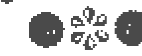
زخمی چمگادڑ (شیمرون) معبد خانے کے ایک روزن سے سیدھی ساحر باگوپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے دم ہو کر اس کے قدموں کے قریب سنگی فرش پر گر گئی اور جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگی۔ باگوپ چونک پڑا۔ چمگادڑ تڑپ رہی تھی اور خون میں لت پت تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے شیمرون اپنی انسانی جون میں آ گیا، اسے شدید زخمی حالت میں دیکھ کر باگوپ کی آنکھوں میں پہلے تشویش اور پھر غصے کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

''کس نے تیری یہ حالت بنائی ہے..... بتا مجھے.....'' باگوپ نے چیخ کر پوچھا۔

''مم...... میں نے غر...... غرقش کو قتل کر ڈالا تھا...... ز...... زرغون نے مجھے مارا۔''

زخم سے چور زرغون کے مرتعش ہونٹوں سے بے ربط اور ٹوٹے ہوئے الفاظ سن کر باگوپ کے سیاہ رو ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ عود کر آئی۔ اسے خوشی ہوئی کہ شیمرون نے اپنا اصل کام نمٹا دیا تھا۔

''تیری اب ضرورت بھی نہیں رہی تھی شیمرون! اچھا ہی ہوا تُو آ گیا۔ ورنہ تیری وجہ سے میں بھی مصیبت میں مبتلا ہو سکتا تھا۔'' باگوپ نے مکاری سے خود کلامی کے انداز میں زیرلب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔



زرغون اپنے باپ غرقش کی سربریدہ نعش دیکھ کر غم سے پاگل ہو گیا۔ بوڑھے غافر کے قاتل شیمرون نے بالآخر آج اس کے باپ کو بھی بے دردی سے قتل کر ڈالا تھا۔ زرغون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کے اندر نفرت و انتقام کی چنگاریاں سلگ اٹھیں اور باگوپ کا مکروہ چہرہ اس کی آنسوؤں بھری آنکھوں کے سامنے رقصاں ہو گیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کے باپ کا قتل بھی اسی بوڑھے ساحر باگوپ کے ایماء پر کیا گیا تھا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اپنے بستر کے قریب آیا، بومرنگ، بھالا اور قرولی سنبھال کر جنونی انداز میں اپنی جھونپڑی سے نکل کر سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس کا رخ باگوپ کے معبد خانے کی طرف تھا۔ وہ چٹکی ہوئی چاندنی میں دیوانہ وار دوڑا چلا جا رہا تھا۔

بالآخر غصے میں سرخ ہو کر ہانپتا کانپتا معبد خانے کے قریب پہنچا۔ آس پاس ویرانی کا راج تھا۔ زرغون معبد خانے کے اندر داخل ہوا اور سنگی زینے طے کرتا ہوا اوپر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے باگوپ کے قدموں میں شیمرون کی خون میں لت پت لاش پڑی ہے اور باگوپ اسے ٹھکانے لگانے کی فکر میں ہے۔

''باگوپ......!'' زرغون طیش کے عالم میں دھاڑا۔ باگوپ نے ٹھٹک کر زرغون کی طرف دیکھا۔ زرغون اسے شعلہ فشاں نظروں سے گھور رہا تھا۔ ''باگوپ......! تُو نے پہلے غافر کو قتل کروایا اور اب میرے باپ کو بھی مروا ڈالا۔'' زرغون نے غیظ بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ غلط ہے...... یہ تو خود بیچارا زخمی تھا اور اب تو یہ بھی مر گیا...... پتہ نہیں اس بیچارے کو کس نے قتل کر ڈالا کہ یہ مر گیا۔'' باگوپ، زرغون کے چہرے کی طرف دیکھ کر مکاری سے بولا۔

''اسے میں نے قتل کیا ہے۔'' زرغون نے باگوپ کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو اس پر باگوپ جانتے بوجھتے انجان بن کر حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تم نے...... تم نے...... اسے قتل کر ڈالا۔ مگر یہ کیوں تمہارے باپ کو قتل کرے گا؟''

''اس نے یہ کام میری آنکھوں کے سامنے کیا ہے اور تیرے کہنے پر اس نے ایسا کیا ہے۔ اب تُو میرے ہاتھوں مرنے کے لئے تیار ہو جا...... میں تیری ساری سازشوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

زرغون دانت پیستے ہوئے بولا اور بھالا ہاتھ میں تولتا ہوا باگوپ کی طرف بڑھنے لگا۔ باگوپ اسی طرح اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا اپنی طرف جارحانہ انداز میں بڑھتے ہوئے زرغون کو عجیب سنسناتی نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

زرغون، باگوپ کے بالکل قریب پہنچ کر رک گیا اور بھالے والا ہاتھ فضا میں بلند کیا تو باگوپ بدستور برماتی ہوئی آنکھوں سے زرغون کی طرف گھورتا رہا۔ خوف یا ڈر کا شائبہ تک اس کے لمبوترے چہرے پر نہ تھا۔

''زرغون......! مجھے قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اگر تُو نے مجھے ذرا بھی نقصان پہنچایا تو پورے قبیلے کے لوگ تیری تکا بوٹی کر دیں گے اور اس طرح میرا کام خود ہی آسان ہو جائے گا۔'' باگوپ مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ زرغون کی شعلہ اگلتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تو زرغون نے غم و غصے سے مغلوب ہو کر بھالے کا ایک بھرپور وار باگوپ پر کرنا چاہا لیکن باگوپ بوڑھا ہونے کے باوجود غضب کا پھرتیلا اور طاقتور تھا۔ اس نے زرغون کے بھالے والا ہاتھ اپنے ہاتھ پر روک لیا اور زرغون کو اپنے دبلے پتلے جسم کی ٹھوکر رسید کی تو زرغون کو یوں لگا جیسے کسی چٹان نے اسے زبردست ٹکر ماری ہو...... وہ لڑکھڑاتا پختہ سنگی دیوار سے جا ٹکرایا، اسے اپنی ہڈیاں چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ شکر تھا کہ اس کا سر دیوار سے نہیں ٹکرایا تھا ورنہ پاش پاش ہو چکا ہوتا۔ چند لمحے تک تو وہ بالکل ماؤف سا ہو کر رہ گیا...... بھالا بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا

گرا تھا۔ اس نے خود کو ذرا سنبھالا اور پھر وحشت ناک غراہٹ کے ساتھ ایک طرف اطمینان سے کھڑے مسکراتے ہوئے باگوپ کی طرف بڑھا۔ پھر جیسے ہی زرغون، باگوپ کو قابو کرنے کے لئے اس کے قریب آیا، اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ زرغون کو یوں لگا جیسے وہ آہنی شکنجہ ہو کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کی گردن باگوپ کے بڑھے ہوئے ہاتھ نے دبوچ لی تھی۔

زرغون خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا سانس گھٹ رہا تھا، اسے یقیناً حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اس بظاہر لاغر سے چھریرے بدن والے بوڑھے میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ زرغون نے اپنے پہلو میں بندھے ہوئے بومرنگ کو نکال لیا۔ بوڑھا باگوپ اس روایتی قبائلی ہتھیار کی خطرناکی سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے زرغون کو مہلک ہتھیار استعمال کرنے نہ دیا اور اسے زور سے پرے دھکیل دیا۔ زرغون کے لئے یہ دھکا طوفان خیز ثابت ہوا۔ وہ خاصی دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا تھا۔ لیکن اب زرغون، بوڑھے باگوپ کی جسمانی طاقت کا اندازہ لگا چکا تھا اس لئے خود کو فوری سنبھالتا ہوا جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بومرنگ بھی ابھی تک اس نے اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا، اس نے باگوپ کا نشانہ لے کر بومرنگ کو مخصوص انداز میں اس کی طرف اچھال دیا۔ بومرنگ ''شائیں'' کی آواز نکالتا سنسناتا ہوا بوڑھے باگوپ کی طرف لپکا۔ پھر جیسے ہی وہ باگوپ کے قریب پہنچا، باگوپ یکدم نیچے کو ہو گیا۔ بومرنگ مخصوص انداز میں پھینکنے کی وجہ سے کمرے کا ایک چکر کاٹتا ہوا پھر باگوپ کی طرف بڑھا۔ اب وہ خاصا نیچے آ چکا تھا۔ باگوپ اب بیٹھ کر بھی خود کو اس کے جان لیوا چر کے سے نہیں بچا سکتا تھا تاہم اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑی اور کمرے کے وسط کی طرف دوڑا۔ ادھر زرغون کو پہلے سے علم تھا کہ باگوپ خود کو بچانے کی خاطر اس حصے کا رخ کرے گا، اس لئے وہ اپنے ہاتھ میں لمبے پھل والا شکاری چاقو لئے اس کا منتظر تھا، جیسے ہی باگوپ بوکھلاہٹ میں اس کے قریب آیا، زرغون نے چاقو سے اس کے پیٹ پر وار کیا۔ باگوپ نے خود کو بچانے کی کوشش کی تو چاقو اس کے پہلو میں ایک چرکا سا لگا گیا۔ ادھر زرغون کے پھینکے ہوئے بومرنگ کا تیسرا چکر شروع تھا اور ہر چکر میں بومرنگ نیچے آتا جا رہا تھا۔ یہ صورتحال دونوں کے لئے خطرناک تھی۔ وہ دونوں

آپس میں لڑتے ہوئے کسی بھی وقت کمرے میں چکراتے ہوئے بومرنگ کی زد میں آ سکتے تھے۔ زرغون کو اس کی پرواہ کب تھی، اس کے سر پر تو اس وقت خون سوار تھا، وہ اپنے باپ غرتش کے قاتل کو بھلا کہاں چھوڑنے والا تھا۔

باگوپ کو اپنے شکاری چاقو کا چرکا لگانے کے بعد اس نے پھر چاقو تول کر اس پر وار کیا تو جب تک باگوپ خود کو اپنے زخمی پہلو کی تکلیف سے نکال چکا تھا اور اس نے زخمی درندے کی طرح غراتے ہوئے زرغون کو زوردار ٹھوکر لگا دی، زرغون کمر کے بل دیوار سے ٹکرایا اور ٹھیک اسی وقت بومرنگ اپنا تیسرا جان لیوا چکر مکمل کرتا ہوا بالکل اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ زرغون نے اگر بیک وقت خود کو سنبھالتے ہوئے مخصوص انداز میں بومرنگ کو پکڑ نہ لیا ہوتا تو یقیناً وہ خود اپنے ہی پھینکے ہوئے ہتھیار کی زد میں آ جاتا مگر لگتا تھا زرغون نے بوڑھے باگوپ کی جسمانی حیران کن طاقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنے اسی ہتھیار سے اسے زیر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لہٰذا اس نے فوراً سنبھلتے ہوئے بومرنگ کو ایک بار پھر زور سے ہوا میں اچھال دیا اور باگوپ کی طرف غراتے ہوئے لپکا۔ اب زرغون چاہتا تھا کہ کسی طرح باگوپ کو زیر کر کے بومرنگ کی مہلک زد میں لے آئے۔ باگوپ زخمی تھا۔ زرغون اسے مزید سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ اس کے جسم میں شیطانی طاقت جوش مار رہی تھی۔ باگوپ بھی گھاؤ لگنے کی وجہ سے بپھرا ہوا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی زرغون نے اسے چھاپنے کی کوشش کی، باگوپ نے ایک بار پھر اپنے استخوانی ہاتھوں کا آہنی شکنجہ بڑھایا اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ایک بار پھر زرغون کی گردن دبوچ لی اور اسے دباتا چلا گیا تھا۔ جوش غیظ کے بارے باگوپ کے حلق سے غراہٹ آمیز خرخراہٹ بھی خارج ہو رہی تھی۔

زرغون کو اپنا دم نکلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ادھر زرغون کا پھینکا ہوا بومرنگ سنسناہٹ کی خوفناک آواز کے ساتھ محو گردش تھا۔ زرغون نے بہت زور لگایا کہ کسی طرح بوڑھے باگوپ کے شکنجے سے اپنی گردن چھڑا لے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ تب پھر اس نے ایک آخری کوشش کی۔ اگرچہ خود کو بچاتے ہوئے اس کی زندگی کو بھی خطرہ تھا لیکن اس کے پاس یہ داؤ آزمانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ بوڑھے باگوپ کے بظاہر لاغر وجود میں شیطانی طاقت پنہاں تھی، اپنی جان جوکھم میں ڈالے بغیر باگوپ کو ہلاک کرنا ممکن

نہ تھا۔ زرغون اس وقت ہر قیمت پر اپنے باپ کے قاتل باگوپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ زرغون نے فوراً اپنے دونوں پاؤں کے گھٹنے سکیڑ کر پوری قوت سے باگوپ کے پیٹ پر جڑ دیئے۔ باگوپ کے حلق سے تیز کراہ نکلی اور وہ زرغون کی گردن چھوڑ کر اپنا پیٹ پکڑے دہرا ہو گیا۔ زرغون نے باگوپ کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر زوردار لات اس کے جھکے ہوئے چہرے پر رسید کی اور باگوپ ایک بار پھر تکلیف کی شدت سے کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

بومرنگ اپنے مدار میں گردش کر رہا تھا، کمرے کے محدود ماحول میں اس کی شپاشپ شپاشپ...... گونج رہی تھی، زرغون زمین پر گرے باگوپ کے سینے پر چڑھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچنے لگا، بوڑھے باگوپ کے جسم میں واقعی کوئی شیطانی طاقت بھری ہوئی تھی کہ وہ دوبارہ توانا ہو کر زرغون کے مقابلے کے لئے تیار تھا۔ لہٰذا جیسے ہی زرغون اس کے سینے پر سوار ہوا، اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے خود پر سوار زرغون کے دونوں کاندھوں کو تھام کر اپنے پیٹ کو زور سے جھٹکا دیا تو زرغون حیرت انگیز طور پر اس کے سینے سے اچھل کر پرے جا گرا۔ بومرنگ اس وقت اپنے آخری چکر کی وجہ سے خاصا نیچے آ کر گردش کر رہا تھا۔ زرغون نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے ہوئے بومرنگ کو ہاتھ میں دبوچا اور دوبارہ باگوپ کی طرف بڑھا اور باگوپ نے ایک بالکل غیر متوقع اور عجیب حرکت کی، وہ یکدم زمین پر لیٹ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ چمگادڑ بن کر محرابی دریچے سے باہر تاریکی میں پرواز کر گیا۔



اس ویران اور بے آب و گیاہ چٹانی جزیرے میں اور ایک ہی جگہ محدود رہتے ہوئے انہیں عجیب طرح کی بیزاری سی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ پورا جزیرہ سنگلاخ چٹانوں سے اٹا پڑا تھا اور وہ بھی آتش فشاں چٹانوں سے۔ برگ و بار اور پھل اور شکار یہاں بالکل عنقا تھے اس لئے سردار جاذوب اور ضرقشاں وغیرہ کی شکم سیری کا انحصار مکمل طور پر زرغون پر تھا۔ وہ ان لوگوں کے لئے اپنی ڈونگا کشتی میں بہت سا خورد و نوش کا سامان لاد کر لاتا رہتا تھا۔ مگر اس بار زرغون کو آئے بہت دن بیت چکے تھے، ضرقشاں کو زرغون کی فکر لاحق تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے ماں، باپ اور چھوٹے بہن، بھائیوں کی

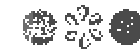
طرف سے بھی وہ متفکر اور پریشان سی ہونے لگی تھی کیونکہ ان کے پاس خوراک کا بچا کھچا ذخیرہ بھی ختم ہو چلا تھا۔ چنانچہ اب ضرقشاں کا ارادہ ثورگانی جزیرے کی طرف نکلنے کا تھا۔ اگرچہ وہاں اس کا جانا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ اگر کسی ثورگانی قبیلے کے آدمی کی نظر پڑ جاتی تو یقیناً اسے کڑی سے کڑی سزا بھگتنا پڑتی۔ بہر طور ضرقشاں، باپ کی تاکید کے باوجود ایک تاریک رات میں ثورگانی جزیرے کی طرف نکل کھڑی ہوئی۔

زرغون نے اسے بوقت ضرورت اور ہنگامی حالات کے لئے ایک چھوٹی ڈونگا کشتی بنا کر دے رکھی تھی اور ضرقشاں اسی میں سوار ہو کر ایک رات خاموشی سے بیکراں سمندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس منحوس اور بے آب و گیاہ چٹانی جزیرے میں اسی طرح بھوکے پیاسے پڑے رہے تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔ یہی سبب تھا کہ ضرقشاں اپنے باپ جاذوب کی تاکید اور اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر خود تنہا ہی ثورگانی قبیلے کی طرف کھلے سمندر میں نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اسے زرغون کے اتنا عرصہ غائب رہنے پر پریشانی اور حیرت تھی کیونکہ زرغون نے اس سے پہلے آنے میں کبھی اتنی دیر نہیں لگائی تھی اور یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ سردار جاذوب وغیرہ جس جزیرے میں بے یار و مددگار پڑے ہیں، وہاں کھانے کو ایک ذرّہ بھی نہ ملتا تھا اور خوراک لانے کا ذمہ اسی کا ہی تھا۔ ضرقشاں نے سوچا کہ زرغون ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور ہو سکتا ہے اسے اس کی مدد کی بھی ضرورت ہو۔ ضرقشاں کو اب دونوں کی فکر دامن گیر ہو چکی تھی۔

وہ ایک دن اور دو راتوں کے سفر کے بعد ثورگانی جزیرے کے ساحل سے جا لگی۔ ساحل پر شام جھک آئی تھی۔ دور سمندر کے گہرے پانی میں سورج کی لال ٹکیہ ڈوب رہی تھی جس کے عکس سے سارا اُفق خوں رنگ سا نظر آ رہا تھا۔ ضرقشاں ساحل پر اتر گئی اور اپنی ڈونگا کشتی کو گھسیٹتی ہوئی ریت پر لے آئی اور پھر وہاں سے مونگیا کی تاریک کچھاروں میں لا کر چھپا دی۔ چند ثانیے وہ وہیں دبکی گرد و پیش کے ماحول کا جائزہ لیتی رہی پھر اس کے بعد اس نے شکاری چاقو کی اپنے پاس موجودگی کا اطمینان کیا اور آبادی کی طرف بڑھ گئی۔

پورا جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ضرقشاں، زرغون کے جھونپڑے کے قریب پہنچنا

چاہتی تھی اور یہاں سے آبادی نزدیک تھی کیونکہ ضرقشاں دانستہ جزیرے کے ایسے گوشے ساحل پر اتری تھی کہ وہاں سے آبادی کافی نزدیک تھی۔ خاصی دیر کے بعد ضرقشاں کو سامنے ہی ڈھلوانی چھتوں والے سرکنڈوں کے جھونپڑے نظر آنے لگے۔ ان میں ایک نسبتاً بڑا جھونپڑا زرغون کا تھا۔ ضرقشاں کا دل اپنے محبوب کے در کے نزدیک پہنچ کر بے طرح دھڑکنے لگا تھا، وہ ساتھ ہی فکرمند بھی تھی کہ آخر زرغون نے دوبارہ ان کی خبر کیوں نہ لی۔ آخر وہ کس مصیبت کا شکار ہو گیا تھا...... انہی خیالوں میں چلتی ہوئی ضرقشاں کو اپنے پیروں پر ایک زوردار جھٹکا لگا...... بے اختیار اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے دونوں پیروں کو جکڑ لیا ہو...... اور پھر دوسرے ہی لمحے ضرقشاں کے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور وہ خاصی بلندی پر سر کے بل الٹی جھولتی چلی گئی۔ اب ضرقشاں سر کے بل فضا میں خاصی بلندی پر معلق تھی......!



باگوپ چمگادڑ کے روپ میں جان بچا کر اپنے معبد خانے سے نکلا اور سیدھا اپنے گماشتے سردار ضرغل کے پاس پہنچا۔ اس کے گوشے میں ایک روزن کے ذریعے اتر کر وہ دوبارہ انسانی روپ میں آ گیا اور ضرغل کو جھنجھوڑ کر جگانے لگا۔ ضرغل کی بیوی بھی سمور کے دوسرے بستر پر پڑی سو رہی تھی۔ باگوپ کے جھنجھوڑ کر جگانے سے دونوں ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ اس کو حواس باختہ حالت میں اپنے سامنے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکے۔ باگوپ نے اس سے کہا۔

"ضرغل......! اُٹھو، زرغون مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔"

ابھی باگوپ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک زرغون وہاں آن دھمکا، اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی اور ہاتھ میں چمکتا ہوا شکاری چاقو۔

زرغون کے بپھرے ہوئے چہرے سے اس کے انتقام کی آگ مترشح تھی۔ باگوپ، زرغون کے چہرے کی وحشت انگیزی دیکھ کر جھونپڑی کے اندرونی گوشے کی طرف دوڑا۔ زرغون بھی غراتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ اسی گوشے میں سردار ضرغل کی دوسری بیوی اور اس کے بچے محو خواب تھے۔ باگوپ اندر پہنچ کر ایک لمحے کو رکا، تب ہی زرغون اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ چاقو والا ہاتھ بلند کیا تو باگوپ

نے اپنے کاندھے کی بھرپور ٹکر رسید کی۔ زرغون اُڑتا ہوا جھونپڑی کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس شور میں ضرغل کی بیوی اور بچے بھی جاگ گئے اور وہ رونے چیخنے لگے۔ باگوپ پھر باہر کو دوڑا تو اندر داخل ہوتے ہوئے ضرغل سے جا ٹکرایا۔ دونوں ایک دوسرے سے الجھ کر زمین پر آ رہے مگر باگوپ نے زمین پر گرتے ہی ایک لوٹ لگائی اور پھر سے چمگادڑ بن کر باہر تاریکی میں پرواز کر گیا۔ زرغون وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ اس کی طرف لپکا تو سردار ضرغل نے اسے پکڑ لیا اور قہر بار لہجے میں اس سے بولا۔

"زرغون...... ہوش کرو، میں تمہیں سردار کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں۔" مگر زرغون کو کہاں ہوش تھا، وہ سردار ضرغل کی پرواہ کیے بغیر اسے پرے دھکیلتا ہوا باہر لپکا تو اندر سے اسے ضرغل کے مخصوص انداز میں "نرسنگا" بجانے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے آس پاس کے جھونپڑوں سے نیزہ بردار محافظ نکل آئے اور انہوں نے فوراً ہی زرغون کو اپنی گرفت میں لے لیا۔



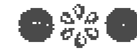
باگوپ چمگادڑ کے روپ میں سردار ضرغل کے جھونپڑے سے پرواز کرتا ہوا اپنے معبد خانے میں داخل ہو گیا۔ پھر انسانی شکل میں آتے ہی اس نے معبد خانے کا داخلی دروازہ بند کیا پھر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے محرابی دریچے کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور باہر تاریکی میں گھورنے لگا۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جس پریشانی میں مبتلا تھا، اب وہی پریشانی غیظ و غضب میں بدلنے لگی تھی۔ پھر وہ باہر تاریکی میں گھورتے ہوئے دانت پیس کر بڑبڑانے لگا۔

"زرغون! میں تجھے بہت عبرتناک سزا دوں گا۔ ابھی میری طاقتوں سے تُو واقف نہیں ہوا۔ تُو نہیں جانتا میں عظیم لوبولیلا کا عظیم پیروکار ہوں، کوئی کمزور انسان نہیں۔"

اس کا خیال تھا کہ زرغون بدستور اس کے تعاقب میں ہو گا مگر جب باگوپ کو کھلے دریچے کے قریب بیٹھے کافی دیر گزر گئی تو اسے پورا یقین ہو گیا کہ زرغون اب سردار ضرغل اور اس کے محافظوں کے نرغے میں پھنس چکا ہو گا۔ وہ دریچے سے ہٹ کر دیوار گیر سنگی میز کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم پر اب ایک لمبا سیاہ چغہ نظر آ رہا تھا۔ وہ میز کی پتھریلی سطح پر ایک خشک کھال پھیلائے اس پر پروں والے قلم سے آڑی ترچھی

لکیریں کھینچنے میں مصروف ہو گیا۔

پھر یکدم اٹھا اور کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دیئے اور اپنے دیوتا کو پکارتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ''عظیم لوبولیلا...... اپنے اس پیروکار کو طاقتور بنا دے، ابھی میرے اندر کمزوریاں باقی ہیں، تُو نے میرے لاغر وجود میں دس آدمیوں جیسی جادوئی طاقت تو بھر دی ہے مگر ابھی میں کمزور ہوں۔ تُو فکر نہ کر، میں پورے ثورگان قبیلے کو تیرا پیروکار بناؤں گا اور وہ تیرے آتش فشانی جزیرے کو آباد کریں گے اور تیرے عظیم وجود سے بہتے ہوئے لاوے کی بھینٹ چڑھیں گے۔ بس تُو مجھے جلد سے جلد ناقابل تسخیر بنا دے، اے عظیم لوبولیلا......!'' بوڑھا باگوپ کافی دیر تک آنکھیں بند کئے زیرلب بڑبڑاتا رہا۔



ضرقشاں ایک اونچے درخت کے ساتھ خاصی بلندی پر سر کے بل جھول رہی تھی، اس کی دونوں ٹانگوں کے ٹخنوں میں موٹے رسے کا مضبوط پھندا پڑا ہوا تھا۔ اسے یوں الٹا لٹکے کافی دیر ہو چکی تھی۔ سارے جسم کا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ چاروں اطراف گھور تاریکی اور گہرا سکوت طاری تھا۔ ضرقشاں کوئی عام لڑکی نہ تھی، یہ ایک سردار کی بیٹی تھی۔ اس کے لئے یہی غنیمت تھا کہ یہ پھندا اس کے لئے بچھایا نہیں گیا تھا۔ ایسے پھندے عام طور سے شکار کے لئے بچھائے جاتے تھے۔ ضرقشاں جلد از جلد اس پھندے سے نجات حاصل کر لینا چاہتی تھی لہٰذا اس کے لئے وہ کافی دیر سے تگ و دو میں مصروف تھی۔ اس نے ہمت نہیں ہاری تھی اور ویسے بھی ہمت ہارنا اس کے لئے خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ صبح ہونے تک اگر وہ ''شکار'' کے طور پر دھر لی گئی تو پھر اس کے لئے وہی سزا منتخب کی جاتی جو ایک جزیرہ بدر مجرم کے دوبارہ جزیرے میں قدم رکھنے پر دی جاتی تھی۔

ضرقشاں نے ذرا ستانے کے بعد ایک بار پھر کوشش کی اور اپنے جسم کو گول کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پھندے میں جکڑے ہوئے ٹخنوں تک لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ بالآخر اس نے اپنی پنڈلیوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ چند ثانئے وہ اپنی پھولی ہوئی سانسیں بحال کرنے لگی۔ پھر اس کے بعد اس نے بدقت تمام ٹخنوں کے بند

کھولنے کی کوشش کی۔ اس کے اپنے جسم کے وزن کی وجہ سے پھندے کی گرہ مزید سخت ہو گئی تھی جسے کھولنے کے لئے ضرقشاں کو جان توڑ محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ اس کی کمر سے بندھا شکاری چاقو بھی جھٹکے کی وجہ سے گر چکا تھا۔ اچانک ضرقشاں کو گھنی شاخوں کے پاس ہی تیز پھنکار سنائی دی جسے سن کر اس کی روح تک لرز اٹھی۔

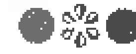
ابھی ایک مصیبت سے وہ چھٹکارہ نہیں پا سکی تھی کہ دوسری پر تولے سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ تب ہی اسے اپنے دائیں طرف چاند کی مدھم روشنی میں ایک سانپ نظر آیا۔ وہ ایک شاخ سے لپٹا ہوا تھا۔ سانپ اگرچہ چھوٹا تھا مگر ضرقشاں اسے دیکھ کر نہ صرف بری طرح پریشان ہو گئی تھی بلکہ خوف زدہ بھی ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس سانپ کی ''زہرناکی'' سے اچھی طرح واقف تھی۔

دوسرے ہی لمحے ضرقشاں، سانپ کی طرف سے توجہ ہٹا کر رسی کا پھندا کھولنے میں لگ گئی تاہم وہ دزدیدہ نظروں سے سانپ کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے شکاری چاقو کے گرنے کا بڑا قلق ہو رہا تھا۔ اگر وہ اس کے پاس ہوتا تو کب کی وہ دونوں مسئلوں سے نجات پا چکی ہوتی۔

بالآخر ضرقشاں کی پیہم کوششیں رنگ لائیں، وہ پھندے کی گرفت سے اپنی ایک ٹانگ آزاد کرا چکی تھی لیکن اس جان توڑ جدوجہد نے اس کی کمر تختہ کر ڈالی تھی اور وہ ذرا ستانے کے لئے چند ثانیے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنے جسم کو سنبھالے ستانے لگی۔ پھر اچانک اس خطرناک زہریلے سانپ نے دوبارہ پھنکار ماری...... اور اب وہ درخت کی اس شاخ کی طرف رینگتا ہوا آ رہا تھا جس سے ضرقشاں کے پاؤں بندھے ہوئے پھندے کی رسی سے جھول رہے تھے۔ اس زہریلے سانپ کو اپنی طرف رینگتا ہوا دیکھ کر ضرقشاں کا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی کوشش تیز کر دی۔ اس کی انگلیاں جلدی جلدی گرہ کھولنے کے لئے حرکت کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی ضرقشاں کی نگاہیں اس زہریلے سانپ پر بھی جمی ہوئی تھیں۔ سانپ اب اپنی دو شاخہ زبان لپلپاتا ہوا پھندے کی رسی پر رینگ آیا تھا۔ ضرقشاں کی روح فنا ہو گئی۔ اب سانپ کسی بھی لمحے ہلکے سے جھٹکے پر اس کے اوپر آ سکتا تھا۔ ضرقشاں حقیقتاً سر تا پا خطرے میں گھری ہوئی تھی۔ ضرقشاں کی انگلیاں اب پہلے سے تیزی کے ساتھ گرہ

کھولنے میں متحرک تھیں۔ سانپ اپنے وجود کو موٹی رسی کے ساتھ ضرقشاں کے تختے سے بندھے ہوئے پیر کی جانب سرکتا آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ رسن بستہ پاؤں کے بالکل قریب آ گیا...... اور پھر ٹھیک اسی وقت جب اس نے اپنا پھن اٹھا کے ضرقشاں کے بندھے ہوئے پیر پر ڈسنا چاہا تو ان خطرناک لمحات میں ضرقشاں اپنے دوسرے پاؤں کو بھی پھندے سے آزاد کرا چکی تھی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ خودرو گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے اسے خاص چوٹ نہ لگی تھی۔ وہ پھرتی سے اٹھی اور محتاط انداز میں گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔

چہار سُو چھائے ہوئے اندھیاروں کے خوفناک عفریت اسے نگلنے کو بے چین تھے مگر ضرقشاں تو خود ان اندھیروں کی گود میں پروان چڑھی تھی۔ وہ ذرا خائف نہ ہوئی اور آگے قدم بڑھا دیئے۔ پورا ماحول سنسناتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے اور جزیرے کے کسی گوشے سے چاند بھی جھانک رہا تھا۔ ضرقشاں کا رخ زرغون کی جھونپڑی کی طرف تھا۔ اس نے وہاں تک پہنچنے کے لئے عقبی راستہ اپنایا تھا۔ پھر ذرا دیر بعد وہ جھونپڑی کے دروازے پر پہنچی تو اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ اندر سے کسی کے سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔



زرغون کو باگوپ اور سردار ضرغل پر قاتلانہ حملے کے جرم میں پیوند زنداں کر دیا گیا تھا۔ یہ وہی خفیہ قید خانہ تھا جہاں کچھ روز پہلے معزول سردار جاذوب کو اس کے خاندان سمیت قید کر دیا گیا تھا۔ دوسری طرف اس کے باپ غرقش کے قتل کے سلسلے میں محض دکھاوے کے طور پر قاتل کی تلاش جاری تھی، زرغون نے لاکھ چلا چلا کر یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس کے باپ کو باگوپ نے شیمرون کے ذریعے قتل کروایا ہے مگر کوئی اس کی یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا بلکہ الٹا اسے ہی باگوپ پر الزام لگانے پر مارا پیٹا گیا۔ زرغون کو سزا دینے کے سلسلے میں مجلس مشاورت میں فیصلہ سنایا گیا کہ زرغون کو بھی جزیرہ بدر کر دیا جائے۔ لیکن پھر درونِ خانہ باگوپ کے دباؤ ڈالنے پر کٹھ پتلی سردار ضرغل نے مجلس مشاورت کے ذریعے زرغون کا بیچ میدان میں سرتن سے جدا کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔

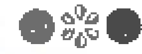
اگلے دن کو علی الصباح معبد خانے کے سامنے میدان میں چوبی چوکھٹ نصب کر کے کلہاڑا لگا دیا گیا تھا۔ اس وقت زرغون کچی دیواروں والے قید خانے میں آہنی زنجیروں سے جکڑا ہوا بظاہر اپنی موت کا منتظر تھا مگر اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ اسے اپنی موت کا خوف نہ تھا، وہ صرف اپنے باپ کے قاتل باگوپ کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر وہ بے بس تھا، اس کے پہاڑ ایسے وجود کو آہنی زنجیروں کے ساتھ نذرِ زندان کر دیا گیا تھا لیکن اس کا وجود اندر سے مثل آتش فشاں لاوا اُگل رہا تھا۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ کے قاتل باگوپ کا مکروہ چہرہ رقص کرتا ہوا آ جاتا تھا۔ سرتن سے جدا کر دینے کی سزا اسے بھرے مجمع میں سنا دی گئی تھی مگر موت کی سزا سننے کے بعد بھی اس کے چہرے سے خوفِ اجل کا شائبہ تک نہیں ابھرا تھا۔ اس نے بھرے مجمع کے سامنے تورگان قبیلے کے سردار کو چیخ چیخ کر یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے باپ غرقش کو باگوپ نے قتل کروایا ہے۔ اس پر بھرا مجمع مشتعل ہو گیا تھا اور زرغون پر سنگ باری شروع کر دی تھی۔

اب زرغون قید خانے میں پڑا اندر سے کڑھ رہا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہ زنجیریں توڑ ڈالے اور قید خانے کی دیواریں پھاڑتا ہوا باگوپ کے پاس جا پہنچے اور اسے عبرتناک موت عطا کرے۔ قید خانہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ یہ جزیرے کے کس مقام پر تھا، یہ زرغون نہیں جانتا تھا۔ قید خانے کی چھت خاصی بلند تھی اور خاصی بلندی پر چوکور روشندان تھا جہاں سے چاند کی روشنی اندر محدود حصے تک ضوفشاں ہو رہی تھی۔ زرغون کو ضرقشاں کا بھی خیال آیا اور وہ اداس دل کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ وہ جس مصیبت میں پھنس چکا تھا کہ اس کے سبب وہ ضرقشاں اور اس کے ماں باپ کی خیر خبر لینے آتش فشانی جزیرے کی طرف بھی نہیں جا سکا تھا۔ نجانے بیچارے کس حال میں ہوں گے۔ زرغون کو معلوم تھا کہ اس جزیرہ بدر خاندان کو خوراک وغیرہ کے سلسلے میں بھی پریشانی اٹھانا پڑ رہی ہو گی کیونکہ خوراک کی ترسیل اسی کے ذمے تھی۔ تاہم زرغون اپنی محبوب دل نواز ضرقشاں کی جرأت سے بھی واقف تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی تھی اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

ضرقشاں کا خیال دل میں آتے ہی وہ بے حد اُداس ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ضرقشاں

اس کے لئے کس قدر پریشان ہو رہی ہو گی اور پھر جب اسے کسی طرح اس دلدوز حقیقت کا علم ہو گا تو اس بے چاری کے دل پر کیا گزرے گی۔ اس منحوس قید خانے سے شاید وہ بھی واقف نہیں ہو گی۔ زرغون کو تو خود بھی اس کا علم نہ تھا کہ یہ منحوس قید خانہ جزیرے کے کس مقام پر واقع تھا۔ کیونکہ سزا سنانے کے بعد جب اسے اس قید خانے کی طرف گھسیٹا جا رہا تھا تو اس کے سر پر ایک سیاہ رنگ کی کھال ڈال دی گئی تھی۔

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ زرغون حسرت و یاس کے عالم میں دیوار سے کمر ٹکائے بیٹھا تھا، وہ اسی طرح بیٹھنے پر مجبور تھا۔ کیونکہ جن آہنی زنجیروں سے اس کے ہاتھوں پیروں کو جکڑا گیا تھا، اس کے سرے دیواروں میں نصب فولادی کنڈوں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ قید خانے کا دروازہ تنگ اور چھوٹا تھا جس کی سنگی چوکھٹ پر ایک بہت بڑا اور وزنی پتھر رکھا ہوا تھا۔ قید خانے کے اندر اس قدر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا کہ زرغون کو اپنے شوریدہ دل کی دھڑکنیں صاف محسوس ہو رہی تھیں۔ تب پھر اچانک زرغون ایک آواز پر بری طرح ٹھٹکا۔



رونے اور سسکنے کی وہ آواز کسی عورت کی تھی جسے سن کر ضرقشاں بری طرح ٹھٹکی تھی۔

یہ نسوانی آواز اس کی شناسا تھی اور یہ زرغون کی ماں ربیطہ کی تھی۔ ضرقشاں بے چین ہو گئی اور پھر وہ سیدھی اندر داخل ہو گئی۔ سامنے کھال کے بستر پر اسے زرغون کی ماں ربیطہ بیٹھی روتی ہوئی نظر آئی۔ وہ تنہا تھی۔ اس کا شوہر غرقش قتل ہو چکا تھا، بیٹا زرغون قید خانے میں موت کی گھڑیاں گن رہا تھا اور خود وہ یہاں اپنے نصیب کو رو رہی تھی۔ وہ ایک پختہ عمر کی دلکش عورت تھی، رنگت سرخ و سفید اور موٹی موٹی سیاہ آنکھوں پر ریشمی شہد رنگ بالوں کی آوارہ لٹیں اُداس چاند کی طرح اس کے پریشان چہرے کو نمایاں کئے ہوئے تھیں۔

ضرقشاں پر نگاہ پڑتے ہی وہ ٹھٹکی اور ایک لمحے کو رونا بھول گئی۔ بس یک ٹک ضرقشاں کے چہرے کی طرف تکنے لگی۔ ضرقشاں آگے بڑھی تو اس نے بھی اپنے بازو وا کر دیئے۔ دونوں لپٹ کر دھیمے دھیمے سسکنے لگیں۔ پھر ضرقشاں نے اپنا حال سنایا اور بعد میں جب ربیطہ نے اپنے شوہر کے قتل اور کل صبح دم بیٹے زرغون کا سر کاٹنے کی سزا کے

بارے میں بتایا تو ایک لمحے کو ضرقشاں بری طرح دہل گئی۔

"ہاں ضرقشاں...... ہم بھی تباہ ہو گئے۔ باگوپ اور سردار ضرغل نے ہمیں بھی نہ چھوڑا۔ میرا شوہر بھی قتل ہوا اور میرے ہی بیٹے کو موت کی سزا بھی سنا دی گئی۔ تُو کچھ کر ضرقشاں...... تُو تو بہادر لڑکی ہے ورنہ...... ورنہ کل صبح میرے بیٹے کو......" ربیطہ درد انگیز انداز میں کہتے کہتے یکدم رو اٹھی اور رقت کے مارے جملہ بھی پورا نہ کر سکی۔

ضرقشاں یہ سب سن کر سناٹے میں آ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ زرغون کی ماں ربیطہ کو حوصلہ دیتے ہوئے پُر جوش لہجے میں بولی۔ "تم فکر نہ کرو معزز ماں...... اب میں آ گئی ہوں۔ زرغون کا اب کوئی کچھ نہ بگاڑ پائے گا۔"

"ہاں...... ہاں ضرقشاں......! مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ خداوند تمہاری مدد فرمائیں۔ ٹھہرو......" ربیطہ، ضرقشاں کی پیشانی چوم کر بستر سے اٹھی اور جھونپڑی کے دوسرے گوشے میں چلی گئی۔ یہ وہ گوشہ تھا جدھر اس کا شوہر غرقش آرام کرتا تھا۔ ذرا دیر بعد ضرقشاں کی منتظر بے چین نگاہوں نے گوشے سے ربیطہ کو نمودار ہوتے دیکھا اور بری طرح چونک پڑی، اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑی اور مضبوط تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس کے بیٹے زرغون کا محبوب ہتھیار "بومرنگ" بھی تھا، ان ہتھیاروں کو دیکھ کر ایکا ایکی ضرقشاں کی آنکھوں میں جنگجوانہ چمک ابھر آئی۔ تلوار چلانا اسے آتی تھی، بومرنگ اچھالنا اس نے زرغون سے ہی سیکھا تھا۔ ضرقشاں نے بڑے احترام کے ساتھ وہ دونوں ہتھیار لے لئے تو ربیطہ لرزتی آواز میں اس سے بولی۔

"ثورگان کی بیٹی...... یہ تلوار میرے شوہر غرقش کی نشانی ہے اور یہ بومرنگ میرے بیٹے کا ہتھیار...... یہ میں تیرے حوالے کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ خداوند عظیم تجھے دشمنوں کا سر کچلنے کی طاقت دے۔"

ضرقشاں نے دونوں ہتھیار سنبھالے، ربیطہ کے گلے لگی، پھر وہ جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔ ربیطہ کو معلوم نہ تھا کہ اس کے بیٹے زرغون کو کون سے قید خانے میں رکھا گیا تھا مگر ضرقشاں جانتی تھی کہ وہ قید خانہ کس مقام پر تھا کیونکہ وہ خود بھی اپنے ماں باپ سمیت اس منحوس قید میں رہ چکی تھی۔ یہ ان دنوں کا ذکر تھا جب ضرقشاں کے معزول باپ جاذوب کو اس کے بیوی بچوں سمیت قید میں رکھا گیا تھا اور بعد میں ان سب کو

جزیرے سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔ ضرقشاں نے اپنی ہوشیاری اور جرأت کی بدولت قید خانے تک کا راستہ بھانپ رکھا تھا لہٰذا وہ ربیطہ کی جھونپڑی سے نکلتے ہی سیدھی جزیرے کے شمالی حصے کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔ فرطِ جوش سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اسے دشمنوں سے شدید نفرت ہونے لگی تھی جنھوں نے پہلے اسے اور اس کے باپ کو جزیرے سے نکالا اور پھر بعد میں اس کے محبوب زرغون کے ساتھ بھی ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ وہ دل میں پکا تہیہ کر چکی تھی کہ وہ اب کسی کی پرواہ نہیں کرے گی۔ وہ جانتی تھی کہ صرف ایک بار اپنے محبوب زرغون کو اس منحوس قید خانے سے صبح سے پہلے آزاد کروا لے، پھر دنیا کی کوئی طاقت ان دونوں کو جدا نہیں کر سکتی تھی۔



وہ آواز درحقیقت ایک آہٹ تھی جو سنگی قید خانے کے اس آدم گزار سوراخ کے پیچھے سے آتی محسوس ہوئی تھی جدھر بڑا سا ایک پہاڑی پتھر رکھا ہوا تھا۔ زرغون چونک کر اس سمت کی طرف تکنے لگا۔ لمحہ بھر بعد ان پراسرار آوازوں میں اضافہ ہونے لگا اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی باہر سے پتھر کو کسی آہنی شے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرغون متحیر سا ہو گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ مایوس نظر آنے لگا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید صبح ہو گئی ہے اور اسے اب مقتل گاہ تک لے جانے کے لئے جلادوں کا ٹولہ آن پہنچا ہے۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے خود ہی اپنے اس تکلیف دہ اور مایوس کن خیال کو رد کر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر یہ لوگ جلاد ہوتے تو ان کے لئے یہ بڑا سا پہاڑی پتھر ہٹانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر یہاں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی باہر سے اکیلا شخص اسے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پہلی بار زرغون کے مایوس دل میں امید کی جوت جگمگائی۔ وہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ پھر خاصی دیر بعد پتھر ذرا سا سرکا اور چاند کی مدھم کرن زرغون کے اندھیرے دل میں امید کے جگنو کی طرح چمکی اور دوسرے ہی لمحے زرغون نے ایک انسانی ہیولہ دیکھا جو پھنس پھنس کر اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ضرقشاں تھی...... جسے، زرغون پہچان چکا تھا......!



کوئی دم کو سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو تھا۔

باگوپ اس سے پہلے جاگ چکا تھا، وہ بہت خوش اور مطمئن تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ زرغون گرفتار ہو کر نہ صرف اندھے قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا بلکہ آج صبح اس کے معبد خانے کے سامنے وسیع میدان میں ایک چوبی گھاٹ پر اس کا سر تن سے جدا کیا جانے والا تھا اور باگوپ یہ خوش کن منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسی سرمستی کے عالم میں دریچے کے قریب آیا اور باہر سامنے میدان میں نصب آبنوسی لکڑیوں سے بنے گھاٹ کو دیکھنے لگا جس کی بلندی سے تیز دھار آہنی کلہاڑے کا پھل چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے عین نیچے چوکھٹا تھا جہاں مجرم کی گردن پھنسائی جاتی تھی۔ آبنوسی رنگت کے اس سفاک چوبی گھاٹ کا نظارہ کرتے کرتے اچانک باگوپ کی نظر دوسری جانب پڑی اور وہ بری طرح ٹھٹکا۔ اس نے دو انسانی ہیولوں کو تیزی کے ساتھ معبد خانے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ان میں ایک ہیولہ عورت کا تھا۔ عیار باگوپ نے ان دونوں پراسرار ہیولوں کی حرکات و سکنات سے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ان دونوں کے ارادے جارحانہ تھے۔ باگوپ انہیں ذرا قریب سے پہچاننے کے لئے دریچے کے پاس ہی کھڑا بغور اپنی بھنویں سکیڑے انہیں تکنے لگا پھر جب وہ دونوں انسانی ہیولے قریب آئے تو باگوپ کا مکروہ چہرہ طیش اور ناکامی کے احساس تلے مسخ ہو گیا۔ وہ زرغون اور ضرقشاں کو پہچان گیا تھا، ساتھ ہی اسے ان کے پاس دھاتی ہتھیاروں کی جھلک بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ باگوپ پہلے ہی زرغون سے خائف تھا، دوسرا اس کے قید خانے سے فرار اور جارحانہ انداز سے یہ بات بھانپ چکا تھا، ان دونوں کے تیور ٹھیک نہیں ہیں اور یہ دونوں ستم رسیدہ اس کی آج جان لے کر ہی رہیں گے۔ لہٰذا باگوپ نے فوراً فرش پر لوٹ لگائی اور اگلے ہی لمحے وہ ایک بڑی سی چمگادڑ کے روپ میں تبدیل ہو گیا۔ پھر پھڑ پھڑا کر اُڑا اور سنگی دریچے سے باہر پرواز کر گیا۔ وہ ایک غیر معمولی جسامت کی چمگادڑ کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی وہ معبد خانے کے چھوٹے سے محرابی دریچے سے نکلا تو نیچے معبد خانے کے قریب بڑھتے ہوئے زرغون کے کانوں میں مخصوص آواز ٹکرائی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسے ایک خاصی بڑی جسامت کی چمگادڑ دریچے سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ جان گیا کہ یہ مکار باگوپ ہے

جس نے شاید انہیں دیکھ لیا تھا اور اب راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔ زرغون نے پھرتی کے ساتھ اپنا محبوب ہتھیار بومرنگ نکالا اور نشانہ لے کر بڑے زور سے چمگادڑ کی طرف اچھال دیا...... بومرنگ زرغون کے ہاتھ سے نکلتے ہی شپ......شپ...... کی مخصوص آواز نکالتا ہوا تیزی کے ساتھ بلندی کی طرف اُڑا۔ بادی النظر میں بومرنگ کی پرواز چمگادڑ کی پرواز کے مطابق نظر نہیں آ رہی تھی اور یہی اس ہتھیار کا اصل کمال ہوتا ہے کہ اس کی بے رحم زد میں آنے والا شکار یہی سمجھتا ہے کہ نشانہ خطا ہو گیا ہے۔ مگر اچانک ایک مخصوص حد کے بعد بومرنگ فضا میں اپنی پرواز کسی لوٹن کبوتر کی طرح تبدیل کرتا ہے اور آنِ واحد میں اپنے شکار پر کسی باز کی طرح جھپٹ پڑتا ہے۔ چنانچہ چمگادڑ کے روپ میں باگوپ نے بھی بومرنگ کی پرواز کو مختلف سمت میں جاتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ زرغون کا نشانہ خطا ہو گیا ہے۔ لہٰذا وہ بڑے اطمینان سے اس کی طرف سے غافل ہو گیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا بومرنگ نے اپنی مخصوص بناوٹ کی وجہ سے اچانک فضا میں اپنا رخ بدلا اور عین اس کے سر پر پہنچ گیا۔ باگوپ نے جھکائی دے کر خود کو بومرنگ کے مہیب چرکے سے بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا، آہنی پنکھ کی طرح تیزی سے گھومتا ہوا بومرنگ چمگادڑ سے ٹکرایا اور چمگادڑ کا ایک لُجا سا پَر نما بازو کٹ کر نیچے آ رہا۔ چمگادڑ نے ایک تیز چیخ ماری اور قلابازیاں کھاتی ہوئی نیچے آ رہی۔ ادھر بومرنگ فضا میں اپنا ایک چکر پورا کر کے دوبارہ زرغون کے ہاتھوں میں آ گیا۔

زرغون اور ضرقشاں فوراً اپنے شکار کی طرف دوڑے۔ زخمی چمگادڑ (باگوپ) ذرا پرے تاریک جھاڑیوں میں جا گری تھی۔ زرغون اور ضرقشاں اس مقام پر پہنچ کر رک گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں گھورنے لگے۔ وہاں انہیں کچھ بھی نظر نہ آیا تھا۔ وہ دونوں وحشیانہ انداز میں اپنے ازلی دشمن کو دو مخالف سمتوں میں تلاش کرنے لگے۔ اتنا تو انہیں بھی پتہ تھا کہ دشمن زخمی ہو چکا تھا، مگر زندہ تھا۔

باگوپ کا دور دور تک پتہ نہ تھا...... وہ شاید فرار ہو چکا تھا۔



زخمی باگوپ چمگادڑ سے انسانی شکل میں آ گیا تھا مگر اس طرح کہ اب وہ اپنے ایک بازو سے محروم ہو چکا تھا، اس وقت وہ اپنے ٹنڈے بازو پر ہاتھ رکھے یوں اندھا دھند

اندھیرے میں دوڑا جا رہا تھا جیسے اس کا موت تعاقب کر رہی ہو اور حقیقت میں تو یہی تھا۔ زرغون اور ضرقشاں ملک الموت بنے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ باگوپ بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچاتا ہوا سردار ضرغل کی جھونپڑی میں پہنچا۔ سردار ضرغل اسے اتنی رات گئے اور زخمی حالت میں دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا پھر اس کے چہرے پر بھیدوں بھری خاموشی چھا گئی۔ اسے سخت حیرت ہو رہی تھی کہ باگوپ جو خود کو ایک بہت بڑا ساحر کہتا تھا، زرغون اور ضرقشاں جیسے عام آدمیوں سے یوں جان بچاتا پھر رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب سردار ضرغل کے دل و دماغ سے پہلی بار باگوپ کے رعب داب کی تاریکی چھٹنے لگی۔ بہرحال وہ اس وقت اس کی مدد کرنے پر مجبور تھا، اس نے اسے اپنے پاس پناہ دی اور چند محافظوں کے ذریعے راتوں رات ایک وید کو بلا کر اس کے ٹنڈے بازو پر لیپ کیا۔

''ضرغل......! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔'' ذرا تنہائی میسر آئی تو باگوپ نے سردار ضرغل سے کہا۔

ضرغل چونک کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیسا فیصلہ عظیم پیروکار......؟''

''تم صبح نکلتے ہی پورے تورگان قبیلے کو میرے معبد خانے کے میدان کے سامنے اکٹھا ہونے کا اعلان کرو گے۔ ہم سب کو یہ جزیرہ چھوڑ کر عظیم لوبولیلا کے چٹانی (آتش فشانی) جزیرے کی طرف کوچ کرنا ہو گا۔''

''مگر کیوں......؟ وہ جزیرہ تو پورے کا پورا آتش فشانی جزیرہ ہے، وہاں تو انگاروں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے لئے وہ جزیرہ موت کا جزیرہ ثابت ہو سکتا ہے۔'' سردار ضرغل نے ایک دم پریشان ہو کر باگوپ سے کہا۔

''کچھ نہیں ہو گا ہم لوگوں کو...... وہ عظیم لوبولیلا کا جزیرہ ہے، وہاں میری طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو گا۔''

''عظیم پیروکار...... وہاں تو نہ خوراک کا کوئی ذریعہ ہے نہ ہی پینے کا کوئی وسیلہ۔ ہم یہ سرسبز جزیرہ چھوڑ کر ایک ویران اور بے آب و گیاہ جزیرے میں کیوں کر جا سکتے ہیں۔ یہ تو سارے قبیلے کو ہلاکت میں......''

''ضرغل......!'' اچانک باگوپ اس کی بات کاٹ کر تنبیہی انداز میں دھاڑا۔ ''یہ

مت بھول ... تجھے میں نے تورگان قبیلے کا سردار بنایا ہے۔ تُو نے وہی کرنا ہے جو میں کہوں گا۔" سردار ضرغل کو باگوپ کا یہ لب ولہجہ ناگوار گزرا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔

باگوپ کو اس کی خاموشی کھلنے لگی اور وہ بھانپتی ہوئی نظروں سے سردار ضرغل کے مستغرق چہرے کو گھورنے لگا۔ اس کے بعد وہ ایک گوشے میں بنے ہوئے شاہانہ سمور والے بستر پر دراز ہو گیا۔ سردار ضرغل اٹھ کر اپنے جھونپڑے میں آ گیا۔ وہ بری طرح تلملا رہا تھا، یہ بات تو بہرحال سردار ضرغل بھی جانتا تھا کہ باگوپ جب چاہے اسے اپنے ایک اشارۂ ابرو سے منصب سرداری سے ہٹا سکتا تھا۔ درحقیقت سردار ضرغل طبعاً ایک مطلق العنان شخص تھا۔ وہ خود کو ہر طرح سے خود مختار دیکھنے کا عادی تھا۔ تبھی تو اسے ایسی سرداری ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی اور اس کی اس بے چینی کو ہوا دینے میں اس کے پکے دست راست جالوت کا ہاتھ تھا، وہی اسے ورغلاتا رہتا تھا کہ باگوپ کو صرف اپنے معبد خانے تک ہی محدود رہنا چاہئے، اسے قبیلے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہئے۔ جب معزول سردار جاذوب کے اقتدار کا سورج جگمگا رہا تھا تو اس وقت روحانی پیشوا نے خود کو اس نے اپنے غار تک محدود رکھا تھا بلکہ الٹا کبھی کبھار سردار جاذوب ہی کسی معاملے یا مسئلے پر اس سے جا کر رابطہ کرتا تھا۔ اس نے وہ باتیں کیں، جس نے سردار ضرغل کو باگوپ سے آہستہ آہستہ بددل کرنا شروع کر دیا تھا اور آج والی تنبیہ پر تو سردار ضرغل نے باگوپ سے چھٹکارا پانے کا مکمل منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس نے نہایت راز داری سے اپنے ایک مقرب خاص خادم کے ذریعے جالوت کو بلا لیا اور اسے ساری حقیقت حال سنا ڈالی۔

"میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا سردار...... یہ بڈھا ہمارے ہی بل بوتے پر اپنی طاقت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اور ایک وقت آئے گا کہ یہ خود ہی پورے تورگان قبیلے کا سردار بن بیٹھے گا۔" ساری بات سننے کے بعد جالوت نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ وہ خود نائب سرداری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ سردار ضرغل کو اسے اپنا نائب بنانے میں کوئی تامل نہ تھا لیکن باگوپ کے حکم کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ باگوپ نائب سردار کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جالوت کے دل میں بھی باگوپ کے خلاف بال آ گیا تھا۔

"اب تم ایک کام کرو جالوت......! باگوپ یہاں موجود ہے، اسے ختم کر دو۔" سردار ضرغل نے سرسراتے ہوئے کہا۔

جالوت نے مرتعش لہجے میں کہا۔ "بس...... سردار...... وہ...... وہ تو بڑا ساحر ہے، کہیں مجھے......"

"اگر تُو اسے جینے کا موقع دے گا تو وہ یقیناً آنے والے وقتوں میں ایک بہت بڑا ساحر بن جائے گا۔" سردار ضرغل نے جالوت سے کہا۔

جالوت فوراً اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور رضامندی سے بولا۔ "ٹھیک ہے سردار! میں ابھی یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔"

"ایک اور بات سن......" سردار ضرغل بولا اور جالوت گوش بر آواز ہو گیا۔ "باگوپ کو ختم کرنے کے بعد ہمارے سروں پر معزول سردار جاذوب اور زرغون کا بھی خطرہ منڈلا رہا ہے۔ یہ دونوں معمولی انسان نہیں ہیں اور انہیں اپنا جانی و ازلی دشمن سمجھتے ہیں، انہیں بھی تلاش کرنا ہو گا، جالوت......! لگتا ہے معزول سردار جاذوب اپنے خاندان سمیت کسی قریبی جزیرے میں مقیم ہے اور خاموشی سے بیٹھا ہمارے خلاف سازش کا جال بُن رہا ہے۔"

سردار ضرغل کی بات سن کر پہلی بار جالوت کے چہرے کے تاثرات میں تشویش کی پرچھائیں ابھری مگر دوسرے ہی لمحے بھرپور لہجے میں بولا۔

"سردار......! تم ان کی فکر نہ کرو، پہلے اس بوڑھے باگوپ کا قضیہ نمٹانے دو، پھر جاذوب اور زرغون وغیرہ سے بھی نمٹ لیں گے۔"

یہ کہہ کر جالوت، باگوپ کے جھونپڑے کی طرف جانے لگا تو سردار ضرغل بھی احتیاطاً اپنا چھرا سنبھالے اس کے پیچھے ہو لیا۔ جالوت نے باگوپ کے جھونپڑے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنے دائیں ہاتھ میں چھرا مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، اندر باگوپ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اسے شاید ابھی زرغون اور ضرفشاں کی طرف سے خطرہ تھا مگر اس نے جالوت کو ہاتھ میں چھرا پکڑے اپنے "عارضی" جھونپڑے میں در آتے دیکھا تو وہ جالوت کی آنکھوں کی سفاکی کا مطلب نہ جان سکا اور کچھ اور ہی معنی پہناتے ہوئے اس سے بدحواس ہو کر بولا۔

”کک...... کیا...... زرغون اور زرقشاں یہاں تک پہنچ گئے ہیں؟“

”تو کیسا ساحر ہے جو ان معمولی لوگوں سے اس قدر خوف زدہ ہو رہا ہے۔“

جالوت کے بدلے ہوئے استہزائیہ جملے پر باگوپ بری طرح ٹھٹکا اور غصیلے لہجے میں اس کی طرف گھور کر بولا۔ ”یہ تو کس لہجے میں بول رہا ہے، جانتا نہیں میں کون ہوں؟“

جالوت کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ آئی اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں سفاک چمک ابھری۔ اس نے کچھ کہے بغیر اپنا چھرے والا ہاتھ بلند کیا اور باگوپ کے شانے پر وار کیا۔ باگوپ کے حلق سے جگر خراش چیخ نکلی اور اس نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ جالوت کو ٹھوکر ماری اور باہر کی طرف بھاگا، وہاں پہلے ہی سے سردار ضرغل کھڑا تھا، اس نے باگوپ کو گردن سے پکڑ لیا تو باگوپ گھگھیائی ہوئی آواز میں اس سے بولا۔

”ض...... ضرغل!...... یہ جالوت مجھے مارنا چاہتا ہے۔“ اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ سردار ضرغل نے بھی اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا لمبے مہیب پھل والا چھرا باگوپ کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ باگوپ کے حلق سے ذبح کئے ہوئے مینڈھے کی سی خرخراہٹ نکلی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سردار ضرغل کا منہ تکنے لگا۔ پھر دوسرے ہی لمحے تیورا کر فرش پر گرا اور اگلے ہی لمحے انسان سے چمگادڑ کی شکل میں تبدیل ہو گیا مگر اس کا ایک بازو (پَر) نہ ہونے کی وجہ سے وہ پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ وہ خون آلود ہو رہا تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ سردار ضرغل اور جالوت سفاک مسکراہٹ کے ساتھ مُردہ چمگادڑ (باگوپ) کی لاش کو گھورے جا رہے تھے۔



”میرا خیال ہے ہمیں واپس لوٹ جانا چاہئے۔“ بالآخر کافی تلاشِ بسیار کے بعد ضرقشاں نے زرغون سے کہا تو زرغون بولا۔

”ٹھیک ہے...... مگر میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں زرغون...... ہمارے پاس وقت نہیں ہے، صبح نکلتے ہی تمہارے قید خانے سے فرار کی خبر عام ہو جائے گی تو معزز ربیطہ خود ہی سمجھ جائیں گی کہ میں نے تمہیں قید خانے سے آزاد کرا لیا ہے۔“ ضرقشاں نے کہا۔

اور پھر زرغون نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں ساحل کی طرف آ گئے۔ یہاں پہنچ کر دونوں نے مل کر جلدی جلدی خوراک اور پانی کا ذخیرہ اکٹھا کیا اور بجرے میں بیٹھ کر گہرے سمندر کی طرف چلے گئے۔

دور سمندر کے افق سے پو پھٹنے لگی تھی۔ پھر شام کو سرمئی پھیلنے تک وہ چٹانی جزیرے کے ساحل سے جا لگے۔ ضرقشاں کے ماں باپ اور دو چھوٹے بہن بھائی انہیں دیکھ کر خوشی سے لپٹ گئے۔ وہ لوگ بھوک سے نڈھال تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے جی بھر کر کھایا پیا، پھر ضرقشاں نے اپنے باپ جاذوب کو اب تک کی ساری کتھا سنا ڈالی۔

اس نے ضرقشاں اور زرغون کی بہادری کی تعریف کی مگر پھر دوسرے ہی لمحے پُرتشویش لہجے میں بولا۔ ”باگوپ کا زندہ بچ جانا اچھا نہیں۔ کیونکہ اس نے ضرقشاں کو دیکھ لیا تھا، اب وہ میرے ازلی دشمنوں ضرغل اور ہاتر آختون وغیرہ کو ہمارے بارے میں بتا دے گا اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ ہم لوگ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ کسی قریبی جزیرے پر موجود ہیں۔“

اس کی بات سن کر زرغون پُرجوش لہجے میں بولا۔ ”ٹھیک ہے...... ہم بھی ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر اب ہم لوگوں کو یہاں ساحل پر رہنے کی بجائے اندر جزیرے میں کہیں چھپنا ہو گا۔“

زرغون کی بات سن کر جاذوب نے دور دھواں اگلتی آتش فشانی چوٹیوں کی طرف دیکھ کر تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”ہم اندر نہیں جا سکتے، تم دیکھ نہیں رہے ہو یہاں ہر جگہ لاوا اُگلنے کو بے قرار آتش فشاں پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر انہوں نے لاوا اگلنا شروع کر دیا تو ہماری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔“

ضرقشاں نے اپنے باپ سے کہا۔ ”ہمیں تو یہاں بھی خطرہ ہے اور باہر بھی...... میرا خیال یہ ہے کہ میں اور زرغون پہلے کوئی اور قریبی جزیرہ تلاش کر لیتے ہیں پھر اس کے بعد......“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اس کی ماں زرگاں، سمندر کی طرف اشارہ کر کے زور سے چلائی۔

”وہ دیکھو...... کوئی ادھر آ رہا ہے۔“

ان سب نے چونک کر سمندر کی طرف دیکھا تو بری طرح ٹھٹکے۔ دور نیلگوں پانیوں

میں چار پانچ بحری بجرے ساحل کی طرف تیرتے آتے دکھائی دیئے۔

''یہ دشمن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے معزز سردار......! ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے، اٹھو......!'' زرغون نے جاذوب سے کہا اور پھر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور جزیرے کے اندرونی حصے کی طرف دیوانہ وار دوڑنے لگے۔ اب یہ لوگ ہانپتے دوڑتے آتش فشانی پہاڑیوں کے دامن میں آ گئے۔ یہاں انہیں آس پاس متعدد گپھائیں نظر آئیں، یہ لوگ فوراً ایک نسبتاً بڑے دہانے والی گپھا میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

''تم لوگ ادھر ٹھہرو، میں ساحل کی طرف جا کر دیکھتا ہوں یہ کون لوگ ہیں۔'' زرغون نے کہا اور اٹھ کر باہر جانے لگا تو ضرقشاں اور اس کا باپ جاذوب بھی اس کے عقب میں نکل آئے۔

''میں زرغون کے ساتھ جا رہی ہوں، تم ادھر ہی رہو بچوں کے ساتھ۔'' ضرقشاں نے باپ سے کہا تو جاذوب اندر داخل ہو گیا۔ پھر زرغون اور ضرقشاں اپنے مخصوص دھاتی ہتھیاروں کے ساتھ ساحل کی طرف نکل گئے۔ پھر وہ ایک نسبتاً بلند پہاڑی کی اوٹ سے ساحل کی طرف دیکھنے لگے۔ یہاں سے ساحل کا نظارہ قریب پڑتا تھا، سورج کی روشنی سے ساحل کی ریت کے ذرات چمک رہے تھے، سامنے ساحل سے کشتیاں لگ چکی تھیں۔ ان میں سے مسلح افراد اترنے لگے۔ ان سب لوگوں نے بھالے اور چھرے پکڑ رکھے تھے، یہ لوگ ثورگانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

''سردار کا خیال درست ثابت ہوا۔ ان لوگوں کو ہماری بھنک پڑ گئی ہے کہ ہم لوگ ادھر موجود ہیں۔'' زرغون نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہوگا، ان کے تیور ٹھیک نہیں۔''

''میں تیار ہوں زرغون......'' ضرقشاں نے جاں فروشانہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ دونوں آمنے سامنے کی دو مختلف سمتوں میں دبک گئے۔ حملہ آور جارحانہ تیوروں کے ساتھ اسی طرف آ رہے تھے، وہ تعداد میں دس بارہ تھے۔

وہ جیسے ہی قریب آئے، زرغون اور ضرقشاں اپنی دھاتی تلواروں کے ساتھ چیختے ہوئے پہاڑ کی اوٹ سے نکل آئے اور ان پر پل پڑے۔ دونوں ہی جنگجو اور لڑائی بھڑائی میں ماہر تھے، پہلے ہی ہلے میں ان دونوں نے پانچ چھ حملہ آوروں کو ہلاک کر ڈالا۔ باقی

ساحل کی طرف پسپا ہونے لگے اور جلد ہی انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ زرغون اور ضرقشاں انہیں ہلاک کرنا چاہتے تھے کہ اچانک عقب سے کسی نے بلند آواز سے انہیں باقی ماندہ حملہ آوروں کو ہلاک کرنے سے روک دیا۔ یہ جاذوب تھا، اس کے بعد جاذوب نے شکست خوردہ حملہ آوروں کو نرمی سے سمجھایا کہ ان کا سردار ضرغل ایک بدطینت انسان ہے، اس نے سازش کے ذریعے نہ صرف ان پر ظلم کیا بلکہ غاصبانہ طریقے سے اقتدار پر قابض ہو گیا۔ یہ زیادہ عرصے ثورگان قبیلے کا سردار رہا تو بہت جلد قبیلے پر ناگہانی قیامت ٹوٹ پڑے گی کیونکہ ضرغل اور اس کے ساتھیوں نے ایک بدکار ساحر باگوپ کے کہنے پر دیوتا کے عظیم فرزند غافر کا قتل کیا ہے، تب سے خداوند عظیم پورے ثورگانی قبیلے سے ناراض ہے۔

سردار جاذوب کی باتوں سے شکست خوردہ ثورگانی حملہ آوروں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ایک نئے عزم کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔



ادھر بدطینت سردار ضرغل نے زرغون اور ضرقشاں اور اس کے ماں باپ کو تلاش کیا۔ ان سب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے سورج نکلنے سے پہلے ہی چند حملہ آوروں کو روانہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اور اس کے ہمنوا جالوت نے اپنے تیسرے ساتھی ہاتر آختون کو باگوپ کے خاتمے کے بارے میں بتا دیا۔ ہاتر آختون، باگوپ کے مرنے پر خوش تھا۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق اس نے اسے نظر انداز کر کے ضرغل کو ثورگانی قبیلے کا سردار بنا دیا تھا۔ حالانکہ سرداری کا حق وہ رکھتا تھا مگر اس نے یہ بات اپنے دل تک ہی محدود رکھی تھی، اب جو اس نے باگوپ کے قتل کی خبر سنی تو اس کے دل میں سویا ہوا کینہ بیدار ہو گیا۔ اس نے سردار ضرغل کے خلاف مکارانہ چال چلتے ہوئے اسے بظاہر یہ صائب مگر درپردہ خطرناک مشورہ دیا کہ اسے سردار ضرغل کو پورے قبیلے والوں کی یہ حقیقت بتا دینی چاہئے کہ دراصل باگوپ ایک بدطینت اور شیطان دیوتا کا پیروکار تھا اور اس نے اپنے مقصد کی خاطر دیوتا کے بیٹے بوڑھے غافر کا قتل کروایا تھا۔

سردار ضرغل چونکہ ہاتر آختون کو اپنا سچا اور وفادار ساتھی اور مشیر سمجھتا تھا لہٰذا اس نے بلا سوچے سمجھے اس کے خطرناک مشورے پر عمل کر ڈالا اور صبح ہوتے ہی اس نے معبد

خانے کے سامنے میدان میں ثورگانی قبیلے والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ ادھر مٹھی بھر معزول سردار جاذوب کے وفاداروں نے پہلے ہی سے پورے قبیلے میں رازداری کے ساتھ یہ انکشاف گوش گزار کر دیا تھا کہ دراصل باگوپ سردار ضرغل ہی کی پیداوار ہے چنانچہ سردار ضرغل کے اپنے منہ سے یہ انکشاف کرنے پر ثورگانی قبیلے کے اکثر لوگوں کے دل اس کی طرف سے بھی بد دل ہو گئے۔ یوں قبیلے میں اندر ہی اندر انتشار پھیلنے لگا اور یہ لوگ آپس میں لڑنے لگے۔ یہ صورتحال دیکھ کر سردار ضرغل بری طرح حواس باختہ ہو گیا، حالات اس کے بس سے باہر ہونے لگے، پورے قبیلے میں خانہ جنگی کی سی صورتحال پیدا ہونے لگی، لوگ آپس میں کٹ مرنے لگے۔

زرغون اور ضرقشاں بڑی رازداری کے ساتھ ان نازک حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہیں بہت دکھ ہوا، وہ اپنے قبیلے والوں کا درد اپنے دل میں رکھتے تھے۔ لہٰذا جب ان دونوں نے واپس چٹانی جزیرے میں جا کر معزول سردار جاذوب کو یہ اندوہناک خبر سنائی تو جاذوب کا دل اپنے قبیلے والوں کی ابتر حالت پر دکھ سے بھر گیا۔ پھر اس نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر واپس اپنے جزیرے کی طرف لوٹنے کا مصمم عزم کیا۔

معزول سردار جاذوب کے اپنے قبیلے میں واپس لوٹنے پر ثورگانی قبیلہ دو دھڑوں میں بٹ گیا مگر جاذوب کی آمد کی وجہ سے باقی ماندہ متنفر لوگوں کے دلوں میں بھی اپنے سابقہ اور شفیق سردار جاذوب کی محبت اور احترام جاگ اٹھا۔ لہٰذا اب جاذوب کو ماننے والوں کی تعداد نسبتاً دگنی ہو گئی۔ سردار جاذوب کے حامی جزیرے کے شمالی کونے میں جا بسے اور سردار ضرغل کے جنوبی کونے تک محدود ہو گئے۔ دونوں مختلف دھڑوں میں بٹ جانے کی وجہ سے آپس میں صف آراء رہتے۔ چند دن سکون سے گزرتے، پھر ایک ہی قبیلے کے دو گروہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتے۔ سردار جاذوب سچا حکمران تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے قبیلے کے لوگ یوں آپس میں لڑ لڑ کر مرتے رہیں، وہ مخالف گروہ کو بھی اپنا ہی سمجھتا تھا مگر وہ انہیں کیسے سمجھاتا۔ اگرچہ سردار جاذوب نے قبیلے کے مفاد اور بھلائی کی خاطر یہ فیصلہ بھی کیا کہ وہ سردار ضرغل کے لئے میدان چھوڑ دے مگر زرغون اور ضرقشاں نے ایسا نہ کرنے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح سردار ضرغل ان کے حامیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے گا۔

اب یوں ہونے لگا کہ پہلے تو کھلے بندوں دونوں گروہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا جاتے تھے مگر اب رازداری اور خاموشی سے ایک دوسرے پر اچانک حملہ آور ہونے کی روش اپنا لی گئی۔ یوں ایک رات اچانک جنوبی گوشے سے تعلق رکھنے والے ثورگانیوں نے حملہ کر دیا...... بڑا گھمسان کا رن پڑا، لوگ مرنے لگے، زرغون، ضرقشاں اور اس کا باپ جاذوب بڑی بے جگری سے لڑتے رہے۔ بالآخر سردار جاذوب کے سینے میں دشمن کا بھالا آ کر لگا...... ضرقشاں نے باپ کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا اور وحشیانہ چیخ کے ساتھ اپنی تلوار سے جنوبی ثورگانی کے ٹکڑے کر ڈالے۔

جاذوب مر چکا تھا...... ضرقشاں کافی دیر تک باپ کی لاش سے لپٹی روتی رہی۔ سردار جاذوب کے مرنے کی خبر عام ہوئی تو شمالی ثورگانیوں کے رہے سہے حوصلے بھی جواب دے گئے...... یوں شمالی ثورگانیوں پر قابو پا لیا گیا اور سردار جاذوب کے حامیوں کو چن چن کر اس قدر بے دردی کے ساتھ قتل کیا جانے لگا کہ آسمان تک تھرا اٹھا...... زرغون اور ضرقشاں بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ضرقشاں کی ماں اور دونوں چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی جنوبی ثورگانیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا اور زرغون کی ماں ربیطہ بھی ان وحشیوں کی بربریت کا شکار ہو گئی۔

پھر یوں ہوا کہ اچانک ایک روز جزیرے کو چاروں طرف سے سمندر کے خوفناک طوفان نے گھیر لیا۔ جزیرے میں سیلاب آ گیا اور جزیرے کی زمین پر لاتعداد دراڑیں بنتی چلی گئیں...... جزیرہ ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر تہہ آب ہونے لگا...... پھر نہ جنوبی ثورگانی بچے نہ شمالی ثورگانی...... سب ڈوب گئے...... سمندر نے ان کے سرسبز و شاداب، خوبصورت، ہر نعمت سے مالا مال جزیرے کو پل بھر میں نگل لیا۔ ثورگانی صفحۂ ہستی سے ہی مٹ گئے۔ صرف دو افراد بچے تھے، ایک زرغون اور دوسری ضرقشاں......! وہ دونوں کسی طرح بڑے سے کھوکھلے شہتیر پر بیکراں سمندر کی لہروں پر محوِ سفر تھے۔ انہیں امید تھی کہ جلد ہی وہ کسی دوسرے جزیرے کے ساحل کے کنارے جا لگیں گے اور ایک نئی زندگی، ایک نئے قبیلے کی ابتداء کریں گے۔



پُراسرار آدم خور

دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔

جاپان کو رنگون پر حملہ کرنے کی خاطر خواہ سزا مل چکی تھی۔

میں ان دنوں بطور ای این (ریلوے) رائے سر آیا ہوا تھا۔ جے پور کے شمال میں تقریباً سولہ کلومیٹر دور ایک بڑا ریلوے ٹریک زیر مرمت تھا جو تساہل پسند افسروں کی وجہ سے ایک عرصے سے تعطل کا شکار تھا۔ کام اور ذمے داری کے معاملے میں انگریز واقعی خاصا اصول پرست واقع ہوا ہے اور وہ ایماندار افسروں سے کام لینا بھی جانتا ہے اور ان کی ''شناس'' بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا ان کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی اور یوں حکم حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق میں جے پور کے ایک بڑے ریلوے جنکشن آفس کی پُرتعیش رہائشی کالونی سے عارضی طور پر چند ماہرین اور گڑھ والیوں (ملازموں) کے ساتھ ایک ڈاک بنگلے میں فروکش ہو گیا تھا۔

شمالی ہندوستان کے گھنے جنگلات مجھے شروع ہی سے اپیل کرتے رہے ہیں اور میری حسِ شکار کو ابھارتے رہے ہیں۔

تارائی (ہمالیہ) کے جنگلات میں انڈر سیکرٹری مسٹر نارمن کے ساتھ میں نے ایک شکاری مہم میں حصہ لیا تھا۔ وہاں ہمالیہ کی ترائیوں میں ایک آدم خور شیر نے گاؤں کے علاوہ اطراف میں خاصی دہشت مچا رکھی تھی۔ مسٹر نارمن شکار کے رسیا تھے۔ بالخصوص درندوں کے شکار کے لئے تو وہ ہر سے کمربستہ دکھائی دیتے تھے۔ اس کی اس مہم میں، میں نے بھی شوقیہ حصہ لیا اور مجھے کیا معلوم تھا کہ اتفاقاً ہی مجھ سے اتنا بڑا کارنامہ ہو جائے گا جو مجھے باقاعدہ نہیں تو بے قاعدہ ہی سہی...... منجھے ہوئے شکاریوں کی فہرست میں شامل کروا دے گا۔

قصہ یوں تھا، تارائی کے جنگلات کے بیچوں بیچ جھیل ''کھنڈ'' کے کنارے ایک

خوبصورت بنگلہ تھا، جہاں میں انڈر سیکرٹری مسٹر اینڈ مسز نارمن، ان کے دو دوست مہاراج کلدیپ نارائن اور سری واستو رہائش پذیر تھے۔ یہ خالصتاً شکاری مہم تھی۔

مسٹر نارمن کی طرح ان کی ہر ہائی نس مسز اینا نارمن بھی مہم جو فطرت خاتون تھیں۔ ان کی عمر تیس پینتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ ایک پُرکشش اور دبنگ خاتون تھیں۔

نارائن اور سری واستو میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ ہم تینوں اکثر چھوٹے موٹے جانوروں کا شکار کرتے رہتے تھے۔ میرے پاس ایک ڈبل بیرل رائفل تھی جس کی ایک نال میں سکہ اور دوسری نال میں چھرے ڈالے جاتے تھے۔ چھروں سے اکثر ہم نے سہولوں، جنگلی مرغوں اور پرندوں کا شکار کیا تھا۔ جب کسی درندے (ریچھ یا بھیڑیا وغیرہ) سے سامنا ہوتا تو سکے والی بیرل استعمال میں لاتے۔ اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔

انڈر سیکرٹری مسٹر نارمن شکار کے رسیا تھے۔ تھوڑی بہت میری بھی ان سے شناسائی تھی۔ مگر اس مبہم شناسائی کو پنپنے کا موقع اب فراہم ہوا تھا۔ سری واستو کا ایک دن فون آیا تھا۔

''ارے یار...... ذاکر حسین...... ! تیار ہو جاؤ...... اب ہم چڑی مار نہیں رہے۔'' اس کے لہجے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''کیا مطلب......؟'' میں نے قدرے چونک کر کہا۔

''ارے بھئی سب سے پہلے ایک لگژری بوگی بک کرالو۔ پوری کی پوری...... اپنے سیکرٹری صاحب مسٹر نارمن کے لئے۔'' سری واستو بولا۔ ''شکاری مہم پر جانا ہے۔ ڈسٹرکٹ تارائی...... ان کی بیگم بھی ساتھ ہیں۔ میں اور کلدیپ بھی ہوں گے۔ تمہیں بھی چلنا ہے، سمجھے۔'' اس کا انداز دوستانہ آمیز تھا۔

میں نے فوراً ہی حامی بھر لی۔

اس طرح اب ہم سب تارائی کے گھنے جنگلات کے بیچوں بیچ جھیل ''کھنڈ'' کے کنارے ایک بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ یہاں پہلے ہی سے ایک آدم خور شیر نے دہشت مچا رکھی تھی۔ کوئی بھی درندہ آدم خور نہیں ہوتا۔ بھوک کی شدت، شکار کی عدم دستیابی یا پھر عالمِ غیظ میں جب کسی انسان پر حملہ کر دیتا ہے تو اسے خونِ انسانی کی لت

لگ جاتی ہے۔ آدم خوری کی ایک تیسری وجہ بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ آدم خوری میں شیر عالم غیظ میں پاگل ہو جاتا ہے اور...... دیوانہ وار مائل بہ حملہ ہوتا ہے۔ اس تیسری قسم کے آدم خور شیر کو ہمالیائی زبان میں ''گولر'' کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا آدم خور شیر نسبتاً زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ہمارا واسطہ ایسے ہی ایک گولر آدم خور شیر سے تھا۔

مسٹر نارمن کے پاس پانچ سو بور کی رائفل تھی اور ہمارے پاس بارہ بور کی ڈبل بیرل ایکسپریس شکاری رائفلیں۔

ایک دن ہم لوگ وٹی کے ایک اونچے درخت پر بیس فٹ کی بلندی پر مچان بنا کر بیٹھ گئے تھے۔

یہ آدم خور اب تک گیارہ معصوم افراد کو اپنا شکار بنا چکا تھا۔ ان میں دو بچے اور تین عورتیں بھی شامل تھیں۔

کوتاہ قصہ...... مچان سے چند گز کے فاصلے پر زمین میں کھونٹا گاڑ کر ایک بکری کو ''چارے'' کے طور پر باندھ دیا گیا تھا۔ آدم خور کے خلاف ہماری یہ محاذ آرائی کوئی پانچویں بار تھی اور یہاں ہمیں چھٹا دن ہو رہا تھا۔ مگر ہر دفعہ وہ آدم خور ہم سے بچ کر صاف نکلتا رہا تھا۔ اس بار مسٹر نارمن نے میرے مشورے کے مطابق اپنے ساتھ زیادہ مزدور نہیں لئے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی مسز بھی ساتھ نہ تھیں...... بس صرف ہم چاروں تھے۔ میں یعنی ذاکر حسین، مسٹر نارمن، سری واستو اور کلدیپ۔

ہم دم سادھے مچان پر بیٹھے چہار اطراف میں نظروں کی کمندیں ڈالے ہوئے تھے۔ سہ پہر ہو چلی تھی، تارائی کے گھنے جنگلات کا یہ وسطی علاقہ چاروں طرف سے گھنے اور چھتنار درختوں، قد آدم پودوں اور لمبی لمبی جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ فضا دم بہ خود تھی۔ اتنی گہری خاموشی ہمارے حق میں بہتر تھی مگر اس حق کا ہم صحیح استعمال نہ کر سکے اور جلد بازی کا شکار ہو گئے۔

اچانک نیچے چند گز کے فاصلے پر کھونٹے سے بندھی بربری بکری نے پہلے ہولے ہولے اور پھر بتدریج زور زور سے ممنانا شروع کر دیا۔ ہم چاروں محتاط ہو گئے اور اپنی ''آٹھ'' آنکھیں چاروں طرف کا جائزہ لینے میں مرکوز کر ڈالیں۔

بکری نے آدم خور کی صورت میں موت کو اپنی طرف بڑھتا محسوس کر لیا تھا۔ شیر کہیں

آس پاس ہی تھا اور غالباً اپنے شکار پر نظریں جمائے کسی بھی سمت سے اچانک جھپٹنے کی تیاری میں تھا۔

یوں تو ہم نے بڑے بڑے ارادے دل میں باندھ رکھے تھے...... لیکن سچی بات یہ تھی شیر کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے۔ بکری کی روح فرسا بے چینی دیکھ کر خود میرے دل میں مارے انجانے خوف کے دھکڑ دھکڑ ہونے لگی تھی۔ مسٹر نارمن نے اپنی پانچ بور رائفل کو ہلکی آواز کے ساتھ ''کلک'' کیا اور پھر دم سادھے چہار اطراف بہ غور تکنے لگی۔ کسی بھی دم آدم خور بکری پر جھپٹنے والا تھا اور ہمیں اس آدم خور کو دیکھتے ہی تاک کر گولیاں برسانی تھیں۔ بہ صورتِ دیگر آدم خور غضب ناک ہو کر ساری مچان پر زقند بھر سکتا تھا۔

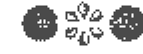
اگلے ہی لمحے ہمارے بائیں جانب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ابھری اور پھر لگ بھگ چھ فٹ کے ایک غیر معمولی لمبے اور قوی الجثہ ببر شیر نے بکری کو آ دبوچا۔

ہدف کو چند گز کے فاصلے پر دیکھنے کے جوش اور خوشی کے ملے جلے احساس نے عجلت کے شاخسانے کو جنم دیا اور سب سے پہلے مسٹر نارمن نے آدم خور کا نشانہ لیتے ہوئے فائر کر ڈالا۔

ساکت فضا میں پانچ سو بور اور پونے تین سو میگنم کے ایل جی پی...... کارتوس کا کان پھاڑ دھماکا ہوا اور ایک چھرا کارتوس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ آدم خور نے شکار چھوڑ کر ایک غضب ناک دھاڑ ماری اور سیدھا مچان کی طرف جست بھری۔ آدم خور کو غضب ناک عالم میں اپنی جانب متوجہ پا کر ہم باقی تینوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کلدیپ اور سری واستو کے ہاتھوں سے تو بندوقیں چھوٹ کر گر پڑیں...... لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور تاک کر آدم خور پر تلے اوپر دو فائر جھونک مارے۔ دونوں نشانے پر لگے اور شیر ہماری مچان سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر آخری دھاڑ کے ساتھ...... ''بھد'' سے جھاڑیوں میں گرا۔

مسٹر نارمن...... ہنوز سناٹے کے عالم میں تھے۔ کلدیپ اور سری واستو کے چہروں پر استعجاب انگیز خوشی، آثار چھوڑے ہوئے تھی۔ بندوقوں کے دھماکوں سے تارائی کے پورے جنگل کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ چرند پرند کا احتجاج آمیز شور سا مچ گیا تھا۔

پس قصہ کوتاہ...... یہی وہ موقع تھا جب میرا شمار شکاریوں میں ہونے لگا تھا۔



ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ان دنوں میں بطور ریلوے ای این رائے سر آیا ہوا تھا اور اپنے مختصر سے عملے کے ساتھ ڈاک بنگلے میں فروکش تھا۔ ریلوے ٹریک کی مرمت کا کام آخری مراحل میں تھا اور شمالی ہندوستان کے ان مضافاتی گھنے جنگلات میں رہتے ہوئے میری رگِ شکار کئی بار پھڑکی تھی اور ان پندرہ بیس دنوں میں، میں نے سانبھر اور چھوٹی نسل کے گلدار کا شکار کھیلا تھا۔ میرا بنگلہ زیر مرمت ریلوے ٹریک سے لگ بھگ ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور یہاں میں ایک ملازم رامو کے ساتھ رہتا تھا جبکہ میرے عملے کے دیگر افراد نے ریلوے ٹریک کے قریب ہی کیمپ لگا رکھا تھا۔ میں صبح صادق ٹرالی کے ذریعے سائٹ پر جایا کرتا تھا اور شام کو واپس لوٹ آتا تھا۔

ایک روز فلو کے باعث میں نے سائٹ پر جانے کی بجائے بنگلے پر ہی ذرا دیر آرام کرنے کو ترجیح دی۔ ویسے کام بھی آخری مراحل پر خاصا تسلی بخش انداز میں انجام پذیر تھا، اس لئے تھوڑا آرام کرنے کو دل چاہا۔

ماگھ کی بھیگی راتوں والی خوشگوار صبحیں تھیں۔ رات بھر موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی اور اگلے دن تیز دھوپ نکل آتی۔ بلند و بالا اور گھنے درختوں کی ہری بھری شاخیں دُھل کر نکھر جاتیں۔

میں اس سے بنگلے کے باغیچے میں کرسی ڈالے موجود تھا۔ ناشتہ میں نے ادھر ہی ایک فولڈنگ ٹیبل پر کیا تھا اور اب چائے پیتے ہوئے گزشتہ شب کی بارشوں میں بھیگی ہوئی صبح کی تازگی کو اپنے اندر منتقل کر رہا تھا، بنگلے کا یہ باغیچہ مختصر ضرور تھا لیکن خوبصورت رنگا رنگ پھولوں اور سرسبز بیلوں سے لدا ہوا تھا۔ فرش دبیز مہین گھاس سے مزین تھا، پودوں اور گھاس کی نرم و نازک پتیوں پر شبنمی قطرے روپہلے موتیوں کی طرح دمک رہے تھے۔

دور سرسبز ڈھلوانوں والی فلک بوس عمارتوں پر ہرن، سانبھر اور ایسے ہی دوسرے چھوٹے بڑے جانور قلانچیں بھرتے نظر آ رہے تھے۔ شمال کی سمت خوش رنگ پرندوں کی منظم ڈاریں بڑی سبک روی کے ساتھ محو پرواز تھیں تو ایک جانب بلند و بالا بانس، دیودار اور تاڑ کے درختوں سے پرے پیالہ نما ہری بھری وادیوں میں سنبلوں اور سرخ

کلغیوں والے جنگلی مرغوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُڑانوں میں مصروف تھے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے رامو میرے سامنے سے ناشتے کے برتن اٹھا لے گیا تھا، میں اس چہار سُو پھیلے حسین مناظر کی دلکشی میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک میرے کانوں سے موٹر گاڑی کے انجن کی گھرگھراتی آواز ٹکرائی، میں نے چونک کر لان سے باہر وسیع احاطے کی طرف نظریں گھمائیں تو بے اختیار میرے قدم گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

سامنے پرانے ماڈل کی خاکی ہڈ والی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ بونٹ کے ساتھ مڈگارڈ پر جھولتے مخصوص مونوگرام والے پھریرے کو دیکھتے ہی میں نے بھنویں اچکا دیں۔ لینڈ کروزر کے چاروں سمتوں والے دروازے کھلے۔

وہ پانچ افراد تھے۔ دو افراد کو دیکھ کر میں چونکنے کے ساتھ ایک متوقع سی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ دونوں شناسا افراد میرے لنگوٹیے یار، غار کلدیپ اور سری واستو تھے۔ اس سے وہ دونوں کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ دونوں ہی کا قد و قامت ٹھگنا اور گٹھا ہوا تھا البتہ ڈرائیونگ سیٹ اور اس کی ساتھ والی سیٹ سے اترنے والے وہ دونوں انگریز میاں بیوی تھے۔ مونوگرام والے پھریرے سے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ صاحب موصوف آر او تھے۔ آر او صاحب خاصے لمبے تڑنگے اور اچھی صحت کے مالک تھے۔ بیوی ان کی دبلی پتلی اور خاصی پُرکشش تھی۔ اس کے سنہری بال روپہلی کرنوں کی مانند اس کے گورے چٹے چہرے پر ملاحت بکھیر رہے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر خوشدلی سے ان کا استقبال کرتے ہوئے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

''ذاکر حسین...... ای این ریلوے''

''او نائس ٹو میٹ یو! آئی ایم ہیریسن برٹش آر او......'' جواباً آر او صاحب نے خوش دلی سے اپنا تعارف کرایا۔ مسز ہیریسن نے خود ہی مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا۔ ادھر کلدیپ اور سری واستو میرے قریب آ کر بے تکلفی کے ساتھ بغلگیر ہو گئے۔

''ہمیں معلوم تھا کہ تُو ادھر ہی ہے...... پر......'' سری واستو نے کہا۔

''تیرے کو سرپرائز دیں گے۔'' کلدیپ نے خالص کاٹھیا واڑی لہجے میں کہا اور

میں بے اختیار مسکرا دیا۔ میں ذرا کم گو واقع ہوا تھا، رسمی کلمات کے تبادلے کے دوران ہم اندر ہال کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

''مسٹر ہیریسن......! یہ ذاکر صاحب ہمارے بہت پرانے دوست ہیں۔'' ایک بڑے صوفے پر اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ دھنستے ہوئے سری واستو نے آر او صاحب سے میرا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہی وہ نڈر شکاری ہیں جب انہوں نے اپنے انڈر سیکرٹری مسٹر نارمن کو تارائی کے ایک آدم خور شیر کے خونی پنجوں سے بچایا تھا اور کمال کی پھرتی سے اس آدم خور کو موقع پر ہی ڈھیر کر دیا تھا۔''

''او ویری نائس......!'' مسٹر ہیریسن کے منہ سے بے اختیار میرے لئے توصیفی کلمات نکلے جبکہ ان کی مسز بھی خاصی ستائشی نگاہوں سے میری جانب تکنے لگیں۔ ان دونوں میاں بیوی کی آنکھیں نیلی مائل براؤن تھیں۔ میں جانے کیوں جھینپنے لگا پھر ہیریسن نے اپنی خاکی بش شرٹ کی تھیلے نما جیب سے پائپ اور سیلوفین پاؤچ نکالا۔ پائپ میں تمباکو ڈالتے ہوئے دیا سلائی سے اسے سلگایا اور جلدی جلدی دو تین کش لگائے۔ پائپ پوری طرح جل اٹھا۔ پھر وہ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے پہلو بدل کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''مسٹر ذاکر...... اس سے پہلے آپ نے اور کہاں کہاں شکار کھیلا ہے، میرا مطلب ہے تارائی کے علاوہ؟'' ان کا انداز انٹرویو لینے کا سا تھا۔

میں ہولے سے کھنکار کر پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''اس سے پہلے میں ساؤ پانا اور شمالی ہندوستان مدھیہ پردیش میں شکار کھیل چکا ہوں۔ آدم خور درندوں سے کم ہی واسطہ پڑا ہے میرا۔ میں شوقیہ ہی شکار کھیلتا ہوں۔''

''گڈ......!'' مسٹر ہیریسن نے مخصوص لہجے میں کہتے ہوئے دھواں اُگلا اور فضا میں بکھرے کثیف دھوئیں کے مرغولوں میں انہوں نے نظریں گاڑ دیں۔

''جناب......! یہ چھپا رستم ہے...... اس نے مادھو پور کے ساڑھے سات فٹ لمبے آدم خور کو بھی موت کے گھاٹ اتارا تھا...... اس کا نشانہ کمال کا ہے۔'' اس بار کلدیپ نے میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور جانے کیوں میری چھٹی حس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کی یہاں اچانک آمد کسی ایسی ہی شکاری مہم کا شاخسانہ لگتی

ہے جس میں یہ لوگ مجھے بھی شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سوچ کر مجھے انوکھی مسرت کا احساس ہونے لگا۔

''ویل مسٹر ذاکر حسین......! اس کا مطلب ہے تمہارے بغیر ہماری مہم نامکمل ہو گی۔'' مسٹر ہیریسن کی گفتگو سے میرے خوش فہم خیالات کی تصدیق ہو گئی۔ تاہم میں بھی پہلو بچائے رکھتے ہوئے انجان سا بنا رہا۔

''میرا خیال ہے مسٹر ہیری......! ذاکر حسین سے تفصیلی بات کر لینی چاہئے۔'' اچانک کلدیپ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف تکتے ہوئے ہیریسن سے کہا اور انہوں نے جواباً دھیرے سے مسکرا کر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

''دیکھو بھئی! سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارا یہاں کام کتنا باقی رہ گیا ہے؟'' سری واستو نے مجھ سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے میں پہلے آپ لوگوں کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر لوں پھر تفصیل سے گفتگو ہو گی۔'' میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

مسٹر ہیریسن نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ ''نو، لیو اِٹ...... ہمارا ملازم گریزی ساتھ ہے۔ ہمارے کھانے پینے کا بھی سارا سامان ہے ہمارے پاس۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی مسز کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس اثناء میں گریزی اور رامو مختلف ساز و سامان اٹھائے اندر آ گئے۔

پھر یہ دونوں ملازم ہمارے آگے رکھی خاصی چوڑی ٹیبل پر ہلکی پھلکی اشیائے خورد و نوش سرو کرنے لگے۔

سری واستو اپنی بات دہرانے کی بجائے مستفسرانہ نظروں سے میری طرف تکنے لگا اور ادھر مسٹر ہیریسن بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تو میں نے ذرا کھنکار کر جواباً کہا۔

''میرا کام اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے تین چار روز میں فارغ ہو جاؤں گا۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ میں ابھی تقریباً فارغ ہوں، اس لئے یہاں نظر آ رہا ہوں ورنہ اس وقت میں سائٹ پر ہوتا۔'' میں نے اپنی بات مکمل کی۔

کلدیپ، رامو سے چائے لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بھئی ذاکر! تم اب اپنے آپ کو فارغ ہی سمجھو...... ہم دراصل یہاں سے سولہ کلومیٹر دور شمال میں ماگھ پتی

کے علاقے میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں...... وہاں سنا ہے کافی عرصے سے ایک آدم خور شیر نے دہشت پھیلا رکھی ہے اور اب تک ماگھ پتی، پوروائی اور آس پاس کے علاقے کے کم از کم سوڈیڑھ سو معصوم انسانوں کو جان سے مار چکا ہے۔

کلدیپ اتنا کہہ کر لمحے بھر کو رکا تو یکدم میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں...... مجھے حیرت تھی کہ خود مجھے یہاں رائے سر میں رہتے ہوئے پندرہ سولہ روز ہو چکے تھے، میرے کانوں تک اس آدم خور کی شہرت کیوں نہ پہنچی؟

میں ابھی اپنی سوچ میں غلطاں تھا کہ سری واستو نے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ ''اور تم ذاکر حسین......! ہماری اس مہم میں ضرور شامل رہو گے بلکہ شامل ہو چکے ہو...... ہم ابھی اپنی تھکان اتاریں گے پھر ایک دو گھنٹوں بعد تمہارے ساتھ ہی ماگھ پتی روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں ماگھ پتی میں مہاراج ہمارے دوپہر کے بھوجن پر ہمارے منتظر ہوں گے...... وہی پوروائی کے مکھیا بھی ہیں۔''

میں نے اس کی بات بغور سنی اور دھیرے سے پُر خیال انداز میں اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔

مزید لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ ماگھ پتی کے آدم خور سے متعلق اور شکاری رائفلوں کی جانچ پڑتال میں گزر گیا۔ اس دوران میں کلدیپ اور سری واستو سے اپنے دل کی الجھن نہ چھپا سکا اور اس خیال کا اظہار کر ہی ڈالا۔ ''آخر مجھے ادھر رائے سر میں رہتے ہوئے اس آدم خور کے بارے میں کیوں کچھ معلوم نہ ہوا؟''

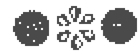
''آسان سی وجہ ہے اس کی۔'' سری واستو نے کندھے اچکا کر کہا اور اپنی بات مکمل کی۔ ''یہ آدم خور پراسرار سا واقع ہوا ہے جس کے بارے میں ابھی تک یہ ہی نہیں پتہ چل سکا کہ وہ کس نسل کا ہے...... شیر ہے، چیتا ہے یا گلدار......''

''کیا مطلب......؟'' میں چونکے بنا نہیں رہ سکا لیکن سری واستو میری بات سے صرف نظر کرتے ہوئے بدستور اسرار بھرے لہجے میں بتانے لگا۔

''اس آدم خور کو کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہ پراسرار طور پر کسی بھی بھولے بھٹکے شخص کو چپکے سے اٹھا کر لے جاتا ہے اور بدنصیب کی پھر اگلے دن لاش ہی ملتی ہے اور وہ بھی باقیات کی صورت میں۔''

میں یہ تفصیل سن کر متحیر سا رہ گیا۔ ''یہ تو مجھے جن بھوت والا معاملہ لگتا ہے۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

بہر طور اس پراسرار آدم خور سے دو دو ہاتھ کرنے کو میرا دل کشاں کشاں ماگھ پتی جانے کو بے چین ہو چلا تھا۔ میں نے رامو کو ضروری ہدایات دیں اور پھر مختصر سا ریڈی میڈ بوریا بسر باندھا، اپنی ایکسپریس رائفل ٹکڑوں کی حالت میں بریف کیس میں ڈالی اور عازم ماگھ پتی ہوا۔



موسلادھار بارش ہو رہی تھی...... پورا جنگل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شراٹے دار بارش اور بجلی کی گرج چمک سے پورا جنگل گونجتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم سہ پہر تک ماگھ پتی پہنچ چکے تھے...... دوپہر کا کھانا مہاراج کی حویلی میں ہم نے اکٹھے ہی کھایا تھا...... ان کا اصرار تھا کہ ہم ابھی حویلی میں عارضی طور پر رہائش پذیر ہو کر آدم خور کی بیخ کنی کی مہم کا پورے سکون کے ساتھ آغاز کریں مگر ہم نے انتہائی شکریے کے ساتھ ان سے معذرت کی۔ پھر انہوں نے جنگل کے وسط میں بنے ایک شکاری بنگلے کی صفائی کروا کر اسے فی الفور قابل رہائش بنایا اور اب ہم ایک بڑے ہال کمرے اور دو چھوٹے کمروں کے اس چوکور بنگلے میں موجود تھے۔ مہاراج نے اپنے ملازموں کی ایک کثیر تعداد ہمیں تفویض کرنی چاہی تھی لیکن ہم نے صرف ان کا ایک ملازم مرلی ساتھ رکھ لیا تھا وہ بھی اس لئے کہ آس پاس کے علاقے کا وہ شناسا سا تھا۔

اس سے تو ہم سب ہی تھکے ہوئے تھے، اس لئے مسٹر و مسز ہیریسن اپنے کمرے میں جا سوئے تھے...... کلدیپ بھی تھکا ہوا تھا اسی لئے وہ بھی اپنے کمرے میں پڑا سو رہا تھا...... یہ دوسرا کمرہ ہم تینوں کلدیپ، سری واستو اور میرا مشترکہ تھا...... یہاں پہلے دو بیڈ موجود ہونے کے باوجود تیسرے کی گنجائش کو مدنگاہ رکھتے ہوئے مہاراج نے فوراً اپنی حویلی سے ایک بیڈ ادھر ڈلوا دیا تھا مگر میں اور سری واستو نے ہال کمرے میں ہی سونے کو ترجیح دی تھی جہاں ایک بڑے صوفے میں وہ خود بھی پڑا خراٹے لے رہا تھا جبکہ پتہ نہیں کیوں نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

یہ ہال کمرہ اتنا زیادہ بڑا تو نہ تھا البتہ اس کی چھت خاصی بلند تھی۔ فرش بھی لکڑی کا

تھا۔ درحقیقت یہ بنگلہ زمین کی سطح سے پانچ فٹ بلندی پر تھا جس کے نیچے خود رو جھاڑیاں اُگ آئی تھیں...... چوبی کڑیوں والی چھت محراب دار تھی اور خاصی کہن سالی کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ایک آتش دان بھی تھا جو ظاہر ہے ابھی سرد پڑا تھا کیونکہ سردی کا موسم نہ تھا۔ شمالاً جنوباً جال دار اور شیشے کے شٹر والی کھڑکیاں تھیں۔ مغربی سمت میں داخلی دروازہ اور شرقاً دو کمرے بنے ہوئے تھے۔

یہ شکاری بنگلہ مہاراج کی حویلی یا یوں کہہ لیں ماگھ پتی کی آبادی سے خاصے فاصلے پر تھا...... وسطی جنگلات کا علاقہ ادھر سے ہی شروع ہوتا تھا۔ باہر بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور گھنے چوڑے پتوں والے درختوں پر بارش کی شراٹے دار پھوار جاری تھی۔ کمرے میں پیٹرومکس کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

میں چارپائی پر کافی دیر تک بے خوابی کے عالم میں کروٹیں بدلنے کے بعد جھلا کر اٹھ بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ایک دو کش لینے کے دوران دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھڑکی کی طرف آیا اور اس کی دیوار گیر چوکھٹ سے ٹیک لگا کر باہر گھنے جنگل میں رہ رہ کر گرجتی چمکتی بجلی اور بارش کو تکنے لگا۔

کھڑکی کے ایئر ٹائٹ شیشے پر بارش کی بوندیں کاریزیں سی بناتی محسوس ہو رہی تھیں۔لکیروں کا جال سا تھا جو شیشے پر پھیل گیا تھا...... جب بجلی چمکتی تو سامنے دور تک پھیلا ہوا ویران جنگل روشن ہو جاتا۔

اچانک بجلی چمکنے کے دوران میری نظر ایک سائے پر پڑی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ انسانی سایہ تھا جس کے ہاتھ میں ایک شکاری رائفل تھی اور اس کا حلیہ بھی کسی شکاری جیسا ہی محسوس ہوا تھا تاہم اس نے پتلون کی جگہ نیکر پہن رکھی تھی۔ میں نے ذرا چونک کر پھر اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر اس بار وہ نظر نہ آیا۔ پھر اچانک جب بجلی چمکی تو مجھے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ بالکل چپکا ہوا ایک بد ہیئت چہرہ دکھائی دیا اور میرا دل جیسے کسی نے یکدم مٹھی میں جکڑ لیا۔ غیر ارادی طور پر میں کھڑکی سے چند قدم پیچھے کو ہوا اور لڑکھڑا سا گیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سی چیکٹ داڑھی، بھنویں اتنی گھنی کہ آنکھوں تک کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ یہی حال بالوں کا تھا جو جٹاؤں کی طرح چوٹیوں کی صورت جھول رہے تھے۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ مجھے کسی صورت بھی پانی میں بھیگا ہوا

محسوس نہیں ہو رہا تھا حالانکہ باہر بڑی دھواں دھار بارش ہو رہی تھی...... وہ ہنوز کھڑکی کے شیشے سے چپکا میری طرف گھور رہا تھا...... بغور دیکھنے پر مجھے اس کے کاندھے سے جھانکتی ہوئی شکاری رائفل کی نال بھی دکھائی دی تھی۔ یہ وہی شکاری تھا جس کی جھلک ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے دیکھی تھی۔

اسی لمحے جب دوبارہ بجلی چمکی تو وہ چہرہ غائب ہو چکا تھا۔

''پتہ نہیں کون تھا......؟'' میرے منہ سے بڑبڑاہٹ آمیز جملہ نکلا اور پھر کھڑکی کے قریب آ کر باہر برستے موسم کا نظارہ کرنے لگا۔ اس پراسرار شکاری کے چہرے کے نقوش میرے ذہن میں ثبت ہو چکے تھے۔ پھر اچانک مجھے نیند ستانے لگی اور رات کا یہ لمحہ بھر کا پراسرار واقعہ میرے ذہن سے صبح تک محو ہو چکا تھا۔



اگلے دن ناشتے کے فوراً بعد مہاراج کے ''ارسال کردہ'' ایک دھرپالی کو اپنی چھ رکنی ہسٹنگ ٹیم میں شامل کر کے آدم خور کی گوشمالی کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

شنید یہی تھی کہ اس ان دیکھے آدم خور نے آس پاس کے علاقے میں کافی دہشت مچا رکھی تھی اور اب تک سو سے زائد معصوم انسانوں کو اپنی مردم خوری کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ میری جانے کیوں سرشت ایسی تھی کہ مجھے کسی بھی معاملے کا کوئی نہ کوئی پراسرار پہلو کھٹکتا ضرور تھا۔ اس سلسلے میں بھی دو پراسرار باتوں نے مجھے الجھا سا دیا تھا اور میری رگ پراسراریت کو ہوا دینے کا باعث بنی تھی۔ اس آدم خور کو آج تک کسی نے دیکھا نہیں تھا اور یہ واقعی ایک حیران کن امر تھا۔ دوسری بات یہ کہ پراسرار آدم خور نے اب تک صرف مردوں کو ہی اپنی آتش شکم کا نشانہ بنایا تھا جبکہ ایسے درندے یعنی چیتا، شیر، گلدار یا تیندوے جب آدم خوری کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی مردم خوری کی مرد، عورت حتیٰ کہ بچے تک بلا تخصیص بھینٹ چڑھنے لگتے ہیں کیونکہ انہیں تو انسانی خون کی لت لگ چکی ہوتی ہے، نا کہ مرد یا عورت کی۔

آدم خور کے ان پراسرار پہلوؤں پر سوچ و بچار کے دوران مجھے آر او مسٹر ہیریسن اور کلدیپ پر بھی حیرت تھی کہ انہوں نے آخر ان پہلوؤں کو کیوں نظر انداز کیا تھا۔ تاہم میں نے دورانِ مہم خود ہی اس بات کا اظہار مسٹر ہیریسن سے کیا۔

اس وقت سہ پہر ہو چلی تھی مگر ہم سب تازہ دم تھے...... میں نے ہیریسن سے جب اس نادیدہ مردم خور کے بارے میں ان دو پراسرار پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کروائی تو وہ بھیدوں بھری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے ان میں پائپ دبا کر مخصوص لہجے میں بولے۔

"ویل مسٹر ذاکر حسین...... میں خود اس ادھیڑ بُن میں مبتلا ہوں لیکن......" انہوں نے نجانے کیوں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا، پھر لمحہ بھر توقف کے بعد پُر خیال لہجے میں بولے۔ "ویسے آسام کے جنگلوں میں، میں نے ایک ایسا ہی پراسرار آدم خور شکار کیا تھا۔ وہ آدم خور شیرنی تھی جو صرف بچوں یا عورتوں کا شکار کرتی تھی۔ لیکن اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ میں نے جب اس شیرنی کو ہلاک کیا تو اس کے اگلے دونوں پنجوں کے ناخن ٹوٹے ہوئے تھے بلکہ اس کے جبڑے کے دو اوپری دانت بھی غائب تھے۔ عورت اور بچے اس کے لئے سہل شکار ہوتے تھے۔ اس میں اس کی معذوری کو دخل تھا مگر جب اس کی دہشت چار دانگ پھیلی تھی تو آس پاس کے بستی والوں نے اپنی آنکھوں سے اس آدم خور شیرنی کو انسانوں پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ مگر اس آدم خور کو تو ابھی تک کوئی انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکی تھی جبکہ ماگھ پتی کا یہ آدم خور اب تک سو سے زائد معصوم انسانوں کو ہلاک کر چکا ہے۔"

مسٹر ہیریسن اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے اور پائپ کے گہرے کش لینے لگے۔ پھر ہماری گفتگو میں سری واستو اور کلدیپ بھی شامل ہو گئے۔ مسز ہیریسن کو اپنے کمرے میں محدود رہنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ مہاراج ماگھ پتی کا مرسل کردہ دھرم پالی ہمارے سامنے مؤدبانہ ہاتھ باندھے حکم کا غلام بنا کھڑا تھا...... میں اچانک اس سے مخاطب ہوا۔

"مرلی......!"

"جی لالہ......!"

"یہ بتاؤ اس آدم خور کو کیا واقعی اب تک کسی نے نہیں دیکھا ہے؟"

"نہیں لالہ! ساری پوروائی کیا، بلکہ آرے دوارے کسی منش نے آج تک اس دشت آدم خور کو نہیں دیکھا۔" مرلی نے بتایا۔

"اچھا......! یہ بتاؤ آخری بار اس آدم خور نے کس بدنصیب کو نشانہ بنایا اور کب؟" میں نے پوچھا۔

مرلی کچھ سوچ کر فوراً بولا۔ "ابھی دو دن پہلے کی بات ہے...... اُودھر رمنا گھاٹ پر نرملا کا پتی نریندر اس آدم خور کا نشانہ بنا ہے۔"

"تم ہمیں ابھی نرملا کے پاس لے چلو۔" میں نے کہا اور وہ فوراً تیار ہو گیا۔ پھر ہم سب اپنی شکاری رائفلوں کے ساتھ مرلی کے ساتھ نرملا کے گھر کی طرف چل پڑے۔

جنگل بہت گھنا تھا...... سہ پہر ہوتے ہی رات کا گماں ہونے لگا تھا۔ پرندوں کی چہکار تک معدوم تھی۔ ایک ہولناک سناٹا تھا جو ہر سُو چھایا ہوا تھا...... جا بجا بانس کے پودے اور چوڑے پتوں والے قد آدم درختوں کی بہتات تھی۔ اس پر مستزاد کاندھوں تک خودرو جھاڑیاں بھی حائل تھیں مگر ہم سب اس پراسرار آدم خور کی سرکوبی کے جوشِ فروزاں میں مبتلا مرلی کے پیچھے پیچھے بلاخوف چلے جا رہے تھے۔

دفعتہً میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ پورب کی طرف ساٹھ میٹر کے فاصلے پر مجھے دو تین موٹے تنے والے لحیم شحیم اور کہنہ سال برگدوں کے قدرتی سنگم کی عین بلندی پر مچان نما ایک جھونپڑی دکھائی دی۔

اک لمحے کو میرا ذہن چونکا...... کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس عجیب و غریب ساخت کی جھونپڑی کی طرف ضرور کشاں کشاں قدم بڑھاتا مگر اس وقت مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی مگر میں نے چلتے چلتے پھر بھی مرلی سے اس ویرانے میں بنی جھونپڑی کے بارے میں ضرور پوچھا۔ اس نے بتایا۔

"لالہ جی! یہاں رہتا ہے ایک پاگل...... خود کو بڑا ماہر شکاری کہتا ہے...... پر اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں اس کے پاس جو رائفل ہے، وہ سکے والی ہے جو اس نے پاگل ہونے کے باوجود اب تک نہیں چلائی۔"

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس مچان نما جھونپڑی سے ایک مجہول سا شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں قدیم ساختہ رائفل دبی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی بری طرح ٹھٹکا...... یہ وہی پاگل شکاری تھا جسے میں نے گزشتہ دھواں دھار برستی شب میں اپنے بنگلے کے

کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا اور پھر جس طرح اچانک نظر آیا تھا، وہ اسی طرح پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔

اب میں ذرا رک کر اس کی طرف بغور دیکھے جا رہا تھا۔ جھکے جھکے کاندھے، کھچڑی سے بال اور چہرے پر پراسراریت کے علاوہ اس کی آنکھوں میں عجیب وحشیانہ سی چمک ہویدا تھی۔ جانے کیوں اس کی وضع قطع کو بغور دیکھ کر جسم میں جھرجھری سی پیدا ہو جاتی تھی۔

''چلیں لالہ جی! وہ لوگ آگے نکل گئے ہیں۔'' معاً مرلی نے مجھے ٹھوکا دیا اور میں اس پراسرار اور جھکی شکاری کی جانب سے نظریں ہٹا کر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک جھونپڑ بستی میں داخل ہو گئے۔ یہاں جابجا ڈھلوانی چھتوں والی کھپریل اور کھجوروں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ غربت کی ماری بستی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے ننگ دھڑنگ اور اِدھر اُدھر کھیلتے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ مردوں کے اوپری جسم بالکل برہنہ اور نیچے میلی چیکٹ دھوتی تھی۔ پسلیاں صاف نظر آ رہی تھیں اور رنگت بالکل سیاہ تھی۔ عورتیں اور لڑکی بالیاں بھی سستی سی سوتی ساڑھیوں اور مختصر سے دھانی بلاؤز میں ملبوس تھیں۔

بہرطور ہم سب رمنا گھاٹ کے قریب واقع نریندر کی بدنصیب ودھوا نرملا کے پاس پہنچے...... اس بیچاری کی حالت دیکھ کر ہمارا دل پسیج گیا...... ہم جھونپڑی کی چوکھٹ پر ہی کھڑے رہ گئے تھے جہاں پردے کے طور پر مستعمل ایک چیتھڑا ٹاٹ جھول رہا تھا۔

''نرملا...... ذرا باہر آ...... صاحب آئے ہیں...... کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تم سے۔''

مرلی نے قدرے اونچی آواز میں جھولتے ہوئے ٹاٹ کی طرف منہ کر کے نرملا کو پکارا۔

اندر سے ایک بچے کو گود میں اٹھائے تیس پینتیس سالہ گہری رنگت کی ایک عورت برآمد ہوئی...... اس کی آنکھیں متورم اور چہرہ گہری اُداسی کا غماض تھا...... یہ عمر اس کی بیوگی کی نہ تھی...... ایسے میں تین چار...... شاید اس سے بھی زیادہ بچوں کی فوج ظفر موج بھی ساتھ ہو۔ کیونکہ اندر سے ذرا دیر بعد ہی کئی ننگ دھڑنگ بچے اس عورت کے پیچھے نمودار ہوئے تھے اور اپنی معصومانہ آنکھوں میں حیرت سموئے ہمیں ٹکر ٹکر گھورے جا رہے تھے۔

بدنصیب نرملا نے میلے پلو سے اپنا چہرہ پونچھا اور ہماری طرف خاموش نگاہوں سے تکنے لگی۔ ایسے میں سری واستو نے آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہو کر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''بہن جی......! ہمیں آپ کے پتی کا افسوس ہوا...... جو بھگوان کو منظور...... ہم آپ کے دُکھ میں برابر کے شریک ہیں...... ہم اس آدم خور کو ہلاک کرنے ہی اس علاقے میں آئے ہیں...... کیا تم ہمیں اس واقعہ کی تھوڑی تفصیل بتا سکو گی؟''

اس عورت کی آنکھیں جھلملا سی گئیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب بتانے میں اسے گہرے دُکھ کی پھر وہی کڑوی گولی نگلنی پڑ رہی تھی مگر یہ سب بھی ضروری تھا...... کم از کم اس آدم خور کا جلد از جلد خاتمہ تو ممکن ہو سکتا تھا تاکہ وہ پھر کسی کو اپنے خونی پنجوں کا نشانہ نہ بنا سکے۔

''جی...... میں گھاٹ پر کپڑے دھو رہی تھی۔'' اس نے افسردہ سے انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''میرا پتی جنگل میں مہاراج بابو کی بھیڑیں چرانے گیا ہوا تھا۔ وہیں اس آدم خور نے حملہ کر کے میرے پتی کو......'' اتنا بتاتے ہوئے اس بیچاری کا جی بھر آیا اور وہ پلو منہ میں دبا کر سسکنے لگی۔

''اس آدم خور کو کسی نے دیکھا بھی تھا......؟'' میں نے ذرا دیر بعد پوچھا۔

''نہیں......'' نرملا نے خود پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔ ''میرے پتی کی اُدھڑی ہوئی لاش دیکھی تھی۔ پوروائی کے سبھی لوگوں نے یہی کہا کہ میرا پتی اس آدم خور کے خونی پنجوں کا شکار ہوا ہے۔''

''لیکن آس پاس کسی نے اس آدم خور کے پنجوں کے نشان تو دیکھنے کی کوشش کی ہو گی۔'' اس بار کلدیپ نے بدنصیب عورت سے پوچھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، اچانک پورے گاؤں میں ''آدم خور آیا...... آدم خور آیا'' کا شور مچ گیا۔

اس شور پر ہم سب بری طرح ٹھٹھک گئے۔ نرملا بیچاری دہشت زدہ ہو کر اپنے بچوں کو مرغی کی طرح اپنے پروں میں چھپا کر جھونپڑی کے اندر بھاگ گئی۔

ہم سب چند ثانئے ہکا بکا ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پوری آبادی میں ایک غدر سا مچ گیا...... ایسی بھگدڑ مچ گئی تھی کہ ہر کوئی دہشت زدہ ہو کر اپنے ٹھکانوں کی طرف

دوڑ رہا تھا...... میرا دل زور زور سے دھڑ دھڑانے لگا۔

کرنل ہیریسن، کلدیپ اور سری واستو کے چہروں پر ایکا ایکی چوکنا پن کھنڈ آیا تھا۔ مگر بے چارہ مرلی اس افتادِ ناگہانی پر سراسیمہ ہونے لگا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسا آدم خور تھا جو یوں دندناتا ہوا آبادی میں گھس آیا تھا۔ آثار تو یہی بتا رہے تھے جیسے یہ آدم خور کسی بھیانک بلا کی طرح یہاں آن وارد ہوا تھا۔

بالآخر میں نے ذرا ہمت کر کے قریب سے دوڑتے ہوئے ایک دہشت زدہ شخص کو روکتے ہوئے پوچھا۔ ''اے بھائی! کچھ تو بتاؤ...... وہ آدم خور ہے کدھر؟ ہم اسے ابھی ہلاک کر ڈالیں گے۔''

میری بات سن کر اس نے بمشکل ہانپتے ہوئے بتایا کہ جنگل کی سمت انہیں آدم خور کی جھلک نظر آئی جہاں جہاں اس نے کسی آتو نامی شخص کا نرخرہ دبوچ لیا ہے۔

بس پھر کیا تھا...... ہم سب اپنی اپنی شکاری رائفلیں اٹھائے مذکورہ سمت کی طرف دوڑے...... آدم خور کو دیکھنے کے جوش سے میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی تھی کیونکہ اس آدم خور کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ آدم خور آتو نامی اس بدنصیب شخص کو بھنبھوڑ کر شکم سیری میں مصروف تھا۔

ہم طوفانی رفتار سے رائفلیں اٹھائے اس مقام کی طرف دوڑ پڑے۔ میرے دل میں اس پراسرار آدم خور کو ہلاک کرنے سے کہیں زیادہ اسے دیکھنے کی خواہش شدت سے ابھری تھی۔

اس پراسرار آدم خور کو نابود کرنے کا سب سے زیادہ جوش کرنل ہیری سن میں اور دیکھنے کا اشتیاق مجھ میں پایا جاتا تھا۔ وہی سب سے آگے دوڑے تھے۔ اس کے بعد میں تھا اور میرے پیچھے کلدیپ اور سری واستو...... بے چارہ مرلی (دھرپالی) تو خوف سے پہلے ہی کہیں ''سٹک'' گیا تھا۔

جائے وقوعہ تک پہنچنے میں ہمیں بمشکل پندرہ منٹ لگے تھے...... وہ جگہ ایک پہاڑی چشمے کے قریب تھی...... یہاں قد آدم خودرو جھاڑیوں کے علاوہ ملیلا اور کاڑ کے درختوں کی بہتات تھی...... میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہا تھا...... یہی حالت باقی تینوں کی بھی تھی...... یہاں پہنچ کر ہم چاروں رک گئے تھے

اور چوکنا نظروں سے بہتے چشمے کے قدرتی موڑ کی طرف بغور دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فضا میں سوائے بہتے چشمے کی قل قل کے سوا کوئی آواز نہ تھی، مذکورہ سمت ہمیں کچھ نظر نہیں آیا۔

ہم سب جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ہمیں آدم خور اپنے ''شکار'' سمیت کہیں دکھائی نہیں دیا۔

''کسی نے ہمارے ساتھ کھلواڑ تو نہیں کیا؟''

یہ کلدیپ تھا...... اس کی سرگوشی میں ڈوبی ہوئی آواز چند قدم آگے متلاشی نظریں دوڑاتے ہوئے کرنل ہیری سن کو کھل گئی...... اس نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی...... میں نے اپنی رائفل چوکنا انداز میں سنبھال رکھی تھی۔

پھر اچانک میں نے کرنل ہیری سن کو قدرے ٹھٹکتے ہوئے دیکھا...... اس کے ساکت و صامت وجود میں ایک غیر محسوس سی جنبش پیدا ہوئی تھی...... وہ بار بار ہماری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے ہمیں ذرا بھی آواز نہ پیدا کرنے کی مسلسل تلقین کیے جا رہا تھا۔

چند لمحوں بعد کرنل ہیری سن ہمیں اپنی جگہوں پر دبکے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود آگے سرک گیا۔

''یہ کدھر کو ہولیا؟'' اس بار سری واستو بھی چپ نہ رہ سکا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔

میں نے جل کر کہا...... ''مجھے کیا معلوم......؟''

''لگتا ہے اس انگریز نے...... آدم خور کے سانسوں کی بازگشت سن لی ہے......''

کلدیپ کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر میرے جی میں آئی کہ میں بھی کرنل ہیری سن کے عقب میں بڑھنے لگا تو...... میرے پیچھے کلدیپ اور سری واستو نے بھی قدم آگے بڑھا دیئے۔

میری چوکنا اور متلاشی نظریں...... اس سمت میں جم کر رہ گئیں جدھر قد آدم جھاڑیوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ٹھٹکے ہوئے انداز میں آگے بڑھتے ہوئے کرنل

ہیری سن کے متعلق سوچا...... جو ہمیں یہ بتائے بغیر خاموشی سے نامعلوم مقام کی طرف بڑھ گیا تھا...... آخر اسے ایسا کیا محسوس ہوا تھا؟

ابھی...... میں گھنے جھنڈ کے ڈھینگروں سے ذرا فاصلے پر ہی تھا کہ معاً میرے قدم ایک عجیب سی آواز پر رک گئے۔ پہلے تو اس آواز پر ہی میری روح فنا ہو گئی تھی...... کیونکہ شروع میں یہ آواز ایسی محسوس ہوئی تھی جیسے کوئی خشک پتوں پر چل رہا ہو...... چرمراتے پتوں کی ہلکی سرسراہٹ آمیز آواز سے میں نے یہی سمجھا تھا کہ کہیں پراسرار آدم خور میری گھات میں تو نہیں آ رہا تھا؟ مگر پھر دوسرے ہی لمحے جب ذرا ٹھہر کر میں نے شکارانہ یکسوئی کے ساتھ اس ہلکی ہلکی ابھرنے والی آواز پر کان دھرے تو مجھے اپنے اس خوفناک خدشے کو رد کرنا پڑا کہ کوئی درندہ میری گھات میں بیٹھا تھا۔

یہ آواز...... ایک مخصوص تواتر کے ساتھ ابھر رہی تھی اور جدھر کرنل ہیریسن رخ کر رہا تھا، مجھے آواز ادھر ہی سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

گوش بر آواز ہونے پر ایسا لگا جیسے کوئی درندہ اپنا شکار اپنے آہنی جبڑوں تلے دبا کر کچ کچاتے ہوئے چبا رہا ہو۔

غالباً یہی وہ آواز تھی جسے محسوس کرتے ہوئے کرنل ہیریسن اپنا نام روشن کرنے کی نیت سے آگے بڑھا تھا...... اس کی خواہش یقیناً اس طرح ہو گی کہ وہ اس مصروف اور پراسرار ان دیکھے آدم خور کو تن تنہا خود ہلاک کرے۔ مگر یہ خواہش اسے مہنگی پڑتی۔

کیونکہ اسی لمحے...... اچانک گوشت چبانے کی آتی ہوئی متواتر آواز...... یک دم رک گئی...... اور ایک ہلکی سی غراہٹ ابھری تھی۔

میری ٹھٹکی ہوئی نظریں ڈھینگروں پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آگے بڑھوں یا راستہ بدلنے کی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے پیش قدمی کروں۔

اچانک...... گولی چلنے کی کان پھاڑ آواز سنائی دی...... میں ٹھٹک کر ذرا جھجک گیا۔ میرے عقب میں کلدیپ اور سری واستو تھے جو زمین پر لیٹ گئے تھے...... تاہم انہوں نے کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اپنی رائفلیں ضرور تان رکھی تھیں اور انہیں ایک دم ریڈی حالت میں کر دیا تھا۔

یہ کرنل ہیریسن کی پانچ سو بور کا بھاری بھرکم فائر تھا۔ جس کی گولی ایک اچھے خاصے

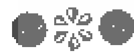
ہاتھی کی کھوپڑی چٹخا دینے کے لئے کافی تھی۔ فائر کے گونج دار دھماکے سے پورا جنگل چھوٹے موٹے چرند پرند کی شور آمیز چہکار سے گونج اٹھا تھا۔

مگر...... فائر کے اگلے ہی لمحے...... میرے کانوں سے ایک دھاڑ کی آواز ٹکرائی...... اس دھاڑ میں مجھے کسی قسم کی کربنا کی کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا تھا۔ ایک ہولناک تصور سے میں کانپ اٹھا۔

''کیا...... کرنل ہیری سن کا نشانہ خطا ہو گیا تھا؟''

نشانہ خطا جانے کا مطلب شکاری کی واضح موت تھا۔ اس مخدوش صورتحال کے زیر اثر اچانک میں نے اپنے اندر ایک انوکھا جذبہ محسوس کیا...... ویسا ہی جذبہ...... جیسا کچھ عرصہ پہلے...... انڈر سیکرٹری مسٹر نارمن کو...... آدم خور کے چنگل سے بچاتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

بس پھر کیا تھا، میں نے رائفل تانی اور...... اندھا دھند ڈھینگروں کی طرف بڑھا...... اسی لمحے پھر دھماکا سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہولناک انسانی چیخ سے میں خود دہل کر رہ گیا...... یہ چیخ...... کرنل ہیریسن کی تھی......!



اگلے ہی لمحے کچھ ایسی غراہٹ آمیز اور انسانی کراہوں کی ملی جلی چیخیں سنائی دینے لگیں جیسے کوئی درندہ اور انسان آپس میں گتھم گتھا ہوں۔ میں نے چھلانگ لگا کر ڈھینگروں کو پار کیا تو سامنے...... نظر پڑتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ایک لمبا چوڑا گلدار تھا جو کرنل ہیری سن کے ساتھ گتھم گتھا تھا اور اسے پھاڑ کھانے کے چکر میں تھا۔ کرنل ہیریسن مقدور بھر خود کو اس کے خوفناک دانتوں...... تیز نوکیلے پنجوں سے بچانے کی جان توڑ کوشش میں مصروف تھا۔ اس کوشش میں...... ان کا لباس...... جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور پھٹے ہوئے گوشوں سے خون کے سرخ سرخ دھبے بھی واضح نظر آ رہے تھے۔

میں جانتا تھا...... کرنل ہیری سن...... زیادہ دیر اس آدم خور اور غیر معمولی طاقتور اور لحیم شحیم گلدار کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے...... اور جلد ہی...... اس کی خونخواری کا شکار ہو جائیں گے۔ لیکن یہ صورتحال ایسی تھی کہ ''پائے رفتن نہ جائے ماندن'' والی بات صادق

آتی تھی مگر اس طرح محو تماشا بھی تو نہ رہا جا سکتا تھا۔ ایسے میں اچانک میری چشمِ تصور میں کرنل ہیریسن کی خوش ادا اور دلکش بیوی کا چہرہ رقصاں ہو گیا جو ادھر ماگھیتی کے بنگلے میں بیٹی سوئیٹر بُن رہی ہو گی۔

تب پھر اچانک میں نے اللہ جل شانہ کا نام لے کر گلدار کی توجہ ہٹانے کے لئے پہلے ایک ہوائی فائر کیا۔ میری خوش کن آمیز توقع کے عین مطابق گلدار نے فوراً میری طرف خونخوار آنکھوں سے گھورتے ہوئے دیکھا اور بڑے خوفناک انداز میں غرایا...... مگر اس نے ابھی تک اپنے اگلے دونوں پنجوں میں کرنل ہیریسن کو دبوچ رکھا تھا...... کرنل کے حلق سے اب گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہو رہی تھی۔ اس لمحے جب گلدار مجھ پر حملہ کرنے، نہ کرنے کی کشش و پنج میں مبتلا تھا تو ایسے میں، میں نے اس کی پیٹھ کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔

گلدار کی پشت والا حصہ ایسی حالت میں تھا کہ اگر خدانخواستہ میرا نشانہ خطا بھی چلا جاتا تو گولی کرنل ہیریسن کے جسم میں پیوست ہونے کی بجائے زمین میں دھنس جاتی۔ اگر چہ میرے محتاط اندازے کے مطابق نشانہ خطا جانے کا امکان کم ہی تھا۔ میرا اور اس گلدار آدم خور کا درمیانی فاصلہ صرف پندرہ سولہ گز تھا۔

بہرطور میری ایکسپریس رائفل نے دھاکے سے شعلہ اُگلا۔ گولی خاطر خواہ نشانے پر لگی۔ گولی کھا کر گلداز تیز غراہٹ کے ساتھ اچھلا تھا۔ اس اثناء میں کرنل ہیریسن نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر لیٹے لیٹے ہی لوٹ لگائی اور گلدار کے حلقۂ گرفت سے کافی دور نکل گیا۔

گلدار زخمی حالت میں جیسے ہی زمین پر آیا، میں نے دوبارہ اس کی پیشانی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ نشانہ محض اس حد تک خطا گیا کہ اس کی پیشانی پر گولی لگنے کی بجائے اگلی دونوں ٹانگوں کے درمیان جا لگی اور اس بار وہ کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

”بدھائی ہو...... بدھائی ہو...... ذاکر حسین صاحب...... بڑا پالا مارا ہے۔“

میرے عقب سے سری واستو اور کلدیپ نے کھلکھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

مگر میں فوراً کرنل ہیریسن کی طرف بڑھا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ بلاشبہ وہ بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ بال بال موت کے پنجے سے بچے کہ انہیں معمولی

زخم آئے تھے۔ میں نے ان کی صورت پہ عجیب سی مایوسی کی جھلک دیکھی۔

”کیسے ہیں کرنل صاحب؟ زیادہ گھائل تو نہیں ہوئے؟“ میں نے قریب پہنچ کر ازراہِ ہمدردی پوچھا تو وہ اپنے چہرے پر ممنونیت کے آثار طاری کرتے ہوئے بولے۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ...... اگر تم نہیں آتے تو آج اس گلدار نے میرا کام تمام کر دیا ہوتا۔“

”زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے سر۔ اوپر والا ہی کسی انسان کو دوسرے کے لئے نجات کا وسیلہ بناتا ہے۔“ میں نے کسرِ نفسی سے کہا۔ تاہم میں نے محسوس کیا ان کے چہرے پر کسی تکلیف کے آثار کی بجائے عجیب سی خاموش کھنڈی ہوئی ہے۔

میرا رواں رواں خوشی سے جھوم رہا تھا کہ میں نے اتنے بڑے آدم خور کا بالآخر خاتمہ کر ڈالا تھا جس نے پراسرار بن کر پورے علاقے میں ایک عرصے سے دہشت مچا رکھی تھی۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی کہ کلدیپ، سری واستو کی طرح کرنل ہیریسن نے مجھے اب تک میرے ہاتھوں آدم خور کے ہلاک ہونے کی مبارکباد نہیں دی تھی۔ کیا وہ اتنا ہی تنگ نظر تھا اور اسے جلن ہو رہی تھی کہ یہ آدم خور اس کے ہاتھوں کی بجائے میرے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ میں نے سوچا۔

اگلے ہی لمحے کرنل ہیریسن نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ”ویری بیڈ...... آدم خور نکل گیا۔“

کرنل کی بات سن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا...... کلدیپ اور سری واستو نے بھی کرنل کی بات سمجھ کر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر کلدیپ سے نہ رہا گیا اور وہ گلدار کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”کرنل صاحب، آدم خور کو تو اپنے ذاکر حسین صاحب نے ختم کر ڈالا، آپ اب کس آدم خور کی بات کر رہے ہیں؟“

اس کی بات سن کر کرنل کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اصل آدم خور نکل بھاگا ہے۔“ کرنل ہیریسن نے بڑے سکون کے ساتھ کہا۔ ”میں نے سب سے پہلے اس پر ہی گولی چلائی تھی مگر اس سے پہلے جاتے یہ کم بخت گلدار کدھر سے آن ٹپکا اور......“

'' مگر کرنل صاحب...... اس کا ثبوت کیا ہے کہ اصل آدم خور وہی تھا جو آپ کی پہلی گولی کا نشانہ بنے بغیر بھاگ نکلا اور یہ گلدار......؟'' میں نے سوالیہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا...... حقیقت یہ تھی کہ کرنل کی بات نے مجھے مایوس کر ڈالا تھا۔

'' آؤ میرے ساتھ، تمہیں اس کا ثبوت دیتا ہوں مسٹر ذاکر حسین۔'' کرنل نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور پھر اپنے زخموں پر ہاتھ رکھتے ہوئے چند قدم بڑھ کر تاڑ کے جھنڈ کے پاس پہنچا تو یک دم میں ڈھل کر رہ گیا۔

سامنے جھاڑیوں میں کسی بدنصیب انسان کی آدھ کھائی لاش کی جھلک نظر آئی...... میں ناک پر رومال رکھ کر آگے بڑھا۔ پھر جھک کر آدم خور کے پیروں کے نشانات کے ساتھ چند قدم آگے بڑھا اور پھر ایک طویل گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کرنل ہیریسن نے غلط نہیں کہا تھا۔

بہرطور ہم نے کرنل ہیریسن کی زخمی حالت کے پیش نظر آدم خور کا تعاقب ملتوی کر دیا اور واپس بنگلے میں آ گئے۔



کرنل ہیریسن اب روبہ صحت تھے۔ انہوں نے میرے استفسار پر بتایا تھا کہ وہ اس پراسرار آم خور کی جھلک دیکھ چکے تھے۔ وہ ایک انتہائی خوفناک سیاہ رنگ کا شیر تھا...... جس کی چمکدار آنکھوں میں بلا کی درندگی اور چکنے جسم میں عجیب پراسراریت سی محسوس ہوتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل تب بھی اس پراسرار دہشت ناک آدم خور کو دیکھے بغیر مان نہیں رہا تھا۔

یہ دو دن بعد کا ذکر تھا۔

موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی مگر اس کا زور جلد ہی ٹوٹ گیا۔ ہردوڑ اور چکرونتہ کے جنگل دھل کر نکھر گئے تھے۔ سرخ اور منقش کلغیوں والے جنگلی مرغوں کی ککڑوں کی آواز سے جنگل میں خوش الحانی سی بکھری ہوئی تھی۔ اس دن ہم نے آدم خور کی سرکوبی کے لئے اپنی مہم کا ارادہ ترک کر ڈالا اور بنگلے میں ہی محبوس ہو کر رہ گئے۔

رات کے بارہ بجے کا عمل ہو گا۔ رات کا کھانا اکٹھے کھانے کے بعد گھنٹہ بھر باتیں کرنے اور چائے پیتے رہنے کے بعد کرنل ہیریسن اپنا پائپ سلگاتے ہوئے گڈ نائٹ

کہہ کر اپنی بیگم کے ساتھ بیڈ روم میں چلے گئے۔

پھر کلدیپ اور سری واستو بھی جمائیاں لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے...... ناچار میں بھی اپنے کمرے میں آ کر سنگل بیڈ کے بستر پر دراز ہو گیا۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

نیند میری آنکھوں سے ابھی کوسوں دور تھی۔ میں بیڈ پر اپنے دونوں ہاتھوں کا سرہانہ بنائے...... نیم دراز تھا۔ میری نظروں کے عین سامنے...... کھڑکی تھی، جو باہر جنگل میں کھلتی تھی۔ اس پر باہر سے آہنی گرل اور اندر شیشے لگے ہوئے تھے۔

یہ علاقہ بارانی تھا۔ ہر سمے آسمان پر بادل چھائے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ چودھویں کا پورا چاند بھی بدلیوں کے پیچھے ایک ذرا سی روشنی کی جھلک دکھا کر دوبارہ چھپ جاتا۔

میں آج والے واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ پراسرار آدم خور ہمارے ہاتھوں صاف بچ نکلا تھا...... مزید برآں کرنل ہیریسن بھی ایک خطرناک درندے...... گلدار کے خونی پنجوں سے بال بال بچا تھا۔ تاہم ہماری یہ کامیابی کیا کم تھی کہ اب وہ پراسرار آدم خور ہماری نظروں میں آ گیا تھا جس کا سہرا کرنل ہیریسن کے سر جاتا تھا۔

میں ابھی اپنی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اچانک میں نے غیر ارادی طور پر کھڑکی سے باہر تاریکی میں ایک سایہ دیکھا۔ یہ کسی انسان کا سایہ تھا...... میں چونک کر اٹھا...... کھڑکی تک آیا...... دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی کا ایک پٹ کھولا۔ ذرا باہر سر نکالا۔ مرطوب ہوا کا ٹھٹھرا دینے والا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تھا...... نجانے کیوں مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

یہ سایہ اب بھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے خدوخال کچھ کچھ واضح ہونے لگے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت پورا چاند بادل کے ایک ٹکڑے سے جھانکا تھا۔

میں اسے پہچان کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔ وہ پراسرار اور مجہول سا جھکی شکاری تھا۔ سر، داڑھی کے بال کھچڑی سے...... پرانا خاکی نیکر اور اسی رنگ کی قمیص پہنے...... گھنی سفیدی مائل بھنوؤں سے ڈھکی آنکھیں اور بھاری بھرکم چہرہ...... اس کے ایک ہاتھ میں سکے والی بندوق تھی...... وہ اب بنگلے کے بیرونی دروازے پر کھڑا دستک دینے کے لئے پر تول رہا تھا...... میرے جی میں جانے کیا آئی کہ میں جلدی سے اپنے کمرے سے نکلا، بیرونی

دروازہ کھولنے کے لئے لپکا...... تا کہ اس جھکی بڈھے شکاری کو نہ صرف قریب سے دیکھوں...... بلکہ اس کے آنے کا مقصد بھی دریافت کروں۔ یہ سوچ کر میں نے جلدی سے بے آواز انداز میں دروازہ کھول دیا۔

اگلے ہی لمحے سامنے نظر پڑتے ہی میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ ایک عجیب سے خوف کی لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ کافی دیر تک سامنے اندھیروں میں آنکھیں پھاڑے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا...... وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے اب شدید حیرت کا سامنا تھا۔

''...... کدھر گیا یہ......؟'' میں نے حیرت سے زیرلب خود کلامی کی۔ مجھے کمرے سے بیرونی دروازے تک آتے میں مشکل سے دس سیکنڈ بھی نہیں لگے ہوں گے...... اتنے کم وقفے میں یہ بوڑھا جھکی کدھر چلا گیا تھا۔

اس واقعہ نے میری رگِ تجسّس کو اور مہمیز کیا اور میں اسے تلاش کرنے کا پکا تہیہ کر کے باہر نکلا۔ اگلے آٹھ، دس سیکنڈ میں...... بنگلے سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے ٹارچ اور اپنی ایکسپریس رائفل اٹھا لی تھی...... باہر نکل کر میں نے دائیں بائیں تاریکی میں ٹارچ روشن کر کے اس کے دائرے کو چاروں طرف حرکت دی...... دور نزدیک...... مگر سوائے گھنے چھتنار درختوں اور...... قد آدم خود رو جھاڑیوں کے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا...... البتہ ان جھاڑیوں میں چھوٹے موٹے ڈرے سہمے جانوروں کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی ہوئی ضرور دکھائی دی تھیں۔ میں نے بے اختیار نیچے دیکھا تو جیسے میری دلی مراد بر آئی۔

زمین میں...... اس پراسرار شکاری کے بڑے بڑے جوتوں کے نشانات موجود تھے...... اب میرے وہم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا...... کو اس جھکی شکاری کے اچانک نظر آ کر غائب ہونے پر تھوڑی دیر پہلے میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا...... پراسرار شکاری تھوڑی دیر پہلے ادھر موجود تھا اور بیرونی دروازے تک بھی آیا تھا...... مگر پھر اچانک ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔

وہ ایک دم کہاں غائب ہو گیا تھا؟ یہ وہ پراسرار سوال تھا جو میرے اندر کی ہیبت ناکی کو ہی نہیں بلکہ میرے فطری تجسّس کو بھی بڑھانے کا باعث بن رہا تھا۔

بہرطور...... میں نے قدموں کے نشانات کے ذریعے اس شکاری کا تعاقب کرنے کے ارادے سے آگے قدم بڑھا دیئے۔

چہار اطراف ہُو کا عالم تھا...... پورا جنگل جیسے بھیدوں بھری خاموشی میں غرق تھا۔ رات کے اس آخری پہر میں...... میرا یوں ایک پراسرار شخص کا تعاقب کرنا یقیناً خطرے سے خالی نہ تھا۔ یہ جنگل ہر قسم کے درندوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی نہیں...... یہاں تک کہ زہریلے سانپوں کے علاوہ بعض چھوٹے موٹے کیڑوں...... جن میں مکڑی اور گولا پٹھ نسل کے حشرات الارض بھی کم خطرناک نہ تھے...... اگرچہ میں نے پیروں میں لانگ بوٹ چڑھا رکھے تھے، لیکن پھر بھی مجھے ان سب کا خطرہ تھا...... مگر میں بھی ہٹ کا پکا تھا۔ اس پراسرار شکاری کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔ لہٰذا قدموں کے نشانات پر ٹارچ کی روشنی کے ذریعے آگے بڑھنے لگا۔

اس وقت مجھے شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب میں نے دیکھا کہ پیروں کے نشانات بنگلے کے چاروں طرف دو چکر مکمل کرنے کے بعد اندر تاریک جنگل کی طرف ہو لئے تھے جس کا مطلب تھا اس پراسرار شکاری نے بنگلے کے گرد دو مرتبہ طواف کیا تھا اور پھر خاموشی سے چلا گیا تھا۔

میں دل مضبوط کئے ہیبت ناک گھنے تاریک جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔ کافی دور چلتے رہنے کے بعد اچانک مجھے سامنے مدھم روشنی میں اس بوڑھے شکاری کی پراسرار آماجگاہ دکھائی دی جو برگد کے دو تین گھنے اور موٹے تنوں کے قدرتی ملاپ سے بنے خاصے وسیع جھنڈ پر مچان نما جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔

آسمان پر اب آوارہ بادلوں کے ٹکڑے دھیرے دھیرے سرکنے لگے تھے اور آسمان قدرے صاف اور روشن نظر آنے لگا تھا۔ پورن ماشی کے پورے چاند کی روشنی جنگل کے چھتنار پیڑوں سے چھن کر برسات کی طرح اس جھونپڑی پر پڑ رہی تھی۔

میں قریب پہنچ کر ایک درخت کے تنے کی آڑ میں دبک کر کھڑا ہو گیا اور سامنے نظریں جما دیں۔ سرکنڈوں کی یہ عجیب وضع کی جھونپڑی ویران تھی۔ صرف ایک شاخوں سے بنائی ہوئی رسی کی سیڑھیاں نیچے جھول رہی تھیں۔

اچانک میں نے کہیں قریب ہی ایک غراہٹ سنی...... میرا دل یکبارگی زور سے

دھڑکا کہ میری نظر لگ بھگ چھ فٹ کے ایک سیاہ شیر پر پڑی...... وہ ڈھائی فٹ کے قریب چوڑا تھا اور اس کا سارا جسم کوے کی طرح سیاہ تھا...... یہ چیتے اور شیر کی بیچ کی نسل کا بڑا خطرناک اور خوفناک درندہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب ناک چمک تھی۔ اس کا رخ جھونپڑی کی طرف تھا۔

وہ...... درندہ میری طرف متوجہ نہ تھا۔ لیکن اس کی ہیبت ناکی اس قدر مجھ پر طاری ہونے لگی کہ میری پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں اور پورے وجود میں سنسنی آمیز لرزش سی طاری ہوگئی تھی۔ تاہم اس درندے کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھلا تھا...... وہ پراسرار آدم خور کالا شیر تھا جس نے آس پاس کی آبادی میں دہشت مچا رکھی تھی اور نجانے کتنے ہی معصوم انسانوں کو اپنی بھوک کی بھینٹ چڑھا چکا تھا...... میں اُسے کبھی دیکھ تو نہ سکا...... البتہ آج کرنل ہیریسن نے اسے دیکھا تھا اور مجھے آگاہ کیا تھا...... ممکن ہے ایسی نسل کے ابھی شیر یہاں موجود ہوں۔

بہرطور...... اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ وہی آدم خور شیر ہی تھا یا کوئی دوسرا عام درندہ تھا۔

میں نے دیکھا، وہ جھونپڑی والے درخت کے قریب آ کر رک گیا۔ مجھے فوراً اس خدشے نے آ لیا کہ کہیں اوپر جھونپڑی میں موجود...... یہ شیر، اس بوڑھے شکاری کو نہ ہڑپ کر جائے۔ اگرچہ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ وہ شکاری اوپر موجود بھی تھا یا نہیں۔ پھر ٹھیک اسی وقت میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے اس کالے شیر نے ایک جست بھری اور جنگلی بلی کی طرح اوپر چڑھ گیا۔ میں دل میں یہی دعا مانگنے لگا کہ خدا کرے وہ شکاری اوپر جھونپڑی میں موجود نہ ہو ورنہ اس آدم خور کا آسانی سے شکار ہو سکتا تھا...... لیکن ادھر اب میرے دل میں بھی جوش کی تمتماہٹ ابھرنے لگی اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... اپنی ایکسپریس رائفل سنبھالی اور درخت کی اوٹ سے نکل کر جھونپڑی کی طرف دوڑا...... میں نے سر اٹھا کر دیکھا...... وہ کالا شیر اب جھونپڑی کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ وہ بدنصیب بوڑھا اگر اندر موجود تھا تو اس کا مطلب تھا اسے اب آدم خور شیر سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ مگر میں ناامید نہ تھا اور نہ ہی جان کے معاملے میں یہ رسک لینا چاہتا تھا کہ اوپر جھونپڑی کے اندر وہ بوڑھا موجود تھا یا نہیں...... لہٰذا میں نے کالے شیر کو بھگانے کی خاطر ایکسپریس رائفل کے ہوا میں دو زوردار فائر کر

ڈالے۔

رات کے پہر سناٹے میں پورے جنگل کی گہری پُرسکوت چادر پر جیسے خنجر چل گیا۔

مگر دوسرے ہی لمحے میرے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

دھماکوں کی آوازیں سن کر اچانک جھونپڑی کے اندر سے وہ بوڑھا مجہول شکاری نکلا تھا اور خاصے غصے کے سے انداز میں اطراف میں نظر دوڑا رہا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے کچھ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کے آرام میں خلل پڑا ہو۔ میں اچنبھے کی سی حالت میں اس کی طرف تکے جا رہا تھا اور ورطۂ حیرت میں مبتلا تھا کہ یہ بوڑھا تو اتنے آرام سے کھڑا نظر آ رہا ہے جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ اس کے جھونپڑے کے اندر ایک خطرناک آدم خور در آیا تھا۔ اثنائے راہ اس کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ وہ برہمی کے انداز میں اوپر سے ہی چلایا۔

''اے...... کون ہو تم...... یہ فائرنگ کیوں کی تھی تم نے؟'' اس کے ہاتھ میں سکے والی قدیم ساختہ بندوق بھی نظر آ رہی تھی۔

مجھے اس کے لہجے پر غصہ تو آیا مگر قدرے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ ''میں نے ابھی ابھی ایک کالا شیر تمہاری جھونپڑی میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ یہ وہی آدم خور ہے جس نے اب تک تین سو سے زیادہ معصوم انسانوں کو ہڑپ کر لیا ہے۔''

میری بات سن کر وہ قدرے ٹھٹکا پھر عجیب بے ہنگم انداز میں قہقہہ بلند کیا اور قدرے مذاق اڑانے والے انداز میں چلا کر بولا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں زندہ سلامت تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔''

''نہیں...... میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے تمہاری جھونپڑی کے اندر داخل ہوتے دیکھا ہے۔'' میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''اچھا...... اچھا...... میں ابھی اندر دیکھ لیتا ہوں۔ ویسے تمہارا بہت بہت شکریہ......''

اس نے اپنا ایک ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور اندر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ برآمد ہوا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں اور میں سخت شش و پنج اور

حیرت میں مبتلا تھا کہ آخر وہ آدم خور خطرناک شیر کدھر چلا گیا۔

"یہاں میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ تم جاؤ...... ویسے تمہارا ایک بار پھر شکریہ۔"

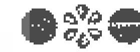
اس بوڑھے نے اس بار گویا جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا اور دوبارہ اندر چلا گیا۔

میں چند لمحے تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑا رہنے کے بعد واپس بنگلے کی طرف ہو لیا۔

"یہ کیسا معمہ تھا؟" اپنے بنگلے میں پہنچ کر جب میں بیڈ پر دراز ہوا تو میرا پورا وجود مجسم سوالیہ نشان تھا۔

میں کیسے اس بات کو جھٹلا سکتا تھا؟ جبکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس آدم خور کو جھونپڑی کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کہیں یہ بوڑھا جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا؟"

ایکا ایکی میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا مگر اس بوڑھے شکاری کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر ایک خوفناک اور خطرناک درندہ...... جھونپڑی کے اندر جا کر اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا؟



"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آدم خور اس جعلی بوڑھے کا پالتو ہوگا۔"

اگلے دن ناشتے کی میز پر میں نے جب اپنے تینوں ساتھی دوستوں کرنل ہیریسن، کلدیپ اور سری واستو کو شب گزشتہ سے متعلق اپنی پراسرار مہم کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا تو کرنل ہیریسن بری طرح چونکے تھے جبکہ میری کہانی پر کلدیپ نے فوراً اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت مسز ہیریسن بھی اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی ناشتے میں مصروف خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہی تھیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ہو نہ ہو...... اس آدم خور درندے کا اس بوڑھے سے ضرور کوئی تعلق ہے۔" سری واستو نے بھی کلدیپ کی بات سے اتفاق کیا مگر کرنل ہیری سن کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس لغویات پر بالکل یقین نہ ہو۔

حقیقت بھی یہی نظر آ رہی تھی ایک درندہ اور وہ بھی جسے انسانی خون کی عادت پڑ چکی ہو...... بھلا کہاں ایک انسان کا دوست یا پالتو ہو سکتا ہے؟ کرنل ہیریسن نے اگلے ہی لمحے فوراً کلدیپ اور سری واستو کی مضحکہ خیز باتوں کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"نو...... نیور...... خواہ مخواہ سیدھے سادھے واقعے کو پراسرار بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ رات کے وقت ایسے ماحول میں مسٹر ذاکر حسین کو ضرور وہم ہوا ہے۔"

"نہیں مسٹر ہیریسن......!" میں نے فوراً کرنل کی بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس واقعے کا بالکل اس طرح ہی یقین ہے جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا یقین...... میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس آدم خور کو اس بوڑھے کی جھونپڑی کی طرف زقند بھرتے اور اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔"

میری پُر یقین گفتگو پر لمحہ بھر کو سب کے چہروں پر خاموشی چھا گئی...... اور پھر دوبارہ اس موضوع پر گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کرنل ہیریسن، کلدیپ اور سری واستو اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔

ناشتے کے بعد ہم نے پھر جنگل کا قصد کیا۔ اس بار ہم نے اپنی اس شکاری مہم کو حتمی نتیجے پر پہنچانا تھا اس لئے کیمپنگ کا سامان بھی ہم نے لے لیا تھا۔ دو ملازم جن میں ایک مرلی بھی تھا کے ہمراہ جانب مہم ہوئے۔

ہم نے سب سے پہلے اس آدم خور کے تعاقب میں بوڑھے شکاری کے برگد والی جھونپڑی اور آس پاس کے علاقے کی طرف رخ کیا۔ اس بار جانے کیوں ہمارے چہروں پر غیر معمولی خاموشی اور سناٹے کی کیفیات طاری تھیں۔ دل میں نجانے کیسی بے چینی نے گھر کیا ہوا تھا۔ ایک نامعلوم سا خوف دل و دماغ میں کچھ اس طور طاری تھا جیسے آج کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آنے والا ہو۔ یہ شاید اس لئے تھا کہ ہم نے آج اپنی مہم کو آخری شکل دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ جب تک اس آدم خور کو نابود نہ کر ڈالیں، واپس نہیں لوٹیں گے۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ صرف بنگلے کے آرام دہ بیڈ رومز میں پڑے سگار پھونکنے سے **یہ معاملہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔** بہرطور...... **ہم سب چہروں پر اتھاہ خاموشی اور** دلوں میں انجانے خدشات تلے موہوم سا خوف لئے عازم مہم ہوئے۔ موسم خوشگوار تھا۔ ماہ اپریل کی دھوپ چھتنار اور چھدرے درختوں سے کرنوں کی صورت، جھاڑیوں اور جنگلی پودوں پر روشنی بکھیر رہی تھی۔

ہمارا رخ برگد والی جھونپڑی کی طرف تھا۔ آج ہمارا ارادہ اس پراسرار شکاری سے تفصیلی بات کرنے کا تھا جس کا ذمہ ظاہر ہے مجھے ہی سونپا گیا تھا۔

ہم جھونپڑے کے قریب پہنچ کر اوپر تکنے لگے۔ وہاں آس پاس ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ اوپر جھونپڑی میں وہ بوڑھا موجود بھی تھا یا نہیں...... بالآخر اسے پکارنے کا فریضہ مرلی نے سرانجام دیا اور آگے چند قدم بڑھا کر اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بناتے اس نے آواز لگائی۔

"لالہ جی!"

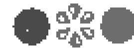
دو تین بار پکارنے کے باوجود جھونپڑی میں سناٹا طاری رہا تو ہم یہی سمجھے کہ وہاں کوئی نہیں...... لہٰذا ہم واپس پلٹ کر آگے ہو لئے۔ ابھی ہم بہ مشکل چند فرلانگ ہی چلے ہوں گے کہ اچانک ہمارے عقب سے غراہٹ سی ابھری۔ ہمارے قدم گڑ کے رہ گئے اور دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ ہمارے چلنے سے جو سرسراہٹ ابھر رہی تھی وہ یکلخت دم توڑ چکی تھی۔ لیکن عقبی سمت میں ابھی تک ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دبے پاؤں خشک پتوں پر چلتا ہوا ہمارے تعاقب میں آ رہا ہو۔ یہ وہی راستہ تھا جو اس بوڑھے کی برگد والی جھونپڑی کی طرف جاتا تھا۔

ہم چاروں ٹھٹک کر رک چکے تھے۔ پھر فوراً ہی ممکنہ خطرے کے پیش نظر ہم نے اپنی اپنی رائفلوں کے سیفٹی کیچ چڑھائے اور انہیں ایک دم ریڈی پوزیشن میں لے آئے۔ ابھی ہمیں ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک قریب ہی جھاڑیوں سے آدم خور سیاہ شیر نمودار ہوا...... ایک لمحے کو تو ہم اس کی دہشت سے بُت بنے رہ گئے مگر دوسرے ہی لمحے کرنل ہیریسن اور میں نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے رائفل والا ہاتھ بلند کیا۔ اسی لمحے سیاہ آدم خور نے کلدیپ پر جھپٹنے کے لئے چھلانگ لگائی اور ٹھیک اسی وقت میری اور کرنل ہیریسن کی شکاری رائفلوں نے دو شعلے اُگلے۔ فضا میں دو دھماکے ہوئے...... مگر ہمیں آدم خور کی دھاڑ کی بجائے ایک لرزہ خیز انسانی چیخ سنائی دی۔ یہ کلدیپ کی چیخ تھی...... جس کا مطلب تھا ہمارے نشانے خطا گئے تھے مگر آدم خور کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔

اس نے کلدیپ کا نرخرہ اپنے دانتوں تلے بھنبھوڑ ڈالا تھا...... سری واستو اپنی جگہ گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ باقی دو ملازم درندے کی دہشت سے زمین پر بیٹھ گئے تھے جبکہ ادھر میں نے اور کرنل ہیریسن نے آنِ واحد میں اپنی رائفلیں ایک بار پھر سیدھی کیں۔

اسی دوران وہ آدم خور غراتا ہوا میری طرف پلٹا...... اس نے مجھ پر جست لگائی۔ میں نے اس کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی...... گولی اس آدم خور کے کہیں لگی تھی، جس کا ثبوت اس کے جست بھرنے کے دوران ہی فضا میں سنائی دینے والی خوفناک دھاڑ تھی۔ میں بھی فائر کرتے ہی خود کو شیر کے خونی جبڑوں سے بچانے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

آدم خور اپنی ہی جھونک میں دل ہلا دینے والی دھاڑ مارتا ہوا...... میرے سر کے اوپر سے گزرتا چلا گیا اور پھر دوبارہ نمودار نہ ہوا۔ میں عالم جوش میں اٹھا۔ کرنل ہیریسن اور سری واستو گھاس پر زخمی پڑے کراہتے ہوئے کلدیپ کو سنبھالنے کے لئے لپکے۔ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آدم خور کے تعاقب میں چلا۔ میرا رخ ان قد آدم گھنی جھاڑیوں کی طرف تھا جدھر وہ آدم خور غائب ہوا تھا۔



میرے پیچھے بے چارے کلدیپ کا کیا حشر ہوا اس کا مجھے اندازہ تھا۔ اسے سنبھالنے کے لئے کرنل ہیریسن اور سری واستو وغیرہ کافی تھے۔ میں دُکھ کے احساس کو دباتے ہوئے ایک جوش کی سی کیفیت لئے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آدم خور کے پیچھے بھاگا تھا اور آج کسی بھی صورت میں اس موذی کا قلع قمع کرنے کا میں اپنے دل میں پکا عزم کر چکا تھا۔ لہٰذا میرے قدم کشاں کشاں اس آدم خور کے نشانات پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے...... گھاس اور جنگلی پودوں پر تازہ گاڑھے خون کے نشانات بھی کہیں کہیں مجھے نظر آتے رہے تھے۔

جانے کیوں مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ اس آدم خور نے برگد والی جھونپڑی کی طرف کا ہی رخ کیا ہو گا۔ مجھے ایسا لگتا تھا اس پراسرار بوڑھے شکاری کا تعلق اس کالے شیر سے تھا۔ وہ مجھے اس کا پالتو جانور ہی محسوس ہوتا تھا۔ مگر اس میں ایک ابہام بھی تھا کہ بھلا ایک ایسا درندہ جسے انسانی خون کی چاٹ لگ چکی ہو وہ بھلا کیونکر انسان کا پالتو جانور ہو سکتا ہے۔

تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے میں یہ سب سوچے جا رہا تھا اور میرے دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھولی ہوئی سانس اور چہرے پر جوش

آمیز تمتماہٹ لئے...... جب میں اس برگد والی جھونپڑی کے قریب پہنچا تو قدرے ٹھٹک کر رک گیا۔ اس آدم خور شیر کے پیروں اور اس کے زخم سے ٹپکنے والے خون کے قطروں کے نشانات سامنے جھونپڑی والے درخت کی طرف جا کر معدوم ہو رہے تھے۔

ایکا ایکی میرے پورے وجود میں اب جوش کے ساتھ نامعلوم خوف کی سی لہر دوڑ گئی...... اس کا مطلب تھا وہ آدم خور اوپر جھونپڑی کے اندر موجود تھا۔

آج میں نے اس اسرار کا پردہ چاک کرنے کا پکا تہیہ کر رکھا تھا اسی لئے میں نے خاموشی سے درخت پر چڑھنے کا ارادہ کیا اور رائفل کو کاندھے پر لٹکا کر ابھی اوپر چڑھنے کے لئے برگد کے موٹے تنے کو چھوا ہی تھا کہ دفعتہً ایک آواز پر میں ٹھٹک کر اپنی جگہ پر جم گیا اور آواز کی سمت سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ آواز اس پراسرار بڑھے شکاری کی تھی جو نجانے کس وقت اچانک جھونپڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

''اے...... کیا چاہتے ہو...... تم کیوں اوپر آ رہے ہو؟''

اس کی بات سن کر مجھے اس بوڑھے کی مکاری پر غصہ تو بہت آیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ایسے خطرناک آدم خور کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھا جس نے کئی سو معصوم افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا...... دوسرے اس بار اس آدم خور کی زد میں میرا اپنا دوست کلدیپ بھی آ گیا تھا اور اب جانے اس بے چارے کا کیا حال تھا۔

میں نے اس مکار بوڑھے کی طرف دیکھا تاکہ اسے سخت جواب سے نوازوں لیکن جیسے ہی میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ میں نے دیکھا اس کا ایک کندھا بری طرح زخمی تھا اور وہاں سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا جسے روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اس پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا زخم تازہ تھا۔

اچانک ایک سنسنی خیز تصور سے میں سرتاپا لرز اٹھا۔ تاہم میں نے جلد اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا اور درشت لہجے میں اس سے بولا۔ ''وہ تمہارا پالتو شیر میرے دوست کو زخمی کر کے یہاں آیا ہے۔ میں اسے ہر قیمت پر ہلاک کروں گا...... تم نیچے اترو۔''

میرے للکارنے پر اس بوڑھے شکاری کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا اس کے جھریوں زدہ چہرے پر بڑی سنسنی خیز اور حیوانہ مسکراہٹ عود کر آئی، وہ بولا۔

''جاؤ یہاں سے...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ بھلا ایک آدم خور چیتے کا یہاں کیا کام؟''

میں سمجھ گیا کہ یہ بوڑھا میرے ساتھ مکر کر رہا ہے۔ میں نے غصے سے دھاڑ کر کہا۔

''بڈھے...... میں اس بار تیرے جھانسے میں نہیں آؤں گا۔ مجھے اپنی جھونپڑی کی تلاشی دینا ہوگی۔''

''اچھا...... اچھا...... آ جاؤ پھر اوپر......'' اس بار وہ بیزاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

مجھے یقین تھا کہ اس کا وہ پالتو آدم خور اوپر ہی موجود ہوگا۔ اس بار میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جھونپڑی کی تلاشی لے کر ہی رہوں گا۔ حالانکہ پہلے ہی بوڑھے کی بات پر اعتبار کر کے لوٹ گیا تھا۔ بہرطور میں اوپر چڑھا اور مچان نما تختے پر بوڑھے کے بالمقابل کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں بغور جھانکنے لگا...... مجھے جانے کیوں اس کی آنکھوں میں ملگجا سا جالا نظر آیا۔ ایک عجیب سی حیوانی چمک ہویدا تھی اس کی گدلی گدلی آنکھوں سے۔ میں اپنی رائفل تانے جھونپڑی کے اندر گھس گیا۔

اندر سوائے کاٹھ کباڑ کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ بستر کے طور پر استعمال ہونے والے ایک کونے میں صرف گھاس پھونس دھری تھی۔

مجھے شدید حیرت کا سامنا ہوا...... آخر کہاں گیا آدم خور شیر...... جبکہ میں نے اسے دوسری بار اپنی آنکھوں سے اس جھونپڑے کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔

میں باہر نکلا تو وہ جھکی بوڑھا پراسرار نظروں سے میرے چہرے کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں خاموشی سے درخت سے نیچے اتر آیا اور وہاں سے کسی خیال کے تحت ایک قریب جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اب میں یہاں سے باآسانی جھونپڑی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ بوڑھا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا جو اب یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں وہاں سے مایوس ہو کر چلا گیا ہوں۔ سہ پہر کا وقت ہو چکا تھا۔ آسمان پر اچانک ہی کالے کالے بادل نمودار ہونے لگے تھے۔ ماحول سہ پہر میں بھی ہلکی ہلکی تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ میں ابھی تک جھونپڑی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آج میں ہر صورت اس پراسرار ڈرامے سے پردہ اٹھانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ جانے کیوں ایسا کچھ یقین سا تھا کہ

وہی آدم خور سیاہ شیر اپنی آئندہ کسی کارروائی کے لئے دوبارہ اس جھونپڑی کے اندر سے ہی نکلے گا۔

تب پھر اچانک میں بری طرح ٹھٹکا۔ میرا دل ایک دم جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ خونی اور پراسرار آدم خور شیر جھونپڑی سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے دیکھا اس کا کندھا ابھی تک زخمی تھا۔ ایک لمحے کو جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا...... میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی رائفل سے اس خونی آدم خور کا نشانہ لیا اور سانس روک کر لبلبی دبا دی۔

پُرسکوت فضا میں گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ کالا شیر جھونپڑی کے تختے پر کھڑے کھڑے ایک دھاڑ مار کر زور سے فضا میں اچھلا اور نیچے آ رہا۔ میں اب جوش کے مارے جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ آدم خور شیر گھاس پر پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا...... میں نے ذرا قریب آ کر پھر اس کا نشانہ لیا اور دوسری گولی بھی اس کے ہولے ہولے سانس لیتے سیاہ وجود میں اتار دی۔ آدم خور شیر ختم ہو چکا تھا۔

میں نے جھونپڑی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کہ ابھی وہ پراسرار بوڑھا غصے سے لال پیلا ہو کر باہر نکلے گا مگر ایسا نہ ہوا...... میں یہی سمجھا شاید وہ اندر چھپا ہوا ہے۔ میرا سامنا کرنے سے کترا رہا ہو۔

بہرطور میں اپنی فتح پر نازاں واپس ہوا۔ ادھر کرنل ہیری سن اور سری واستو زخمی کلدیپ کو اٹھا کر گاؤں کے وید کے پاس علاج کے لئے لے گئے تھے۔ کلدیپ کی زندگی بچ گئی تھی۔

وہ سب لوگ میرا کارنامہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ کرنل ہیری سن اور سری واستو میرے ساتھ چل کر اس مُردہ آدم خور کو دیکھنے گئے اور پھر ملازموں کے ذریعے کرنل ہیریسن نے اس آدم خور کو گاؤں والوں کے دیدار کے لئے اسے اٹھوا کر گاؤں بھجوا دیا۔



"یار ذاکر...... یہ بوڑھا شکاری کدھر گیا؟"

یہ اس سے اگلے روز کا ذکر تھا جب ہم واپسی کے لئے سامان پیک کر رہے تھے تو سری واستو نے عجیب سے لہجے میں پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔

"کہاں جا سکتا ہے وہ بڈھا...... اپنی برگد والی جھونپڑی میں بیٹھا سوگ منا رہا ہو گا...... اپنے پالتو جانور کی موت کا۔"

"مگر...... یار یہی تو حیرانی کی بات ہے کہ اب وہ بوڑھا ادھر نہیں ہے۔ مرلی اور دوسرے ملازموں کو میں نے خاص طور پر ہدایت دی تھی کہ اس بوڑھے کو تلاش کریں تاکہ اس کو گرفتار کیا جا سکے۔" سری واستو نے حیرانی سے کہا۔

"پھر...... کہاں جا سکتا ہے وہ......؟" اس بار میرے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

تب پھر سری واستو لمحہ بھر بھیدوں بھری خاموشی کے بعد عجیب سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ذاکر...... لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں آتا...... مگر شاید تم میری بات کا یقین کر لو۔"

"ہاں...... ہاں کہو؟"

"وہ بوڑھا کسی خاص شکتی کا مالک تھا...... مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آدم خور وہ پراسرار بوڑھا ہی تھا۔"

سری واستو کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا...... اور حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

(ختم شد)